www.pklibrary.com

شعاع

اپریل 2024

بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
واٹس ایپ
0317 2266944

پہلی شعاع، مدیرہ 6
حمد، سرور انبالوی 7
نعت، سراج المنیر تبسم 7
نبی ﷺ کی باتیں، ادارہ 8

عید سروے

عید آج اور کل، ادارہ 20

انٹرویو

ایڈیسن ادریس مسیح سے ملاقات، شاہین رشید 17
دستک، شاہین رشید 15
جب تجھ سے ناتا، س-الف 13

بانی محمود ریاض
مدیرہ اعلیٰ ـــــ آمنہ ریاض
مدیرہ ـــــ رخسانہ جمیل
مدیرہ خصوصی ـــــ امت الصبور
فلم ایڈیٹر ـــــ شاہین رشید
قانونی مشیر ـــــ نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

اپریل 2024
جلد 37 شمارہ 08
قیمت 150 روپے

ناول

والعصر، امت العزیز شہزاد 34

مکمل ناول

ماء الملوک، نگہت سیما 172
دستور وفا، مریم عزیز 132
محبت میراث میری، سبیعہ عمیر 94

ناولٹ

تم ہو میت میرے، قرۃ العین سکندر 64
انا کی ڈور، عنبرین ابدال 158

pklibrary.com

افسانے

چوڑیاں	ملیحہ سیمون	54
سیرت کا پھول	حنا شاہد	59
دنیادار درویش	ہاجرہ ریحان	83
عید کا تحفہ	نظیر فاطمہ	90
دکھی رانی	قرۃ العین خرم ہاشمی	127

نظمیں غزلیں

غزل	مجید امجد	196
غزل	عبدالحمید عدم	196
غزل	جواد شیخ	197
نظم	ثوبیہ قطب	197

مستقل سلسلے

تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	202
خط آپ کے	ادارہ	28
مسکراہٹیں	ادارہ	200
باتوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	198
موسم کے پکوان	واصفہ سہیل	207
کھلتا کسی پہ	حبیبہ خان	201
خوبصورت بنیے	ادارہ	210

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ——— 1,800 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ ——— 25000 روپے

سالانہ خریدار بننے کے لیے ای میل کریں

subscription@khawateendigest.com

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

pklibrary.com

رضیہ جمیل

اداریہ

مارچ کا شمارہ عید نمبر لیے حاضر ہیں۔

یہ شمارہ آپ کو ملے گا تو رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا ہوگا۔ یوں تو رمضان المبارک کا پورا مہینہ ہی رحمت و برکت ہے لیکن آخری عشرہ کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس عشرہ کی طاق راتوں میں ایک ایسی رات ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے لیلۃ القدر کہا ہے۔ اس رات کی عبادت ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اس رات میں عبادت کرنے کا ثواب ہزار ماہ سے زیادہ ہے۔ قرآن پاک اسی مبارک رات میں نازل کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ اس رات کی برکتوں سے فیض یاب ہوں اور اللہ تعالیٰ اس رات کو ہمارے لیے بخشش و نجات کا ذریعہ بنا دے۔ آمین۔

ہر مذہب، ہر قوم کے کچھ دن مخصوص ہوتے ہیں جن میں وہ اپنے طریقے سے خوشیاں مناتے ہیں لیکن مسلمانوں کے تہوار عیدہ ہی شان رکھتے ہیں یہ خوشی کے ساتھ ساتھ فرض کی ادائی اور اللہ تعالیٰ کے حضور سرخ روئی کا احساس لیے ہوتے ہیں۔

مسلمان اللہ تعالیٰ کے احکام بجالاتے ہوئے روزے رکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں عید کا دن عنایت فرماتا ہے۔ عید کے لفظی معنی خوشی کے ہیں۔ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے خوشی کا دن ہے۔ اسی لیے اس کو عید کا نام دیا گیا۔

قارئین کو ہماری جانب سے عید مبارک

ہماری دعا ہے کہ آپ کا ہر دن روز عید ہو، آپ کو عید کی حقیقی خوشیاں نصیب ہوں۔ عید کے اس پُر مسرت موقع پر اپنے اردگرد کے لوگوں کا بھی خیال رکھیے گا کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔

اس شمارے میں

☆ امت العزیز شہزاد کا ناول..... والعصر
☆ مریم عزیز کا ناول..... دستور وفا
☆ نگہت سیما کا ناول..... ماء المملوک
☆ سنیعہ عمیر کا ناول..... محبت میراث میری
☆ قرۃ العین سکندر اور عنبرین ابدال کے ناولٹ
☆ ہاجرہ ریحان، نظیر فاطمہ، میا سمیون، حنا شاہد اور قرۃ العین خرم ہاشمی کے افسانے
☆ عید کل اور آج..... قارئین سے سروے
☆ ڈرامہ رائٹر ایڈیسن ادریس سیج سے ملاقات
☆ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

pklibrary.com

حمد

تُو رحیم ہے تُو کریم ہے تُو بشیر ہے تُو نذیر ہے
ترے لفظ کُن سے ہیں دو جہاں تُو علیم ہے تُو خبیر ہے

یہ چمن چمن یہ دمن دمن یہ زمن زمن یہ سخن سخن
تری قدرتوں کی نشانیاں ہیں یہ تیرا خیر کثیر ہے

تری ذات عظیم ہے تری شان شان کریم ہے
کہ جو تاجدار یہاں کا ہے ترے در کا وہ بھی فقیر ہے

ترے لفظ کُن سے ہیں دو جہاں ترے لفظ کُن سے ہے زندگی
نہ جہاں میں تیرا مثیل ہے نہ یہاں میں تیری نظیر ہے

تیرا فیض سب کے لیے روا کہ وہ شاہ ہو کہ گدا
ترا لطف سب کے لیے سدا وہ صغیر ہے کہ کبیر ہے

یہ نجوم و مہر یہ کہکشاں ترے حسن کی ہیں نشانیاں
ترا حسن حسن قدیم ہے تُو منیر ہے تُو بشیر ہے

مری ذات کیا مری بات کیا میں ہوں ایک ذرہ بے نشاں
مرے دل کو دولت فقر دے کہ یہ رنگ و بو کا اسیر ہے

سرور نابالوی

نعت

محمدؐ کی شریعت پر چلیں یہ بندگی اپنی
درود ذکر پیارے مصطفیٰؐ کا زندگی اپنی

بگڑ جائے اگر قسمت سبھی آنکھیں چرا لیتے ہیں
مگر اخلاص کے پیکر محمدؐ پاس آتے ہیں

شکر کرتی رہوں کہ ہو گئی رحمت سے وابستہ
حسین قسمت میری کہ ہو گئی امت سے وابستہ

محمدؐ مصطفیٰؐ شمع ہدایت ہم ہیں پروانے
قرآن پاک کی تعلیم کے ناچیز دیوانے

نبیؐ نے راہ دکھلائی ہمیں ثابت قدم رکھنا
خدایا مسلماں ہونے پر نازاں ہیں بھرم رکھنا

یہ کیسی راہ ہے چلتے چلو تھکتے نہیں پھر بھی
ہزاروں مشکلیں آئیں قدم رکتے نہیں پھر بھی

ہے اتنی التجا تسنیم کی ظلمت مٹاؤ تم
چلو راہ محمدؐ پر سدا دھوکا نہ کھاؤ تم

سراج المنیر تسنیم

pklibrary.com

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

نیکی اور بھلائی کے راستے بہت ہیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا۔
"اور تم جو بھلائی بھی کرو گے، بلاشبہ اللہ اسے جاننے والا ہے۔"
(البقرہ۔215) اور فرمایا۔
"جو شخص ایک ذرے کے برابر بھی کوئی بھلائی کرے گا، وہ اسے (قیامت والے دن) دیکھ لے گا۔" (الزلزال۔7)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "جس نے نیک عمل کیا تو اس کا فائدہ اسی کو ہے۔" (الجاثیہ۔15)
اور اس باب میں بہت سی آیات ہیں۔ جہاں تک احادیث کا تعلق ہے تو وہ بھی بہت ہیں، جن کا شمار ہی نہیں، ہم ان میں سے چند ایک ذکر کرتے ہیں۔

افضل عمل

حضرت ابوذر جندب بن جنادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے کہا۔
"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا عمل سب سے افضل ہے؟"
"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اللہ پر ایمان رکھنا اور اس کے راستے میں جہاد کرنا۔"
میں نے کہا۔ "کون سا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟"
"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو اپنے مالک کی نظروں میں سب سے زیادہ عمدہ اور زیادہ قیمتی ہو۔"
میں نے کہا۔ "اگر میں یہ نہ کرسکوں؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "کسی کاریگر کی مدد کردو یا بے ہنر کا کام کردو۔"
میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ بتلائیں، اگر میں یہ بعض عمل کرنے سے بھی عاجز رہوں؟"
"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تم لوگوں کو اپنے شر سے بچائے رکھو، یہ بھی تمہارا اپنے نفس پر صدقہ ہے۔" (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل:
1۔ حدیث سے جہاد اور غلاموں کو آزاد کرنے کی فضیلت، اسی طرح دوسروں کے ساتھ ہمدردی وتعاون کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے اجتناب بھی صدقہ واجر میں احسان سے کم نہیں ہے۔
2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان باللہ، قبولیت اور صحت اعمال کے لیے بنیاد ہے اور عمل ایمان کا پھل ہے۔ ایمان کے بغیر عنداللہ کوئی عمل مقبول نہیں۔

ہر جوڑ پر صدقہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم میں سے ہر ایک کے ہر جوڑ پر صبح کو ایک صدقہ (ضروری) ہے۔ پس ہر تسبیح (سبحان اللہ کہنا) صدقہ ہے، ہر تحمید (الحمد للہ کہنا۔ صدقہ ہے، ہر تہلیل (لا الہ الا اللہ کہنا) صدقہ ہے اور ہر تکبیر (اللہ اکبر کہنا) صدقہ ہے۔ نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے اور برائی سے

pklibrary.com

روکنا صدقہ ہے اور ان سب کاموں سے وہ دو رکعتیں کافی ہو جاتی ہیں جو انسان چاشت کے وقت پڑھے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں۔ ان جوڑوں کی وجہ ہی سے انسان ہر طرح کی حرکت اور ہر قسم کا کام کرنے پر قادر ہے۔ اگر یہ جسم بے جوڑ ہوتا تو انسان کے لیے اٹھنا، بیٹھنا، لیٹنا، حرکت کرنا اور مختلف کاموں کے لیے اعضا کا استعمال ناممکن ہوتا۔ اس لحاظ سے ہر جوڑ، اللہ کی ایک نعمت ہے، جس کا شکر ادا کرنا انسان پر واجب ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ کا دوسرا فضل ہے کہ اس نے ان نعمتوں پر شکر کی ادائی کا نہایت آسان طریقہ بھی بتلا دیا۔ جو غریب سے غریب انسان بھی اختیار کر سکتا ہے اور وہ تسبیح و تحمید اور تکبیر و تہلیل کا کہنا اور نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا وغیرہ ہے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو طلوع شمس کے بعد سے زوال شمس تک کے درمیانی وقفے میں کسی وقت دو رکعت پڑھ لے۔ زیادہ پڑھنا چاہے تو آٹھ رکعت تک (دو دو کر کے) پڑھ سکتا ہے۔

3۔ ایک حدیث میں دن کے شروع حصے میں چار رکعتیں پڑھنے کی ترغیب ہے جن کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ بندہ شام تک اللہ کی حفاظت میں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر پریشانی سے اسے کفایت کر جاتا ہے۔

اچھے اور برے اعمال

ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھ پر میری امت کے اچھے اور برے عمل پیش کیے گئے۔ چنانچہ میں نے اس کے اچھے اعمال میں راستے سے تکلیف دہ چیز (پتھر، کانٹا وغیرہ) کا ہٹانا بھی پایا اور اس کے برے اعمال میں وہ تھوک پایا جو مسجد میں تھوکا گیا) ہو اور اس پر مٹی نہ ڈالی گئی ہو۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ تعالیٰ نے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو بھی، جس میں لوگوں کا فائدہ نقصان سے بچاؤ ہو، اعمال خیر میں شمار کیا ہے اور جو اس کے برعکس ہو، چاہے کتنا بھی معمولی ہو، اسے شر میں شمار کیا ہے۔ جس سے یہ ترغیب ملتی ہے کہ انسان کو ہمیشہ بھلے کام کرنے چاہئیں تاکہ اسے اللہ کی رضا مندی حاصل ہو اور برے کاموں میں اجتناب ضروری ہے تاکہ وہ اللہ کے غضب و عتاب سے محفوظ رہے۔

2۔ مسجد کی صفائی کا اہتمام اور اس کے ادب کے منافی کاموں سے گریز کیا جائے جیسے تھوکنا وغیرہ اور یہ پڑا ہو تو اس کو صاف کر دینے کا حکم ہے۔ حدیث میں جو مٹی ڈالنے کا حکم ہے یہ اس وقت ہے جب مسجد کچی ہو اور اس وقت مسجدیں کچی ہوتی تھیں۔ آج کل مسجد کے فرش پکے ہوتے ہیں، اس لیے کپڑے یا پانی سے صاف کرنا چاہیے۔

مال دار اور غریب

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مال دار لوگ کہیں (زیادہ) اجر لے گئے۔ وہ نماز پڑھتے ہیں جیسے ہم پڑھتے ہیں، وہ روزے رکھتے ہیں جیسے ہم رکھتے ہیں۔ (ہم سے زائد کام یہ کرتے ہیں کہ) وہ اپنے فاضل مالوں سے صدقہ خیرات کرتے ہیں (یوں ہم سے زیادہ اجر حاصل کر لیتے ہیں)"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کیا اللہ نے تمہارے لیے ایسی چیزیں نہیں بنائیں کہ تم ان کا صدقہ کرو؟ بے شک ہر سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے، ہر اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے ہر الحمد للہ کہنا صدقہ ہے، ہر لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے، نیکی کا حکم

دینا صدقہ ہے، برائی سے روکنا صدقہ ہے اور تم میں سے کسی کا اپنی بیوی سے ازدواجی تعلق قائم کرنا صدقہ ہے۔"

انہوں نے سوال کیا۔ "ہم میں سے ایک شخص اپنی خواہش پوری کرے، کیا اس میں بھی اس کے لیے اجر ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بھلا بتلاؤ! اگر وہ اپنی شہوت حرام جگہ (بدکاری) سے پوری کرے تو اسے گناہ ہوگا۔ (یقیناً ہوگا) پس اسی طرح وہ حلال طریقے سے اپنی شہوت پوری کرے گا تو اسے اجر ملے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے اس جذبے کا بیان ہے جو نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ کر کرنے کا ان کے اندر موجود تھا اور اسی حساب سے نیکی میں تقصیر سے رنج و ملال محسوس ہوتا تھا۔

2۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام میں نیکی کا مفہوم بڑا وسیع ہے اور اس میں ہر وہ عمل آجاتا ہے (بشرطیکہ اس میں اللہ کی نافرمانی نہ ہو) جو اچھی نیت اور اچھے ارادے سے کیا جائے حتیٰ کہ فطری عادت کی تکمیل پر بھی (جو مباح کے دائرے میں ہوں) اجر ملتا ہے، بلکہ اگر مقصود اللہ کی اطاعت اور امتثال امر (احکام کی تعمیل) ہو تو ترک معصیت بھی فعل طاعت کی طرح باعث اجر ہے۔

نیکی حقیر نہیں

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"نیکی کے کسی کام کو حقیر مت سمجھنا، اگرچہ تو اپنے (مسلمان) بھائی سے خندہ روئی کے ساتھ ملے (یعنی مسکراتے ہوئے ملنا بھی نیکی ہے)" (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ خندہ روئی سے ملنا بھی نیکی ہے کیونکہ ایک تو یہ انسان کے حسن اخلاق کی دلیل ہے۔ دوسرے، اس سے مسلمانوں کے درمیان الفت پیدا ہوتی ہے جو مطلوب و محبوب عمل ہے۔

2۔ مسلمان کی زندگی اگر اسلامی اصولوں پر کاربند ہو تو اس کا ہر عمل نیکی ہے اور اس حدیث میں، اس امر کی بھی ترغیب ہے کہ نیکی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔

واجب صدقہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے، لوگوں کے ہر جوڑ کی طرف سے ایک صدقہ (کرنا واجب) ہے (اور صدقہ صرف مال کا خرچ کرنا ہی نہیں بلکہ) تیرا دو آدمیوں کے درمیان انصاف کرنا بھی صدقہ ہے۔ کسی آدمی کو اس کی سواری پر بٹھانے یا اس کا سامان اٹھا کر اس پر رکھوانے میں اس کی مدد کرنا بھی صدقہ ہے۔ اچھی بات کرنا صدقہ ہے۔ ہر اس قدم میں، جس سے چل کر تو نماز کی طرف جائے صدقہ ہے۔ راستے سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا بھی صدقہ ہے۔" (بخاری و مسلم)

اسے امام مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی روایت ہے کیا ہے، انہوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بنی آدم میں سے ہر انسان کی تخلیق تین سو ساٹھ جوڑوں پر ہوئی ہے۔ چنانچہ جس نے اللہ اکبر کہا، الحمد للہ کہا لا الہ الا اللہ کہا سبحان اللہ کہا، استغفر اللہ کہا راستے سے کوئی پتھر ہٹایا، یا کوئی کانٹا یا ہڈی راستے سے دور کر دی، یا کسی نیکی کا حکم دیا، یا کسی برائی سے روکا، تین سو ساٹھ کی تعداد میں وہ مذکورہ کام کرے، تو وہ اس دن اس حالت میں شام کرتا ہے کہ اس نے اپنے نفس کو جہنم کی آگ سے دور کر لیا ہوتا ہے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا ہے کہ جس کے پاس صدقہ خیرات کی استطاعت نہ ہو تو وہ مذکورہ افعال کے ذریعے سے صدقہ خیرات کا ثواب حاصل کر سکتا ہے، نیز اپنے جوڑوں کا صدقہ دے سکتا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ جذبات کی قدر کرتا ہے۔ حسن نیت سے کیا ہوا معمولی عمل بھی بسا اوقات انسان کی نجات کا باعث بن سکتا ہے۔

مسجد جانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص صبح کو یا شام کو مسجد کی طرف جاتا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں، جب بھی وہ صبح یا شام کو مسجد کی طرف جاتا ہے، مہمانی تیار کرتا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد مسائل:

1۔ اس میں مسجد میں جانے اور نماز باجماعت پڑھنے کی ترغیب ہے۔

2۔ بادشاہ اگر کسی کی دعوت کرے تو اسے قبول کرنے کی وہ ہر ممکن کوشش کرے گا کہ کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کی مہمانی کو اگر ہم ٹھکرائیں گے تو اس سے بڑی بدبختی کیا ہے اور نماز باجماعت ادا نہ کرنا اس دعوت کو ٹھکرانے کے مترادف ہے۔

تحفہ کی اہمیت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے مسلمانوں کی عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن (کے ہدیے) کو حقیر نہ سمجھے، اگرچہ وہ بکری کا کھر ہی ہو۔" (بخاری مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ کسی کے ہدیے کو حقیر نہ سمجھا جائے کیونکہ وہ اخلاص سے بھیجا گیا ہوگا تو تھوڑا ہونے کے باوجود، وہ عنداللہ بڑا ہوگا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی، پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے ہدیہ بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے، خواہ بکری کی کھر ہی ہو، یعنی اس کے ہدیہ بھیجنے کو بھی معمولی خیال نہ کرے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ہدیے کی قیمت کو نہ دیکھیے بلکہ دینے والے کے جذبات اور دل پر نگاہ رکھیے۔

حیا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایمان کی ستر یا ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔ ان میں سب سے افضل لا الہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ، راستے سے تکلیف دہ چیز (پتھر، کانٹے وغیرہ) کا ہٹانا ہے۔ اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ ایمان کے، عمل کے حساب سے مختلف مراتب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل لازم و ملزم ہیں۔

2۔ حیا کی فضیلت و اہمیت بھی اس سے واضح ہے کیونکہ حیا انسان کو گناہوں سے روکتی اور نیکیوں پر آمادہ کرتی ہے۔

جان داروں پر رحم

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دفعہ آدمی راستے پر چلا جا رہا تھا کہ اسے سخت پیاس لگی۔ اس نے ایک کنواں پایا تو اس میں اتر کر اس نے پانی پیا، پھر باہر نکل آیا۔ وہیں ایک کتا تھا جو پیاس کے مارے زبان باہر نکالے (ہانپتے ہوئے) کیچڑ چاٹ رہا تھا۔ اس

pklibrary.com

آدمی نے (دل میں) کہا۔ اس کتے کو بھی اسی پیاس نے ستایا ہے جس طرح میں اس کی شدت سے بے حال ہو گیا تھا، چنانچہ وہ (دوبارہ) کنویں میں اترا اور اپنا موزہ پانی سے بھرا اور اسے اپنے منہ سے پکڑے اوپر چڑھ آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس (کے اس عمل اور جذبے) کی قدر کی اور اسے معاف فرما دیا۔"

(یہ سن کر) صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہمارے لیے چوپایوں (پر ترس کھانے) میں بھی اجر ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "(ہاں) ہر تر جگر والے (جان دار کی دیکھ بھال) میں اجر ہے۔"
(بخاری و مسلم)

اور بخاری ہی کی ایک روایت میں ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے عمل کی قدر کی۔ چنانچہ اسے بخش دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔"

اور بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے۔

"ایک دفعہ ایک کتا کنویں کے گرد چکر لگا رہا تھا، اسے پیاس مارے دے رہی تھی کہ اچانک اسے بنی اسرائیل کی فاحشہ عورتوں میں سے ایک بدکار عورت نے دیکھا، پس اس نے اپنا موزہ اتارا اور اس کے ذریعے سے اس نے اس کے لیے (کنویں سے) پانی کھینچا اور اسے پلا دیا، تو اس کے اس عمل کی وجہ سے اسے بخش دیا گیا۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی ہر مخلوق کے ساتھ حتیٰ کہ جانوروں کے ساتھ بھی احسان کرنا چاہیے۔ اس سے اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت بڑی وسیع ہے، وہ اگر چاہے تو تھوڑے سے عمل کو بھی قبول فرما کر بندے کی مغفرت فرما دے۔

3۔ فائدہ یہی ہے کہ کبیرہ گناہوں سے توبہ کی جائے، تاہم بسا اوقات خلوص نیت سے کیا ہوا نیک عمل بھی گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور انسان کے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔

جنت میں داخلہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے ایک آدمی کو جنت میں چلتے پھرتے دیکھا، اس نے اس درخت کو کاٹ دیا تھا جو راستے کے درمیان میں تھا اور مسلمانوں کو تکلیف دیتا تھا۔"
(مسلم)

کانٹے دار شاخ

بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے "ایک دفعہ ایک آدمی راستے پر چل رہا تھا، اس نے راستے پر ایک کانٹے دار شاخ دیکھی، اس نے اسے پیچھے کر دیا۔ اللہ نے اس کے اس عمل کی قدر فرمائی اور اس کو بخش دیا۔"

فوائد و مسائل:

1۔ لوگوں کو تکلیف اور نقصان سے بچانا اللہ کو بہت پسند ہے۔ حتیٰ کہ راستوں سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دینا بھی اللہ کو بڑا محبوب ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس راستوں کو تنگ یا بند کر دینا، جس سے لوگوں کو تکلیف ہو، جیسے شادی بیاہ کے موقعوں پر لوگ نہایت دیدہ دلیری سے ایسی مذموم حرکتیں کرتے ہیں یا بعض دکان دار اور اہل مکان تجاوزات کھڑی کر کے لوگوں کو ایذا پہنچاتے ہیں، یہ کام اللہ کی ناراضی اور اس کے غضب کا باعث ہیں۔

2۔ نیکی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، خواہ ظاہری طور پر وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

س۔الف.....ماڈل ٹاؤن سیالکوٹ

ویسے تو آپ ہمیشہ ہی بھول بھلیوں سے گزارتی ہیں لیکن اس دفعہ تو آپ نے کر بھولی ہوئی گلیوں میں اتار کر واپسی کی سواری بھی لے لی ہے۔ یعنی یادوں کی گہری دھند ہے۔ جہاں پریشانیوں کی برف ہے اور اچھی یادوں کی پھوار بھی ہے۔

دیکھتے ہیں کہ ان میں کیسے اترتے ہیں اور واپس کب آتے ہیں؟ جہاں بڑا بچہ میڈیکل کے دوسرے پروف کی تیاری میں مصروف ہے۔ اور اسی طرح باقی تین بھی ماشاء اللہ اپنے اسکیچوئل میں مصروف ہیں۔

اور میں 1993ء دسمبر کی کہر کی ایک رات سے شروع ہو رہی ہوں۔

جوابات لکھنے کے بعد سوچوں گی کہ شکریہ ادا کرنا ہے یا یادوں کی کڑواہٹ سے بددل ہونا ہے۔

☆☆☆

س ''شادی کب ہوئی؟''

ج ''24 دسمبر 1993ء۔''

س: شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟

''شادی سے پہلے ہر کتاب، ناول، اخبار حتیٰ کہ سنڈے میگزین کو اشتہاروں سمیت ایک گھنٹے میں پڑھ کر پھر کچھ اور ڈھونڈنا اور بار بار دہراتے رہنا یہی مشغلہ تھا۔''

س ''رشتہ میں آپ کی پسند شامل تھی؟''

ج ''رشتہ سراسر بزرگوں کی مرضی سے طے ہوا۔ دونوں ہی بالکل انجان تھے۔''

س ''شوہر کے لیے آپ کے ذہن میں کوئی تصور تھا؟''

ج ''اتنا تیز رفتار قاری جس نے چھٹیوں میں لائبریری کی ہر کتاب کو پڑھ ڈالنا ہو۔ ظاہر ہے اس کا کوئی خیال تو تھا ہی۔ لیکن حقیقت کی دنیا میں رہنا زیادہ پسند ہے اور تھا۔ اور خوبیوں میں سب سے زیادہ خواہش تھی کہ ظاہری رکھ رکھاؤ کا ضرور خیال رکھا جائے۔''

س ''منگنی کتنا عرصہ رہی.....اس دوران رابطہ ہوا؟''

ج ''منگنی صرف چار ماہ رہی۔ رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا حالانکہ بہت سختی نہیں تھی شاید فون کی اجازت بھی تھی۔''

س ''شادی سے پہلے سسرال والوں کے متعلق کیا سوچا تھا؟''

ج ''شادی سے پہلے سسرال والوں کے متعلق رائے کوئی خاص نہیں تھی اپنی ساس کے علاوہ سب جیٹھانیاں ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں۔ جیٹھ بہت کم گو اور نندیں محبت کرنے والی تھیں۔''

س ''شادی کے لیے کوئی قربانی دینا پڑی؟''

ج ''بی اے کے پریکٹیکل جیٹھ نے لینے تھے۔ اور رزلٹ شادی کے دو ماہ بعد آیا تھا۔ اس لیے تعلیم تقریباً مکمل تھی۔ ہر لڑکی کی طرح کی ہی قربانی تھی۔ کوئی خاص نہیں۔''

س ''شادی بخیر وخوبی انجام پائی یا کوئی جھگڑا وغیرہ؟''

ج ''شادی بخیر وخوبی انجام پائی اور رسموں میں کوئی مشکل یا بدمزگی نہیں ہوئی۔ میں اپنے گھر میں پہلی تھی سو سب بہت خوش تھے۔''

س ''شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کر کہا؟''

ج ''شوہر نے یقیناً لوگوں سے ملی ہوئی ابتدائی معلومات کی تصدیق سے ہی بات شروع کی تھی۔''

س ''شادی کے بعد آپ میں کیا تبدیلیاں

آئیں؟“

ج ”شادی کے بعد تبدیلیاں نہیں بلکہ 19 سال کی عمر میں شادی کے بعد ہی اصل شخصیت بنی اور زندگی کی اونچ نیچ میں سمجھ آتے آتے ان تبدیلیوں سے بہتر ایڈجسٹمنٹ کرتے کرتے 31 سال گزر گئے۔“

س ”شادی کے کتنے عرصے بعد گھر کا کام کرنا شروع کیا؟“

ج ”کام کاج تو بڑی جیٹھانی نے پانچویں دن شروع کروا دیا تھا۔“

س ”سسرال اور میکے کے کھانوں میں فرق؟“

ج ”میکے میں منگنی کے بعد کھانے پکانے سیکھے۔ تو تب گرمیاں تھیں۔ شادی آتے آتے سردیاں آ گئیں اور امی سے کہا کہ گرمیوں کے کھانے تو آ گئے ہیں۔ سردیوں کے کیا کروں گی۔ وہاں جا کر وہ بھی بھلایا اور سب کو دیکھ کر سب کچھ سیکھا۔ کافی مختلف تھا۔“

س ”سسرال میں تعریف و تنقید؟“

ج ”سسرال کے ماحول کی غیریت، اجنبیت، سرد مہری اور مقابلے بازی کی فضا کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں ایک دینی ذہن رکھنے والی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ میری ساس نے مجھے پتا نہیں کیسے چنا۔ مجھے ہمیشہ چاہا اور میری تعریف کی۔ وہ دین کی اساس پر مجھ سے محبت رکھتی تھیں۔ اور میرے لیے تنقید کا باعث یہی وجہ بنی۔ شادی کے دو ماہ بعد مجھے اللہ نے حج بیت اللہ کی سعادت بخشی، تب اپنی جیٹھانی کا یہ جملہ نہیں بھولتا۔ (تو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی) صرف دو ماہ بعد۔“

س ”سسرال میں وہ عزت ملی جس کی مستحق تھیں؟“

ج ”قدرت نے میری سسرال میں کئی خلا پیدا کر دیے۔ رشتوں کے حوالے سے جو میرے اللہ نے مجھ سے پر کروائے۔ سو مقام بھی اللہ نے دیا۔ اور عزت بھی۔ میری رائے کو بہترین حیثیت حاصل تھی۔“

س ”سسرال سے جو توقعات تھیں وہ پوری ہوئیں؟“

ج ”سسرال والوں کی توقعات تو پتا نہیں پوری ہوئی کہ نہیں لیکن ضمیر پہ کوئی بوجھ نہیں کہ کسی کے لیے جو کر سکتی تھی وہ نہیں کیا بلکہ کئی معاملات میں میاں سے ناراضگی مول لے کر بھی اقدامات کیے۔“

س ”پہلے بچے کی پیدائش؟“

ج ”بچے کی پیدائش بھی امتحان نہیں ہوتی اس کی تربیت امتحان ہوتی ہے۔ خصوصاً پہلے بچے کی ایک فریم ورک ہوتا ہے۔ جس میں کم و بیش بعد میں آنے والوں نے تھوڑی بہت تبدیلیوں سے ڈھل جانا ہوتا ہے اور اس کے لیے ہر دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

میں جوائنٹ فیملی سسٹم کو پسند نہیں کرتی یہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا ڈھانچہ نہیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ اپنے خاوند سے وابستہ رشتوں سے علیحدگی اختیار کرو۔ علیحدہ رہ کر آپ اپنی تمام صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کر سکتی ہیں۔

ڈیئر اصل گھر کوئی ساکن چیز نہیں یا گھریلو ماحول کوئی پلنگ کرسی نہیں جسے جہاں سیٹ کر دیا ویسا ہی رہے گا۔ گھر اور گھریلو ماحول کو ہمیشہ بہتر کرنے کے لیے آپ کو اپنی قربانیوں، صلاحیتوں، اللہ سے مانگی ہوئی مدد، بڑوں کی دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی آپ اس میں کامیاب ہوتے ہیں کبھی کم کامیاب اور کبھی ناکام لیکن اپنی غلطیوں سے سیکھ کر، ظرف بڑا رکھ کر، اللہ کی توفیق سے اس سلسلے کو کامیاب کوشش میں بدل سکتے ہیں۔“

☆☆

pklibrary.com

دستک دستک دستک

شاہین رشید

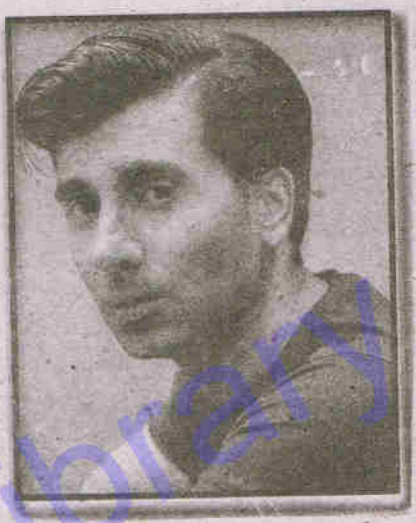

سکندر نواز راجپوت

''کیا حال ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آج کل تو خوب مصروف رہتے ہوں گے کیوں کہ ہر دوسرے ڈرامے میں آپ نظر آ رہے ہیں۔ عشق مرشد میں بھی نظر آ رہے ہیں؟''

''جی اللہ کا شکر ہے۔ اور مجھے یاد ہے کہ جب آپ نے میرا پہلا انٹرویو لیا تھا تو آپ نے ہی کہا تھا کہ ''تم میں بہت صلاحیت ہے بہت آگے جاؤ گے۔ آج اللہ کا شکر ہے کہ مجھے بک کیا جاتا ہے۔''

''اور ہر طرح کے کردار کے لیے۔ ایسا ہی ہے نا؟''

''جی ایسا ہی ہے۔ میں نے نیگیٹو اور پوزیٹو دونوں طرح کے رول کیے ہیں۔ ابھی تو بہت تھوڑا کام کیا ہے دعا کریں کہ مزید کام بھی ملے۔''

''آپ نے ڈرامہ سیریل ''میسنی'' میں بیک ٹو اولڈ کردار کیا تھا۔ وہ تجربہ کیسا رہا تھا؟''

''جی وہ بھی ایک اچھا تجربہ تھا اور میں نے اس میں کچھ زیادہ میک اپ اور وائٹنر نہیں لگوایا تھا۔ کیونکہ بیس، اکیس سال کے بچوں کے والدین کب بوڑھے ہوتے ہیں اور پھر مرد حضرات تو بڑھاپے کی عمر میں بھی بوڑھے نہیں لگتے، تو میں اگر کمر جھکا کر اور آواز کو لڑکھڑاہٹ کے ساتھ بولتا تو بہت برا لگتا۔''

''اب تک فیلڈ میں کیا کیا کر چکے ہیں اور

شہرت کس سیریل نے دی؟"

"کافی کام کر چکا ہوں۔ ڈراموں سے زیادہ میں نے کمرشلز کیے ہیں اس کے بعد پھر ڈرامے کیے ہیں۔ جن کی تعداد دس، بارہ تو ہو ہی گئی اور کچھ ٹیلی فلمز بھی کی ہیں۔ جہاں تک شہرت کی بات ہے تو مجھے شہرت ڈرامہ سیریل "وفا بے مول" سے ملی۔ فیچر فلم "دم مست" اور "زندگی تماشہ" کی جس میں میرا سپورٹنگ رول تھا۔"

"نیگیٹو پوزیٹو اور اولڈ کریکٹر کیے۔ کیا دل چاہتا ہے کہ زیادہ تر کون سے کردار کروں۔"

"دل تو یہی چاہتا ہے کہ ہر طرح کے رول کروں۔ جیسے کامیڈی پلاؤ" میں کیا، جیسا "دل ویران" میں کیا۔ جیسا "وفا بے مول" میں کیا۔ اس طرح "مسیحا" میں، میں نے نیگ ٹو اولڈ گیا۔ تو بس پوزیٹو ہو یا نیگٹو۔ اداکاری کا مارجن ہو۔ اگرچہ میں نے کم کام کیا ہے۔ کیونکہ میں ابھی اس فیلڈ میں نیا ہوں۔ لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں نے، جتنا بھی کام کیا ہے سب نے دیکھا بھی ہے اور پسند بھی کیا ہے۔"

"کبھی لیڈنگ رول کی خواہش ہوئی؟"

"لیڈنگ رول کیا ہوتا ہے؟ میرے نزدیک اس کی اہمیت نہیں کہ آپ پوری سیریل میں نظر آتے رہے اور کام بھی متاثر کن نہ ہو۔ رول وہ ہو جو دوسروں کو آپ کی طرف متوجہ کرے۔ دیکھا جائے تو "مسیحا" میں میرا نیگ ٹو اولڈ رول تھا وہ تقریباً لیڈنگ ہی تھا۔"

"فیلڈ میں کیسے آئے۔ اور گھر والوں نے کچھ کہا یا سپورٹ کیا؟"

"گھر والوں نے کچھ نہیں کہا بلکہ بہت سپورٹ کیا اور میں آپ کو بتاؤں کہ بچپن سے ہی میں کچھ نہ کچھ کر رہا ہوں۔ بچپن سے ہی آرٹ سے تعلق کسی نہ کسی طور پر رہا ہے۔ والد صاحب طبلہ نواز تھے۔ اسکول ہی میں ہمارا ایک میوزک بینڈ تھا اس میں بطور سنگر پرفارم کیا کرتا تھا۔ اداکاری کی طرف اس طرح آیا کہ ایک دفعہ "تھیٹر" دیکھنے گیا سب کو پرفارم کرتے ہوئے دیکھ کر مجھے بھی خیال آیا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"پھر این سی اے میں داخلہ لیا۔ بہت کچھ سیکھا اور کچھ سال بعد، اسٹیج پر بھی پرفارم کرنے کا موقع ملا۔ تو اسٹیج سے محبت ہو گئی۔ پھر کالج کے زمانے میں بیس، بائیس پلیز کیے۔ ساتھ ہی پھر شارٹ فلم میں بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ آپ یوں سمجھیں کہ اس فیلڈ میں کافی کام کیا ہے میں نے۔"

"یوٹیوب کے لیے بھی تو کچھ کیا ہے آپ نے؟"

"جی یوٹیوب ویڈیوز کونٹینٹ بھی بناتا رہا ہوں، اسی طرح کچھ نہ کچھ کرتے کرتے ڈراموں کی آفرز آ گئیں تو ڈراموں کی طرف آ گیا۔ اب تو یہ سلسلہ چل ہی پڑا ہے۔"

"ہاں آپ نے گھر والوں کا پوچھا تو گھر والے بہت خوش ہیں اور مجھے اس فیلڈ میں بہت آگے تک دیکھنا چاہتے ہیں۔ بہت سپورٹ کرتے ہیں اور کبھی میرے کام پر تنقید بھی نہیں کرتے۔"

"عید کی آمد آمد ہے، فیملی آپ کی لاہور میں ہے تو کہاں گزاریں گے عید؟"

"ان شاء اللہ۔ لاہور جاؤں گا اپنے والدین کے ساتھ عید گزاروں گا۔ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ انجوائے کروں گا۔"

"اور آپ کی پرسنل فیملی؟"

"جی جی۔ میری اپنی فیملی بھی ہے اور ہم سب مل کر ہی عید کی خوشیاں انجوائے کریں گے۔ اور ویسے بھی میں بہن بھائیوں میں بڑا ہوں تو جب میں جاتا ہوں تو سب بہت خوش ہوتے ہیں۔

"چلیں آپ کو ایڈوانس میں عید مبارک، انجوائے کریں۔"

☆☆

معروف ڈراما نگار

ایڈیسن ادریس مسیح سے مُلاقات

شاہین رشید

ڈراموں کی اس دوڑ میں اگر کوئی اپنی پہچان کروانے میں کامیاب ہے تو وہی اچھا رائٹر ہے وہی اچھا فنکار ہے اور وہی اچھا ڈائریکٹر ہے۔

ڈھیروں چینلز نے بہت سارے لکھاری بھی جنم دیے ہیں ——— اس فیلڈ میں اگرچہ خواتین بہت آگے ہیں مگر مرد رائیٹرز بھی کسی سے کم نہیں اگرچہ خواتین کے ہجوم میں یہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ آٹے میں جب تک نمک نہ ہو بات بنتی بھی نہیں۔

ایڈیسن ادریس مسیح (masih) وہ نام ہے جنہوں نے اپنی تحریر سے الگ پہچان بنائی ہوئی ہے۔ آج کل آپ ان کا سوپ ''تم بن کیسے جئیں'' دیکھ رہے ہیں جو ایک چینل سے آن ایئر ہے۔

''کیسے مزاج ہیں؟''

''اللہ کا شکر ہے۔''

''آج کل آپ کا ڈرامہ ''تم بن جئیں کیسے'' دیکھ رہے ہیں۔ اچھا ہے اور سب بہت پسند کر رہے ہیں۔ تو جناب پہلے آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟''

''ضرور..... آبائی تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ لیکن میری پیدائش کراچی کی ہے۔ میں ۲۰ اگست ۱۹۸۵ء میں پیدا ہوا۔ ہم چھ بہن بھائی ہیں میرا نمبر چوتھا ہے اور شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔''

''آپ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی مقام پر آپ کو کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟''

''نہیں، مذہبی اقلیت ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی خاص مسئلہ پیش نہیں آیا۔ البتہ شروع میں مجھے نام بدلنے کے لیے مشورہ ضرور دیا گیا جسے میں نے قبول نہیں کیا۔''

''لکھنے کا ادراک کب ہوا؟''

''بچپن سے ہی..... مجھے کہانیاں پڑھنا اور لکھنا بچپن سے ہی اچھا لگتا تھا۔ چنانچہ بچپن سے ہی بچوں کے رسالے ''تونہال'' میں لکھتا رہا، اس کے بعد ''دوشیزہ'' ڈائجسٹ میں ''سچی کہانیاں'' اور ایک ادبی رسالے ''سیپ'' میں افسانے لکھے اور اس کے بعد ٹی وی ڈرامہ کی طرف آیا اور یہ بات ہے 2014ء کی۔''

''ڈائجسٹ کی دنیا سے ڈرامے کی دنیا میں کون لایا؟ پہلا ڈرامہ کون سا تھا؟''

ڈائجسٹ کی دنیا سے ڈرامے کی دنیا میں مجھے ڈرامہ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ''فہیم برنی'' لے کر آئے اور مجھے اپنی جگہ بنانے کے لیے بالکل بھی جدوجہد نہیں کرنا پڑی۔ کوئی محنت نہیں کرنا پڑی بلکہ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس فیلڈ میں آؤں گا۔

میرا پہلا ڈرامہ سیریل ''جنم جلی'' تھا جو

pklibrary.com

2014ء میں ایک بی وی چینل سے پیش کیا گیا تھا۔

''اب تک کتنے سیریلز، سوپ اور ٹیلی فلمز لکھ چکے ہیں؟''

''میرے اب تک دس بارہ سیریلز ایک سوپ اور تین شارٹ فلمز آ چکی ہیں۔ سوپ ''تم بن کیسے جئیں'' آج کل سے آن ایئر ہے جبکہ تین سیریلز انڈر پروڈکشن ہیں۔''

''میں 'تم بن جئیں کیسے' کے بارے میں بات کرنا چاہوں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ مرد حضرات خواتین کی نیچر سے بہت اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ منصور علی خان نے بے بی باجی لکھا اور آپ نے تم بن جئیں کیسے لکھا۔ تو مرد حضرات کے قلم سے ایسے ڈرامے لکھنے کی کیا وجہ ہے؟''

''کسی مرد رائٹر کا عورت کے جذبات و خیالات یا نفسیات کو پیش کرنا بہت عام سی بات ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ عورت کے جذبات، احساسات اور نفسیات کا بھرپور اظہار خواتین رائٹر کے مقابلے میں ہمارے ادبی اور پاپولر فکشن میں بھی مرد رائیٹرز نے بہتر انداز میں کیا ہے.....

اور جہاں تک ''تم بن کیسے جئیں'' کی بات ہے تو اس کی کہانی مجھے پروڈکشن کی طرف سے سنائی گئی تھی جسے میں نے اپنے اور انداز میں لکھا۔''

''گزرے زمانے کے مرد رائیٹر معاشرے کی کہانیاں لکھا کرتے تھے مگر اب یعنی آج کے دور کے رائیٹر گھریلو خواتین کی کہانیاں لکھتے ہیں..... کیوں؟''

''صرف مردوں کو ہی کیوں خواتین کو بھی ہر طرح کا ڈراما لکھنا چاہیے۔ لیکن چاہنے سے یہ تبدیلی نہیں آ سکتی۔ آج کے دور میں ٹیلی وژن کو بھی ڈائجسٹ کی طرح خواتین کے لیے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے.....

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہماری ٹارگٹ آڈینس خواتین ہیں اس لیے ایسی کہانیاں بنائی جائیں جس میں خواتین کی زیادہ سے زیادہ دلچسپی ہو اور یہ بات بے بنیاد بھی نہیں۔ کئی ایسے ڈرامے ہمارے چینلز پر پیش کیے گئے ہیں جو کئی اہم موضوعات پر Base کرتے تھے لیکن عوام نے انہیں پسند نہیں کیا۔ یہاں میں اپنے ہی چند ڈراموں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔''

''سراب کا موضوع'' شیزو فرینیا'' تھا ''بکھرے موتی'' چائلڈ لیبر عورتوں کے معاشی اور جنسی استحصال کی کہانی تھی۔ ''غیرت'' غیرت کے نام پر قتل جیسے اہم موضوع کا احاطہ کرتا تھا لیکن عوام نے ان ڈراموں کے مقابلے میں ''تم بن کیسے جئیں'' کو زیادہ پسند کیا۔''

''ایک ڈرامہ کتنی مدت میں مکمل ہوتا ہے اور آپ سال میں کتنے ڈرامے لکھ لیتے ہیں؟''

''ڈرامہ کسی مخصوص ٹائم فریم میں مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ ایک سال میں کوئی رائٹر کتنے ڈرامے لکھ سکتا ہے یا لکھ لیتا ہے اور یہ میں اپنے بارے میں بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔

بہت سارے عوامل ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ڈرامہ مکمل ہونے کا عرصہ مختلف ہو جاتا ہے۔ اب آپ نے سوال کیا کہ میرا ہٹ ڈرامہ کون سا تھا تو یعنی اب معیار ''ہٹ'' ہونا ہے ڈرامے کی صحت پر کوئی بات نہیں کرتا۔''

''کیا اپنے سیریل کی ریکارڈنگ کے دوران آپ سیٹ پر رہتے ہیں؟''

''نہیں بس اپنے ہر ڈرامے کی شوٹنگ کے دوران سیٹ پر نہیں جاتا اور اب رائیٹر کا ڈرامے کی ریکارڈنگ کے دوران سیٹ پر رہنا ضروری بھی نہیں سمجھا جاتا۔ اب یہ ذمہ داری کا تینٹ ہیڈ نبھاتے ہیں۔ البتہ چند ایک ڈائریکٹر دوست ہیں۔ جن کی ریکارڈنگ پر میں ضرور جاتا ہوں۔ لیکن اس کا مقصد صرف ملاقات ہوتا ہے جو ان کی یا میری مصروفیات کے سبب کسی اور وقت ممکن نہیں ہوتی۔''

''کبھی ریجیکشن کا سامنا کرنا پڑا؟''

''اس حوالے سے مجھے خوش قسمت کہا جا سکتا

ہے کہ مجھے کبھی حوصلہ شکنی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ البتہ میری سب سے زیادہ حوصلہ افزائی سیونتھ اسکائی کی کانٹینٹ ہیڈ سہر النساء مستقیم خان نے کی اور انہی کے بھائی "فیصل منظور نے کی۔"

"کبھی کسی کا ادھورا اسکرپٹ آپ نے مکمل کیا؟"

"ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی کا ادھورا اسکرپٹ میں نے مکمل کیا ہو۔ لیکن یہ ضرور ہوا ہے کہ دوسرے رائٹرز کے لکھے ہوئے اسکرپٹس کو مجھے ٹھیک کرنے کے لیے جب بھی دیا گیا تو ان میں ٹھیک ہونے کی گنجائش اتنی زیادہ تھی کہ ایک طرح سے پورے پورے اسکرپٹس ہی دوبارہ لکھے گئے..... جو کہ انہی رائیٹرز کے نام سے چلے ٹی وی پر۔ لیکن اسے زیادتی نہ کہا جائے نہ سمجھا جائے۔ کیونکہ ایسا میرے کہنے پر ہی کیا گیا تھا۔"

"آپ کے لیے سیریل لکھنا آسان ہے یا سوپ جو روزمرہ کی کہانی پر مبنی ہوتا ہے، آسان ہوتا ہے؟"

"میرے لیے کم اقساط والا ڈرامہ لکھنا نسبتاً آسان کام ہے۔ لیکن اگر کہانی اچھی ہے اور کہانی کا تقاضا ہے کہ اس کو 100 اقساط والے فارمیٹ پر لکھا جائے تو میں اسے بھی انجوائے کرتا ہوں۔ میرے لیے سات آٹھ اور نو بجے والے ڈراموں کے لیے کوئی تفریق نہیں ہے اب یوں بھی ڈرامہ یوٹیوب پر زیادہ دیکھا جاتا ہے۔"

"سنا ہے معاوضہ بہت اچھا ملتا ہے؟ اور آپ نے اپنے لیے کیا خریدا..... اس کمائی سے؟"

"معاوضہ اچھا ملتا ہے مگر وقت پر ادائیگی ایک اہم مسئلہ ہے جس میں بہتری لانے کی ضرورت ہے اور میں نے کیا خریدا تو اس سوال کو رہنے ہی دیں تو بہتر ہے۔"

"تنقید ہوتی ہے؟ اور کون زیادہ تنقید کرتا ہے گھر والے، سسرال والے یا عام لوگ؟"

"فنون لطیفہ سے جڑی کسی بھی چیز پر تنقید کرنا ہمارے یہاں کسی بھی لاتعلق شخص کا پیدائشی حق مان لیا گیا ہے، سب ہی لوگ اپنی طرف سے تو تنقید ہی کرتے ہیں۔ لیکن میں اسے تنقید نہیں سمجھتا..... تنقید ایک مشکل اور اہم ذمہ داری ہے اور یہ بھی ایک مکمل شعبہ ہے۔ مگر پاکستان میں اسے بہت غیر سنجیدگی سے لیا جا رہا ہے..... تنقید کے نام پر جو کچھ ہمارے یہاں ہو رہا ہے میں اسے ان کی (تنقید کرنے والوں) ذاتی رائے سمجھتا ہوں۔"

"بیگم کو آپ پر فخر ہوتا ہے۔ لوگ پہچانتے ہیں تو انہیں برا تو نہیں لگتا..... اور بچوں میں آپ کے جراثیم ہیں؟"

"میں بہت سوشل نہیں ہوں۔ لیکن اگر کوئی پہچان لیتا ہے تو بیگم بالکل بھی نہیں چڑتیں اور جہاں تک بات ہے بچوں کی تو وہ بہت چھوٹے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ہی کہانیاں سننے کے ساتھ ساتھ سنانے کا شوق بھی ہے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فارغ اوقات میں زیادہ تر سوچتا ہوں۔ کتاب پڑھتا ہوں یا پھر فلم دیکھتا ہوں۔"

"اور سیاست سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"سیاست سے میرا اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا سیاست دانوں کو پاکستان سے ہے۔"

"حلقہ احباب وسیع ہے یا مختصر؟"

"میرا حلقہ احباب بہت مختصر ہے۔ میں زیادہ لوگوں سے نہیں ملنا چاہتا..... کیونکہ لوگ نقاب پہن کر ملتے ہیں۔"

"کچن سے لگاؤ ہے؟"

"کھانا پکانے کا شوق نہیں ہے لیکن ضرورت کے تحت دو تین ڈشز بنا سکتا ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ایڈیسن اور لیس میسج سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ ٹائم دیا۔

☆☆

عید آج اور کل

ادارہ

عید نام ہے خوشی کا.....اور خوشیاں تو اپنوں کے ساتھ مل کر منائیں تو اچھی لگتی ہیں
قارئین کے ساتھ ہمارا محبت اور اپنائیت کا رشتہ ہے تو ہماری کوشش ہوتی ہے کہ خاص موقعوں پر پرچے میں ہماری قارئین ضرور شامل ہوں، اسی لیے ہم خاص نمبروں میں قارئین سے سروے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس بار بھی ہم نے عید کے موقع پر قارئین سے سروے کیا ہے۔

تہواروں پر سب دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ہر شخص خواہ غریب ہو یا امیر اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کرتا ہے۔ مہنگائی نے سب کے ہوش اڑا رکھے ہیں پھر بھی خاتون خانہ ایسے مواقع کے لیے کچھ نہ کچھ جوڑ کر رکھتی ہیں۔ تاکہ بچوں کا دل میلا نہ ہو اور دوسروں کے سامنے بھرم بھی قائم رہے۔ پہلا سوال ہم نے اسی حوالے سے کیا ہے۔

دوسرا اور تیسرا سوال زندگی کے مختلف ادوار میں عید منانے کے انداز اور چوتھا سوال اپنی ذات کے حوالے سے تیاری کا ہے۔

سوالات یہ ہیں

1۔ جس حساب سے مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ اس نے اچھے اچھوں کے بجٹ پر اثر ڈالا ہے۔ آپ کے رمضان کے اخراجات اور عید کی تیاریوں پر مہنگائی کس حد تک اثر انداز ہوئی؟

2۔ شادی سے پہلے اور اب شادی کے بعد عید میں کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟

3۔ آپ بچپن میں کیسے عید مناتی تھیں۔ اب عید کیسے مناتی ہیں؟

4۔ اپنی ذات کے حوالے سے آپ عید کے لیے خاص طور پر کس چیز کا اہتمام کرتی ہیں چوڑیاں، مہندی، کپڑے، گھر کی آرائش یا کوئی خصوصی ڈش؟

آیئے دیکھتے ہیں، ہماری قاری نے ان سوالات کے کیا جواب دیے ہیں

سلمیٰ مسرت.....راولپنڈی

1۔ ہمارے گھر کے تمام افراد کماتے ہیں الحمدللہ گھر کا تمام خرچ میرے شوہر کے ہاتھ میں ہے۔ آپ یقین کریں کہ اس مہنگائی کے رونے رو رو کر وہ ڈپریشن کے مریض بن گئے ہیں۔ میں نے خود بھی عہد کیا ہے کہ اپنے اخراجات میں تھوڑی کمی کر کے راشن کا دائرہ کار اور بڑھایا جائے اس کام میں بچے بھی بھرپور تعاون کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اچھائی کی توفیق دے اور ہمارا وطن مشکلات سے نکل آئے۔ (آمین)

2۔ واضح فرق ہے۔ شادی سے پہلے والی عیدیں ہی گولڈن تھیں، ساری فکروں سے آزاد اپنے من پسند عید کارڈز خریدنا اور میزبان بن کر خوب انجوائے کرنا۔ شادی کے بعد ذمہ داریوں کا ایسا طوفان آیا ہے کہ میں عید کے کپڑے عید کی نماز پڑھنے کے بعد کچن میں آتے ہی چینج کرتی ہوں۔ بس سارا دن کچن میں کھانے بناتے، برتن دھوتے گزر جاتا ہے اکثر اتنی مہمان نوازی ہوتی ہے کہ شام کو تھکاوٹ سے بخار ہو جاتا ہے۔

3۔ میرے بچپن کے دن، کتنے اچھے تھے دن کراچی سے پنجاب سائیڈ پر منڈی بہاؤ الدین (ددھیال) جھنگ (ننھیال) عیدیں کرنے آتے تھے، اتنے خوب صورت رشتے تھے سب سے عیدیاں وصول کرتے ہوئے اور پھر اپنی من پسند ہر چیز خریدنا سہیلیوں اور کزنز کے گھر جانا۔ بس مزے ہی مزے

تھے۔اب میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اپنے بچوں کی کوئی خواہش ادھوری نہ رہنے دوں۔ان کے کپڑے، جوتے سب کچھ رمضان سے پہلے مکمل کر لیتی ہوں ،چاند رات کو ناشتے کے پکوان تیار کرتے ہوئے اور گھر کو سیٹ کرتے ہوئے گزارتی ہوں پھر بچوں کو پارک لے جانا بھی ضروری ہوتا ہے اور مہمان نوازی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

4۔اب اپنی ذات تو بہت پیچھے رہ گئی ہے البتہ گھر کی سیٹنگ پر خصوصی توجہ ہوتی ہے۔عید کی خاص ڈش شیر خورما ہے جو مجھے خود بھی بہت پسند ہے۔یہ میں ختم نہیں ہونے دیتی اور کپڑے ہمیشہ ایسے بنواتی ہوں جو سارا سال استعمال میں رہتے ہیں۔

یسریٰ ملک.....کندیاں

1۔پہلا سوال مہنگائی کے بارے میں ہے۔ مہنگائی نے تو اچھے خاصے امیر طبقے کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہمارا تعلق تو متوسط گھرانے سے ہے۔اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے بھرم قائم رکھا ہوا ہے۔ فضول خرچ میں کبھی بھی نہیں رہی۔اور اب تو پہلے سے بھی زیادہ کفایت شعار ہو گئی ہوں، میری کوشش ہوتی ہے کہ رمضان سے پہلے عید کی تیاری مکمل کر لوں۔بچوں کے کپڑے، جوتے وغیرہ زیادہ تر تو ان کے ابو لے آتے ہیں، کبھی کبھار مجھے بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ایک ایک جوڑا ریڈی میڈ اور دو سوٹ کا کپڑا لے لیا۔سلائی میں خود بہت اچھی کرتی ہوں ہر قسم کا ڈیزائن بڑی آسانی سے بنا لیتی ہوں۔ برانڈ کے چکر میں کبھی نہیں پڑتی، جو مل جائے اللہ کا شکر ہے۔رمضان میں بھی فضول خرچی کبھی نہیں کی۔ سادہ سی سحری، افطاری ہوتی ہے۔پکوڑے یا سموسے بنا لیے ساتھ میں چٹنی بنا لی۔بس کھجوریں ضرور لیتی ہوں 2۔شادی سے پہلے سب کچھ امی کرتی تھیں۔ اب خود کرنا پڑتا ہے۔عید کے کپڑے اور جوتے تمام بہن بھائیوں کے امی لے کر آتی تھیں اور ہم لوگ بہت خوشی سے پہن بھی لیتے تھے۔کبھی کوئی نخرا نہیں کیا۔عید کے دن ابو جی سے عیدی ملتی اور شام کو ہم اسی عیدی سے جھولے لینے جاتے۔ ہمارا گھر بازار سے نزدیک تھا اور ہر عید پر ایک جھولے والا آتا تھا۔ ہم سارا سال عید کے دن کا انتظار کرتے تھے۔شادی کے بعد عید دوسروں کی مرضی سے مناتے ہیں۔ میرے سسرال والے کسی بھی تہوار پر کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے۔

3۔میں بچپن میں بھی بہت صلح جو اور کم گو بچی تھی۔کبھی کوئی فرمائش یا ضد نہیں کی۔جو مل گیا۔ خاموشی سے لے لیا۔میں تیسری جماعت میں تھی کہ ہم لوگ امی کے ساتھ بازار گئے تو ایک دکان پر چھوٹے چھوٹے عید کارڈ سجے ہوئے تھے۔زندگی میں پہلی بار میں نے امی سے ضد کر کے پیسے لیے اور ساری کلاس کے لیے عید کارڈ خریدے۔سب کو خود لکھ کر دیے۔بدلے میں مجھے بھی ساری کلاس نے عید کارڈ دیے جو آج تک میرے پاس محفوظ ہیں۔اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔سب کچھ موبائل پہ ہو رہا ہے۔کوئی رونق ہی نہیں ہوتی، سارا دن کچن میں ہی گزر جاتا ہے۔4۔اپنی ذات کے لیے میں نے کبھی کوئی تردد نہیں کیا۔میاں جی عید کا جوڑا لے آتے ہیں۔میں سی کے پہن لیتی ہوں۔باقی چوڑیاں، مہندی وغیرہ ایک عرصہ ہوا، سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔گھر کی سیٹنگ چینج کرتی ہوں۔گملے وغیرہ رنگ کر لیے۔نئے پردے لگا دیے۔پردے بھی میں خود کپڑا لے کر بناتی ہوں۔ان پر جھوڑی بہت ڈیزائننگ کرتی ہوں تو بہت پیارے لگتے ہیں۔ہمارے کچھ رشتہ دار دوسرے شہروں میں رہتے ہیں، جو صرف عید پر ہی ملنے آتے ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ”ہر عید پر ایسا لگتا ہے کہ یسریٰ نے نیا گھر بنوایا ہے۔“اور ڈش کوئی خاص نہیں بنتی۔ سویاں، زردہ بناتی ہوں۔میں پلاؤ بہت مزے کا بناتی ہوں۔میری نندیں فرمائش کر کے بنواتی ہیں کہ عید کے دن یسریٰ کے ہاتھ کا پلاؤ نہ کھائیں تو عید عید نہیں لگتی۔

فرخندہ سلیم.....ملتان

اس مشینی سی زندگی میں شعاع دوخواتین کو پڑھ کر

ان میں شرکت کر کے ایک فرحت بخش سا احساس ہوتا ہے کہ اب تو یہ میکے کی مانند لگتے ہیں جہاں سب سننے والیاں بھی ہیں، خوشی غمی میں ساتھ دینے کے ساتھ ساتھ حوصلہ دینے کے لیے اور معیاری تفریح بھی مل جاتی ہے وہیں ان رسائل میں آ کر ماضی کی دلکش سی سنہری یادیں۔ جب ہر طرف خونی رشتوں کی محبتیں تھیں اور احساس اور لگن اور بے لوث اپنا پن تھا۔

1۔ مہنگائی تو سچ کہا، گھر کا بجٹ تو کیا بہت سی چیزیں، خواہشیں اور تمنائیں اس منحوس ماری مہنگائی کی لپیٹ میں آ جاتی ہیں۔ کبھی راشن اور اشیا خوردونوش، کبھی دوسری بنیادی ضرورت کی چیزیں گرمیوں میں بجلی اور گیس کے مسائل اور بل جن سے چھٹکارا جنت میں ہی ملے گا یہ اکثر بہت بری طرح عید اور رمضان کی تیاریوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

بہت زیادہ خیال کرنے کے باوجود بجلی کا بل حد سے زیادہ آ جائے تو رمضان المبارک کے معاملات میں میانہ روی اختیار کرنا پڑتی ہے اور اس طرح ہر چیز کو گھر میں مینج کرنا پڑتا ہے ہاں مگر کوشش ہوتی ہے کہ رمضان میں گھر میں خود چاہے جیسے بھی گزر بسر ہو، مگر کوئی مہمان آئے تو دستر خوان وسیع کیا جائے کہ اس کی اپنی فضیلت ہے۔

وہیں عید کی تیاریوں کا یہ ہے کہ اگر زیادہ مسائل ہوں تو اپنے کپڑے نہیں بناتی بلکہ بچوں کو ترجیح دیتی ہوں اور جو پہلے کے کپڑے ہوتے ہیں ان کو ہی اگر سلیقے سے سوچ سمجھ کر رکھا جائے اور پہن لیا جائے تو کوئی برائی نہیں اور ہمیں یہ بھی نہیں زیادہ سوچنا چاہیے کہ فلاں دوست، نند، بھابی، دیورانی یا جیٹھانی کیا کہے گی بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز اپنے لیے پسند آتی ہے اور وہ بجٹ سے باہر بھی ہوتی ہے تو صبر ہی کیا جا سکتا ہے۔

2۔ شادی سے پہلے اور اب کی عید میں تو بہت زیادہ فرق ہے کہ شادی سے پہلے ایک بے فکری زندگی ہوتی تھی اپنے والدین، بھائی بہن، دوستوں اور کزنز کے سنگ عید کی وہ دلکش سی یادیں ذہن پر نقش ہیں جہاں ہر طرف چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوشیاں تھیں، پرخلوص رشتے تھے، ہماری من مانیاں یا ضدیں بھی تھیں۔ ابو اور بڑے بھائیوں سے الگ سے عید کے کپڑوں کے پیسے لینا اور اماں یا بڑی بہنوں کے ساتھ کسی دوست کو لے کر چاند رات کی گہما گہمی میں بازار سے خریداری کرنا یا پہلے سے بھی سب ریڈی ہو پھر سے کسی نہ کسی چیز کو بنا دینا کر بازار کے چکر لگانا اور ہم بہنوں کا کھٹے گول گپے جس میں پیلی والی چٹنی زیادہ اور سفید والی کم ڈلواتے تھے۔ بڑے سائز کی پلیٹ بھر کر کھانا اور اماں کا ڈانٹنا اور کہنا "اے فرخندہ بس کر دے۔ کہیں تجھے السر نہ ہو جائے اتنا کھٹا کھا کر" اور میں کہوں "اماں اس کی ابھی ہماری نہیں آپ کی عمر ہے وہیں۔" اماں کا لعن طعن کرنا۔

وہ عید کے دن اماں سے چھپ کر کمرے میں بند ہو کر ہم بہنوں کا خوب تیار ہونا۔ اونچی ہیل پر غرارہ پہن کر اتر اتر اکر چلنا اور تیل کی شیشی کو گھر سے غائب کر دینا کہ کہیں اماں عید کے دن بھی تیل کی بوتل سر پر نہ انڈیل دیں کہ چوٹی بھی تو اتنی کس کر کرتی تھیں کہ آنکھیں اوپر کو ہو جائیں، خیر یہ یادیں تھیں اور اب کی عید بھی اچھی ہے جس میں پہلے کی نسبت بہت فرق ہے کہ اب بچوں کی خوشیوں میں ہیں اور سسرال والوں کے ساتھ بھی اچھا وقت گزر جاتا ہے بچے اور شوہر بھی اللہ کا کرم ہے کہ خیال کرتے ہیں سسرال والے بھی اچھے ہیں۔

3۔ اس سوال کا جواب اس سے پہلے والے میں کافی حد تک موجود ہے ہاں مگر اب کی عید سے متعلق ذرا بتا دیتی ہوں تو دن کا آغاز نماز سے ہوتا ہے۔ کھیر یا کوئی دوسری میٹھی چیز ساتھ ہی چڑھا دی کپڑے تو ایک دن پہلے سے ہی تیار رکھتے ہیں کہ بجلی ڈاؤ کینس فریج کی طرح ریلائبل نہیں ہے روٹھ کر جا سکتی ہے، باپ بیٹے نماز پڑھنے گئے تو تیار ہو کر وہیں میں بھی ناشتہ بنا لیتی ہوں۔ واپسی پر سب عید ملتے ہیں اور اچھے سے ناشتہ کرتے ہیں پھر یہ قبرستان جاتے ہیں اور بعد میں یا تو پہلے دن میرے یا میرے

دیوروں کی طرف سے دعوت ہوتی ہے اور نندیں بھی آجاتی ہیں وہیں تین دن مہمان بنتے یا میزبانی کرتے ہنسی خوشی گزر جاتے ہیں جہاں مرد اپنی مہنگائی سیاست، بچے اپنی باتوں میں یا کھیل کود میں مگن اور ہم خواتین اپنے کپڑوں، ڈراموں، ڈائجسٹ کی کہانیوں پر کہ کس کہانی میں آگے کیا ہوگا، کون مرے گا، کون جیے گا کس کی پیاکس کے ساتھ پار لگے گی، پر بات کرتی ہوتی ہیں یا گھریلو باتوں پر تبصرے کر رہی ہوتی ہیں فون پر دور کے عزیزوں سے باتیں بھی ہو جاتی ہیں اور اس طرح عید کے اب کے یہ دن اچھے سے گزر جاتے ہیں۔

4۔ چوڑیاں تو اب کم ہی اپنے لیے لیتی ہوں ورنہ پہلے تو بہت شوق تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ شوق بھی بدل جاتے ہیں بھی کسی کی شادی ہو بس تب ہی کوئی کڑے لیتی ہوں، عید پر بھی چوڑیاں نہیں لیتی کہ اب چھیالیس برس ہو گئے تو بس دل نہیں کرتا تاہم بچے کہتے ہیں کہ سب پہنو اور فیشن کرو۔ اپنے لیے بس عید پر سوٹ ہی اکثر لے لیتی ہوں اور جوتیاں بھی اگر پہلے والی میچ کر جائیں تو نہیں لیتی ہاں بالیاں مجھے شروع سے ہی بہت پسند ہیں تو وہ ضرور لیتی ہوں ساتھ انگوٹھی بھی اکثر لے آتی ہوں اور اپنی چھوٹی سی جیولری اس لکڑی کے گول سے ڈبے میں رکھی ہوئی ہے جو شادی سے پہلے کا ہے وہیں امی جی کا پاندان بھی یادگار کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ مہندی بھی بچیاں لگاتی ہیں تو ایک ہاتھ ہی پر بس ایک بیل بنوالی کہ اب زیادہ شوق نہیں ورنہ بچیاں کہتی ہیں کہ دونوں طرف لگاؤ پورے ہاتھوں پر مگر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میک اپ تو کم ہی خریدتی ہوں کہ ایک بار پورا اچھا سا لے لیں تو کافی وقت تک چل جاتا ہے بس کہیں جاتے ہوئے کریم لگالی اور میڈورا میرون رنگ کی لپ اسٹک لگالی، خیر باقی اپنی بیٹیوں کے لیے چیزیں لیتی ہوں زیادہ تر خاص ڈش دال کا حلوہ ہے جو سکھا کر چھوٹی کٹوریوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ شوہر سلیم کھیر پسند کرتے ہیں اور عید کے علاوہ بھی اکثر لذیذ کھیر ہی بنتی ہے جب کہ بچے کسٹرڈ ہاں مجھے ذاتی طور پر عید کے دن لب شیریں زیادہ پسند ہے۔

ریحانہ وقاص.....لاہور

1۔ مہنگائی تو ایک سونامی طوفان بن گئی ہے۔ قیمتیں صبح شام انڈیکس پوائنٹ کی طرح ٹکنے کا نام نہیں لے رہیں۔ بے یقینی کی سی کیفیت رہتی ہے۔ بجٹ تو بننے کا نام نہیں لے رہا بس قیمتیں اور پیکیجز اب تو سوشل میڈیا کے ہی سستے رہ گئے ہیں۔ اب ہوتا کیا ہے، کہ لوگ جو کھا رہے ہیں، پی رہے ہیں، خرید رہے ہیں۔ ہر ہر چیز کا اسٹیٹس لگا دیتے ہیں۔ بچیوں کی شاپنگ لڑکوں کی نسبت مہنگی آتی ہے۔ لوازمات ہی ختم ہونے کا نام نہیں لیتے۔ پاس بیٹھے لوگوں کی بلکہ ساتھ چلتے لوگوں کی اتنی فکر نہیں ہوتی جو دور بیٹھے لوگوں کے کمنٹس کی ہوتی ہے۔ اب تو بچوں کے منہ بھی پوز کے لیے بنے رہتے ہیں۔ ہماری فیملی میں ایک بہت قریبی عزیزہ ہیں۔ ان کا تو صبح اٹھ کر پہلا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ آج کا اسٹیٹس لگا دیں۔ تیار ہو کر تصویریں کھینچیں اور کپڑے بدل لیے۔

رمضان میں بھی سادا کھانے کے بجائے بچے لوازمات کا ڈھیر چاہتے ہیں دیکھا دیکھی۔

2۔ شادی سے پہلے لگتا ہے کہ چاند پر رہتے تھے زمینی مسائل کا پتا نہیں تھا وہاں کے بعد زمین پر آئے تو آٹے دال کا بھاؤ پتا چلا۔ سسرال والوں کی خوشیوں کا احساس کرنا اپنا، آپ مار کر کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں شیطان کی آنت کی طرح ہیں سسرالی مسائل جو ہم مرتک جائیں لیکن وہ ختم نہ ہوں۔

اب بھی عید کا سوٹ امی سلوا کر بھیجتی ہیں۔ (جگ جگ جیو ہزاروں سال) پہلے بس خوشیاں ہی خوشیاں ہوتی تھی، اب فکریں ہی فکریں ہوتی ہیں۔

رات کو امی پورے ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی کا پورا لیپ کر دیتیں اور ہم پوری رات چارپائی سے باہر پاؤں اور مٹھی دبائے سو جاتے اور صبح پورے ہاتھ اور

آدھا منہ مہندی سے رنگا ہوتا جسے بعد میں پاؤڈر لگا کر کور کیا جاتا۔

ایک دفعہ جب ہم ہوں گے کوئی سات آٹھ سال کے تو ہماری بڑی بہن صاحبہ نے ہماری سائیڈ پونی کر کے فل میک اپ کر دیا۔ ہم بھی پرس ہاتھ میں تھامے موٹی موٹی آنکھوں میں اندر باہر کا جل لگائے سامنے والے پڑوسیوں کے گھر پہنچ گئے جنہوں نے ہمارا خوب بینڈ بجایا۔

"کس نے اتنا پیارا تیار کیا ہے تمہیں؟" وہ ہنس ہنس کے بے حال ہوتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"ہماری باجی نے۔" ہم معصومیت سے ان کی ہر بات کا جواب دیتے جاتے.....

عید، عید لگا کرتی، سارا دن تیار شیار محلے سے آئے ہوئے چھولے، پکوڑے سموسے، آئس کریم وہی بھلے چہرے پر مسکراہٹ لیے کھاتے رہتے۔ سستے زمانے اور سستے لوگ والی بات تھی۔ (اب کہیں بہنیں یہ مت سمجھ لیں کہ ہم پتا نہیں کتنے پرانے ہیں۔ خواہشات مختصر سی تھیں ماں نے جو لا دیا خوشی خوشی پہن لیا۔) اب تو میری بڑی بیٹی (جو صرف دس سال کی ہے) کی چوائس ہوتی ہے۔

"مما! آپ کو مہندی لگانی نہیں آتی، پارلر سے لگوا لیتے ہیں۔"

سب نے بھر بھر کے اسٹیٹس لگائے ہوتے ہیں اور پھر یہ نسل کہتی ہے کہ ہم کسی سے کم نہیں۔.....

تھوڑی دیر کپڑے پہنے، تصویریں بنائیں، کپڑے چینج اور پھر بس آرام ہی آرام۔ بوریت ہی بوریت ان کے لیے۔

لیکن ہم لوگوں کو ان سے بہتر ماحول ملا تھا آنے جانے پر، گھومنے، پھرنے پر ایک دوسرے کے گھر جانے پر اتنی پابندی نہیں تھی۔ اب بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے بچوں کو باہر بھیجنے سے ڈر لگتا ہے۔ اور ان کو صرف ہمارے (والدین کے) ساتھ ہی گھومنے پھرنے کی اجازت ہے بس اس لیے ان کو عید اتنی گلیمرلیس نہیں لگتی۔

اب تو عید ذمہ داریوں کو نبھانے کا نام رہ گئی ہے یا بچوں کو تیار دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ بچے بھی تھوڑی دیر ہی سوٹڈ بوٹڈ ہوتے ہیں اور پھر ایزی ماحول میں آ جاتے ہیں۔ خود تیار ہوتے ہیں، میاں صاحب کے لیے جو بغیر تیاری کے عیدی نہیں دیتے۔ (ہاہاہا.....)

نند باجی کے آنے کا بھی دن ہوتا ہے اس لیے ان کا خاص اہتمام ان سے پوچھ کر ان کے مطابق کرنا ہوتا ہے (ورنہ شامت یکی ہے) شام کو بلکہ رات کو بچوں کے ساتھ آئس کریم کھانے چلے جاتے ہیں اور یوں عید تمام ہو جاتی ہے۔

کچھ ڈیکوریشن اور برتن خریدتی ہوں۔ نئی بیڈ شیٹ خریدتی ہوں جو خاص طور پر عید والے دن بچھاتی ہوں۔ چنا چاٹ + کباب + کڑاہی گوشت + آلو والے چاول (کیونکہ میرے میاں صاحب کو گوشت ناپسند ہے) اور سویاں تو لازم و ملزوم ٹھہریں۔

صدف ناصر..... جڑانوالہ

(ا) مہنگائی نے اثر انداز کیا ہوتا ہے۔ اس نے تو کچھ چھوڑا ہی نہیں کسی کا۔ کیا روزمرہ کے معمولات اور کیا رمضان اور عید، رمضان چند سال پہلے تک خوب بارونق ہوتا تھا۔ جی بھر کر "گردھری" کی جاتی۔ فریج کو خوب سجایا سنوارا جاتا۔ ہر چیز پلان کر لی جاتی کہ پورے ماہ کیا کیا بنانا ہے اور کس کس طرح محلے داروں اور ضرورت مندوں کو بھجوانا ہے۔

رمضان سے دو دن پہلے حق داروں کو راشن پہنچا دیا جاتا تھا، جام شیریں کی بوتلیں تو لازم تھیں بہت سے لوگوں کو بھجوانے کے لیے مگر یہ سب۔

"دور کا فسانہ ہے اور دیر کی کہانی ہے۔"

اب تو مہنگائی اور بے برکتی کی نحوست سے اپنی ہی بنیادی اشیائے ضرورت ناکافی آتی ہیں۔ کجا کہ ضرورت مندوں کو کچھ دیا جائے۔ ایسے بے رنگ اور بے ذائقہ دن ہو گئے ہیں کہ رمضان کی خوشیاں ماضی کی خوب صورت یادیں بن گئی ہیں۔

عید کی تیاریوں میں بلا مبالغہ اہل خانہ کی مکمل تیاریوں کے ساتھ ساتھ پورے گھر کو نئے سرے سے بدلا اور سجایا جاتا تھا۔ پورے سال کی میری ''بچت'' عید پر اٹھ جاتی تھی۔ بیڈ شیٹس، کراکری، پردے، کشن، مسالہ ریک ہر ہر چیز نئی لیتی کہ عید پر جہاں بھی نظر پڑے، کہیں بھی پرانی چیز نہ ہو۔

چاند رات کو صوفہ کور تو لازمی سلائی کروا کر ڈالتی۔ مگر اب تو سب کچھ خواب ہو گیا ہے۔

اہل خانہ کی عید کی تیاری آدمی رہ گئی مزید برآں ''فلسطین'' کی حالت زار دیکھ کر ہماری عید، شاپنگ، خوشیاں منانا بنتا ہی نہیں ہے۔

(2) شادی سے پہلے تو بس ''راوی چین ہی چین لکھتا رہا۔'' نہ گھر کے کاموں کی ذمہ داری نہ ہی کوئی اور ٹینشن۔ پورے ماہ روزے رکھنے، تراویح پڑھنے جانا، عید کی صفائیاں چاند رات کو کرنا اور عید پر سوئے رہنا تیار ہو کے۔ اور فکریں ساری امی کی۔

شادی کے بعد چودہ طبق روشن ہوئے۔ سسرال کی تیاریاں، شوہر اور بچوں کی تیاری، گھر اور کچن کی شاپنگ، کام کام کام۔ بہر حال زمین آسمان کا فرق ہے۔ سب کچھ میسر ہے سوائے پہلے کی خوشی، بے فکری اور سکون ہے۔

(3) دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ ڈالا آپ نے۔ بچپن کی عید کی یاد دلا کر۔ جب دادی حیات تھیں تو چاند رات کو بہت ہی پیاری سلائی مشین، واشنگ مشین ٹائپ کھلونے عیدی کے طور پر دیتی تھیں۔ جو ہمیں دنیا کے بہترین تحفے محسوس ہوتے، ان کھلونوں کی پیکنگ کھولنے سے گھبراتے تھے۔ امی اور دادی مہندی لگا کر مٹھی بند کر دیتیں کہ صبح اٹھو گے تو رنگ بن جائے گی۔'' سوٹ، جوتا اور چوڑیاں بار بار اٹھ کر ہاتھ لگا لگا کر دیکھتے، نیند ہی نہیں آتی تھی۔

صبح خود بخود پہلی آواز سے ہی جاگ اٹھتے، عید کی خوشی میں۔ پھر سارا دن نہ تو عیدی ختم ہوتی تھی نہ ہی چیزیں۔ اتنی برکت تھی تب پیسوں میں اور سب کاموں میں۔ پورا دن سہیلیوں کے ساتھ گزار کر سر شام ہی تھکن سے چور سو جاتے تھے۔

اور اب کی عید..... سوائے ٹینشن، جوڑ توڑ، فکروں کے کچھ بھی نہیں۔ شادی سے پہلے بچپن میں ہم زندگی کو گزارتے تھے اب تو زندگی ہمیں گزارتی ہے۔

(4) اپنی ذات کے حوالے سے اہتمام کبھی اگر نہیں کیا۔ ''حسن ہو تو زاکت آ ہی جاتی ہے کے پیش نظر کم مگر بھرپور اہتمام لازم ہے۔ مہنگائی کے پیش نظر شاپنگ محدود ہو گئی ہے۔ مگر پھر بھی ایک بہترین سوٹ، میچنگ کھسہ، چوڑیاں، جیولری، شعاع اور خواتین کے چار سے پانچ پرانے ڈائجسٹ، کچن کارنر کی ڈشز لازم و ملزوم ہیں۔ کچھ پیسے بھی لازمی محفوظ کرتی ہوں تاکہ وہ ''بقر عید'' پر کام آسکیں۔ مجھے کبھی بھی اچھا نہیں لگا کہ بڑی عید پر بھی گھر کے سربراہان کو بے جا اخراجات ڈال کر پریشان کیا جائے۔ کیونکہ انہوں نے قربانی کرنا ہوتی ہے تو باقی اخراجات میں اٹھا لیتی ہوں۔ اس سے دلی سکون ملتا ہے۔

رضوانہ وقاص..... کرلاں ہری پور

سروے کے جوابات لیے حاضر ہیں ہم۔

(1) یہ بات تو ٹھیک ہے جس حساب سے مہنگائی بڑھ رہی ہے۔ گھر چلانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

بات ہو رہی ہے عید کے حوالے سے تو میری تو ویسے بھی یہی کوشش ہوتی ہے۔ کہ میرے بچوں کی کوئی خواہش ادھوری نہ رہے۔ اور بچوں کے ماموں بھی بولتے ہیں۔ یہ جو فرمائش کریں ضرور پوری ہو۔ (آمین) احمد تو بولتا ہی نہیں جو لے دیا خوش۔ میں کہتی ہوں جیسے عباس، عالیان، ارسلان اپنے پاپا سے فرمائشیں کرتے ہیں، تم بھی کیا کرو۔

بیس ویں روزے کے بعد ہم تیاریاں شروع کرتے ہیں اور چاند رات تک رہتی ہیں۔ مما، پاپا ہماری یہ چیز رہ گئی۔ ہماری یہ رہ گئی ہے۔ یہ لانا ہے وہ لانا ہے۔ بس میں اپنے بچوں کی تیاری اچھے سے کرتی

بھی ہوں، کرواتی بھی ہوں۔

(2) فرق تو کوئی بھی محسوس ہوتا ہی نہیں۔ کیونکہ شادی سے پہلے میری تیاری امی کرتی تھیں۔ اور اب میرے شوہر ہر چیز لا کر دیتے ہیں۔ شکریہ جی دل سے اور اللہ کرے اسی طرح ہم ہنستے مسکراتے رہیں۔ (آمین)

مہندی اور چوڑیاں تو پہلے بھی بہت پسند تھیں۔ اور اب بھی ہیں لیکن اب چوڑیاں زیادہ نہیں پہن سکتی۔ ایک تو امی اٹھاتی ہیں تو ٹوٹ جاتی ہیں امی کو بھی چبھتی ہیں مجھے بھی۔

اس دن اتوار والے دن مجھے عالیان نے چوڑیاں دلوائیں، پیلے، سبز، سفید اور لال رنگ کی سادہ چوڑیاں ان شاء اللہ عید پر پہنوں گی زندگی رہی تو، زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ بس ارمان تو بہت ہیں۔ پتا نہیں کب پورے ہوں گے۔ مجھے اس بات کا پتا ہوتا کہ میں اتنی بیمار ہو جاؤں گی تو۔ کسی عید پر پارلر سے مہندی لگوا لیتی۔ یہ حسرت رہ گئی۔ مہندی مجھے بہت پسند ہے۔

(3) بچپن کی عید ہی تو عید ہوتی تھی۔ کپڑے سل کر آتے تو بار بار پہن کر دیکھنا، کیسے لگ رہے ہیں۔ مہندی، چوڑیاں، ہار، بند ہے اور سب کے گھر جانا سب سے عید ملنا۔ پورا دن عید ملنے میں گزر جاتا اور گھومتے ہی گزر جاتا۔ اور اب کی عید سب مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ کہ یہ اب چل نہیں سکتی۔

ایک بات بتاؤں، شروع شروع میں جب مجھ سے وہ زور سے بولتے تھے۔ تو یہ بات بہت بہت بری لگتی تھی۔ میں رونے لگ جاتی۔ لیکن اب جب بندہ خود چل نہ سکتا ہو تو معذور ہی ہوا ناں۔ اس بات پر دکھی ہو جاتی ہوں۔ چلیں جی جو میرے اللہ پاک کی رضا۔ میں راضی ہوں اس میں۔

(4) اپنی ذات تو جیسے کہیں کھو گئی۔ جیسے تیسے بھی اب زندگی گزارنی ہی ہے۔ کبھی روتی ہوں کبھی ہنستی ہوں۔ لیکن پھر بچوں کی خوشی کے لیے درد میں بھی مسکرا دیتی ہوں۔ کہ میرے بچے ہی اب میری زندگی اور میرے جینے کی وجہ ہیں اور اللہ پاک میرے بچوں کو صحت و تندرستی والی لمبی زندگی دے۔ (آمین)

گھر کی سجاوٹ پر امی بہت توجہ دیتی ہیں۔ پچھلی عید پر بھائی کے گھر خوشی آنے والی تھی اس وجہ سے گھر پر توجہ دی۔ رنگ کروایا۔ اور اب اگر اللہ کو منظور ہوا تو شاہ زیب کی شادی کی تیاری شروع۔ دعا کرنی ہے۔ سب اچھا اچھا ہو (آمین) اور میری پسندیدہ چیزیں مہندی، چوڑیاں کپڑے میں اب اپنے شوہر کی پسند کے پہنتی ہوں۔ پہلے امی کی پسند کے پہنتی تھی۔ یہ تیاری ہوتی ہے۔ اب ڈنر میں چاٹ۔ چنے والی بریانی۔ اور گرمی ہو تو شربت جام شیریں۔

ریحانہ چوہدری..... مدو کے

(1) سب سے پہلے تو داد دوں گی آپ کی ٹیم کو جو چن کے ایسے سوالات لاتے ہیں۔

ایک بات تو ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے، ہر عہد میں یہی دیکھتے اور سنتے آ رہے ہیں کہ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے مگر اس کے باوجود لوگوں کے اخراجات میں کمی ہونے کے بجائے مسلسل اضافہ ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

ایک وقت تھا، سادہ سی سحری اور سادہ سی افطاری ہوتی تھی مگر اب تو ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی افطاریوں اور عید ملن پارٹیوں میں نمود و نمائش کرتے ہیں۔ مگر الحمدللہ ہم نے ایسی کوئی کوشش کبھی نہیں کی۔ اپنے اخراجات کم کر کے سب رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں۔

میری کوشش ہوتی ہے کہ اپنے اور بیٹیوں کے کپڑے بھی خود ہی ڈیزائن کر کے خود ہی سلائی کروں اس طرح سلائی بچا کر مہنگائی کا توڑ کرنے کی کوشش کرتی ہوں مگر پھر بھی سب کو عید کے تحائف اور عیدیاں دینے میں بجٹ بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔

اس پہ مستزاد یہ کہ آج کل کے دور میں کچھ لوگ ہر فیملی میں ایسے ضرور ہوتے ہیں کہ ان کو جتنا بھی خوش کرنے کی کوشش کر لیں۔ ان کا موڈ اچھا نہیں ہو سکتا۔

(2) وہی فرق ہے جو زمین اور آسمان میں ہے۔ پہلے تو یہ حال ہوتا تھا کہ ”فکر نہ فاقہ عیش کر کاکا“ بہت دن پہلے سے ہی عید کا انتظار شروع ہو جاتا تھا اور عید کا مطلب صرف انجوائے منٹ ہوتا تھا مگر شادی کے بعد تو عید صرف ذمہ داریوں کا نام ہے ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے اپنی ذات خود فراموشی کے صحرا میں چاہتوں کے سراب میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اور آخر میں سننے کو ملتا ہے کہ سب ہی کرتے ہیں، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ماشاء اللہ سے عید کے دن اپنا ہوش ہی نہیں رہتا مگر عرفان صاحب بچوں سے بار بار کہتے ہیں کہ ماما سے بولو، تیار ہو جائیں تو ان کی خوشی کے لیے تھوڑا بہت تیار بھی ہونا پڑتا ہی ہے۔ حرہ تو بہت آتا ہے مگر اب عمر کا تقاضا ہے کہ شام تک تھکن ہو جاتی ہے۔

خیر عید کا ایک اپنا ہی چارم ہوتا ہے۔ بے شک ہر عمر میں جدا جدا ہوتا ہے۔ مگر ہوتا ضرور ہے پہلے عیدی لے کر خوشی ہوتی تھی اب دے کر ہوتی ہے۔

(3) میرے بچپن کے دن کتنے اچھے تھے دن آج بیٹھے بٹھائے کیوں یاد آ گئے۔

ارے مہربانو! یہ کیا یاد دلا دیا بچپن میں تو عید نام تھا خوشی کا، انبساط کا، خوشیوں سے لبریز لمحات کا۔

بچپن میں عید اور رمضان کا چاند دیکھنے کا خاص اہتمام ہوتا۔ سر شام ہی کھلی کھلی چھتوں (جن کی منڈیریں ایک دوسرے سے باہم ملی ہوئی ہوتی تھیں) پر چڑھ کر سب لوگ آسمان پر چاند ڈھونڈا کرتے اور پھر تادیر ایک دوسرے کو مبارک باد دینے کا سلسلہ جاری رہتا۔

سحری کے ٹائم ڈھول بجا کر جگایا جاتا پھر عید پر نئے کپڑے ملنے کی خوشی۔ گھروں میں میدے سے خود سویاں بنائی جاتیں۔ ہمارے ڈیرے پہ والد گرامی قدر نے مہندی کے پودے لگائے ہوئے تھے۔ وہاں سے آئی مہندی کو خشک کر کے پیسا جاتا، مٹی کے پیالے میں صبح بھگو کر رکھ دی جاتی۔

رات کو مجھ سے بڑے گل بھائی ایک باریک سا تنکا لے کر ایک ہاتھ پہ چاند تارے اور دوسرے پہ پھولوں پتوں والے ڈیزائن بناتے۔ عید والے دن، صحن میں لگے بیری کے درخت پر موٹے سے رسے کی پینگ (جھولا) ڈالی جاتی اور خوب انجوائے کیا جاتا۔ عیدی کی مد میں پانچ یا دس روپے بھی مفت اقلیم کی دولت سمجھے جاتے تھے۔ اب عید بعد میں آتی ہے۔ حساب کتاب پہلے سے شروع ہو جاتے ہیں۔

انظاریوں کے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔ کوشش ہوتی ہے کہ بانٹنے والا کام انظاری سے قبل ہی ہو جائے۔ پھر میرے شہزادے ارسلان صاحب کے دوستوں کی گریڈ انظاری اپنی نندوں کی عیدی پہنچانا اب اس مرتبہ ارجمند کو بھی عید پہ ادھر ہی لانے کی کوشش کروں گی کہ اس کے بغیر یہ پہلی عید ہو گی ورنہ انظاری کا موٹی کام وہی کرتی تھی۔

بہرحال ہر عمر کے اپنے تقاضے اور اپنی خوب صورتی ہوتی ہے۔

(4) جب شادی ہو جاتی ہے تو پھر اپنی ذات پس پشت چلی جاتی ہے۔ پہلے تو سسرال والے اور اپنے صاحب بہادر کی ذات مبارک اہمیت کی حامل ہوتی تھی۔ عید کا مطلب ہی یہی تھا کہ سب کی مرضی اور آرڈر کے مطابق بغیر ماتھے پہ کوئی شکن ڈالے صبح سے شام تک پکوان پکاتے جائیں اور استعمال شدہ برتن دھوتے جائیں اور خوش دلی سے سنتے جائیں کہ ”یہ تو ہے ہی ست اور کاہل۔“

پھر وقت کچھ اور آگے بڑھا، اب بچوں کی خوشیاں زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ اپنے ان ہی پیارے پیارے رشتوں کے لیے اہتمام کرنا بہت اچھا لگتا ہے ان کے لیے کیا ہوا اہتمام ہی اپنے لیے محسوس ہوتا ہے۔

اللہ سب رشتوں کو سلامت رکھے آمین۔

☆☆

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

سلمیٰ مسرت نے راولپنڈی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

پچھلی عید کا سروے، خط نئے سال کا سروے، خط سب آپ نے اس طرح غائب کر دیے جیسے آپ کا ہمارا کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ اور پھر دونوں سال نو کے شمارے میں ایک لفظ بھی نہ تھا نہ ہی کسی قاری نے ہمیں یاد کیا میری بہن نجمہ نے بھی کہا باجی اس بار اتنے شان دار سوال تھے، آپ نے کیوں شرکت نہیں کی۔ اپنے بیٹے ارسلان پر بھی ناراض ہوئی، اس نے کہا امی جان میں نے اتنی ہی ذمہ داری سے خط پوسٹ کیے تھے پتا نہیں کیا ہوا ہے۔

بہرحال یہ آخری کوشش ہے اگر اب بھی اگنور کیا تو مکمل خاموشی اختیار کر لیں گے۔

جیسے ساجدہ حبیب کے بارے میں آپ نے لکھا بہت دکھ ہوا ان کی شاندار تحریریں ان کے لیے صدقہ جاریہ ہیں اللہ جنت الفردوس عطا کرے۔ (آمین)

ج۔ پیاری سلمیٰ! آپ کا دل دکھا، اس کے لیے معذرت۔ آپ یقین کریں کہ ہمیں بے حد افسوس ہو اہے۔ ہماری قارئین کے خط شامل نہیں ہو پاتے تو انہیں یقیناً دکھ ہوتا ہوگا لیکن اتنا نہیں جتنا ان کے شامل نہ ہونے سے ہمیں دکھ ہوتا ہے ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔ ڈاک خرچ کتنا بڑھ گیا ہے۔ مصروفیات میں وقت نکال کر خط لکھنا کتنا مشکل ہوتا ہے اور پھر خط پوسٹ کرانا وہ اپنی جگہ ایک مرحلہ ہوتا ہے آپ کا خط موصول نہیں ہوا ورنہ ضرور شامل کرتے۔ بہرحال اب ناراضی دور کر لیں۔ آپ کا خط اور سروے پہلے نمبر پہ شامل ہے۔

ریحانہ وقاص نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اس ماہ کچھ زیادہ ہی مصروفیت رہی، بچوں کے پیپر اور امی عمرے کے لیے گئیں اور واپس آئیں بائیس دن کا تھا۔ لاہور سے ان کی فلائٹ تھی۔ جو میرے لیے باعث خوشی تھی۔ امی واپسی پر تبرک کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے دوپٹے لائیں (میری جٹھانیوں کے لیے) جن میں سے ایک گم ہو گیا جو میں نے اپنا دان کر دیا (کیسے کیسے اپنے دل مارنے پڑتے ہیں جوان کو خبر بھی نہیں ہوئی)۔ عروج عباس، صدف ناصر، یسریٰ ملک، اور فہمیدہ جاوید کو ہمارا سروے پسند آیا۔ بہت بہت ذرہ نوازی ہے۔

ویسے صدف ناصر مالٹوں کے لیے آپ دھوپ کا انتظار کرتی ہیں، ہم تو بس مالٹے دیکھتے ہیں وقت نہیں (ہاہاہا......) اور بچوں کی کامیابی پر مبارک باد اور ہمارے بچوں کے لیے دعا کر دیجیے گا۔

پرنٹڈ سوٹ میں ماڈل موتیے کے پھول لگائے اسمارٹ سی ماڈل دیدہ زیب لگ رہی تھی۔ مائرہ یوسف کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔

''وانتون'' سموسے موسم کے پکوان میں ہمیں رول، سموسے جیسی ہی ڈش لگی، کھجور کی چٹنی کی ترکیب ہمارے دل کو بھائی۔ ''اریان'' ہمیں دہی کی لسی لگی۔

ج۔ پیاری ریحانہ! آپ نے جو واقعہ لکھا، اس پر افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہم اسے شائع نہیں کر رہے، آپ افسانہ میں شامل کر لیں۔ جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس طرح سارے مرد بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ آپ اپنے شوہر پر شک نہ کریں جو لڑکی اتنی بے باکی سے کسی مرد کو مخاطب کر سکتی ہے اس کی ہمت کا اندازہ

pklibrary.com

کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال آپ نے اچھی طرح کلاس لے لی۔ کافی ہے، اب ہمت نہیں کرے گی۔ روزے کی نیت نہ کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہم پر روزہ فرض ہے اور بلا عذر روزہ چھوڑنا گناہ کبیرہ ہے۔

زویا شاہد نے کراچی سے لکھا ہے

میں، زویا شاہد، کراچی کی رہنے والی ایک نووارد لکھاری ہوں۔ کہانیاں سننے اور پڑھنے کا شوق مجھے شروع سے ہی رہا تھا۔ میرے اسی شوق نے کہانیاں لکھنے کی جانب میرا ذوق پیدا کیا۔

میں انگریزی زبان کی طالب علم ہوں۔ ایک عرصہ انگریزی ادب کے ساتھ منسلک رہنے کے بعد میں نے اردو ادب سے جڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور تب سے اردو ادب میں یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنا شروع کیں۔ ادب سے جڑے رہنے کا ایک خاص مقصد شروع سے ہی یہ تھا کہ میں ''عام لوگوں'' تک اپنی آواز پہنچانا چاہتی ہوں اور اس معاشرے میں بڑھتی برائیوں کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی ہوں۔

ج۔ پیاری زویہ! آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ اچھا لکھ سکتی ہیں لیکن جو کہانی آپ نے بھیجی ہے۔ اس میں کہانی تو ہے ہی نہیں، صرف تقریر اور تبلیغ ہے۔ آپ کہانی پر توجہ دیں اور کہانی کے ذریعے اپنا پیغام پہنچائیں۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رضوانہ وقاص کرلاں ہری پور سے لکھا ہے

شعاع ملا 5 تاریخ کو منگل والے دن اور ماڈل ساری کی ساری پیلے رنگ میں۔ ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' ساری کی ساری پیاری ہوتی ہیں۔ صلوٰۃ الضحیٰ پڑھنے کا دل تو کرتا ہے۔ لیکن میں خود پڑھ نہیں سکتی کوشش تو کرتی ہوں۔ یاد ہے دوبار پڑھی ہے۔ لیکن اب پھر دل کرتا ہے پڑھنے کو۔ اور اعتکاف بھی بیٹھنے کا بہت دل کرتا ہے۔ لیکن اب اعتکاف بھی نہیں بیٹھ سکتی کیونکہ میں زمین پر بیٹھ ہی نہیں سکتی۔ اور اٹھاتی بھی مجھے امی ہیں۔ بہت سے ارمان ہیں جس میں اعتکاف بھی ہے۔ ٹھیک تھی جب بیٹھ لیتی۔ اللہ پاک سے دعا ہے ٹھیک کردے پھر بیٹھوں گی۔ اب تو رو رو کر تھک گئی ہوں۔ اللہ پاک مجھ پر رحم کردے۔ (آمین) ''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' ف۔م اچھا لگا آپ پڑھ کر ماشاء اللہ آپ کی سات بچیاں اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔ (آمین) میں بھی دعا کرتی تھی۔ اللہ مجھے بیٹی دیتا۔ چلیں جو اللہ پاک کی مرضی۔ بچوں کے پیپر ہو رہے ہیں۔ ان کو تیاری کروانی ہے۔ دو ماہ سے۔ کیونکہ میرے ابو بیمار ہو گئے تھے۔ دو سو پر بی پی چلا گیا تھا۔ بہت پریشانی ہوئی فوراً سی ایم ایچ ایبٹ آباد پہنچایا۔ شکر ہے اللہ پاک کا، میرے ابو پر اللہ پاک نے بہت کرم کیا ہے۔ اب شکر ہے بہت بہتر ہے۔

ج۔ پیاری رضوانہ! آپ کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ پوری ہمت سے بیماری کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ آپ کی صحت کے لیے دل سے دعا گو ہیں۔

اکثر قاری بہنیں خطوط میں آپ کی بیماری کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو انہیں آپ کا نمبر دے دیں۔

ایک بار کسی بہن نے خط میں کسی معالج کا بھی ذکر کیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کی بیماری کے بتانا چاہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے والد کو صحت کاملہ سے نوازے۔ اور آپ کے سر پر ان کا سایہ سلامت رکھے۔ آمین۔ قارئین سے بھی دعائی درخواست ہے۔

صدف ناصر جڑانوالہ سے شریک محفل ہیں

ماہ مارچ کا شعاع خاصا کھلا کھلا سا ملا۔ طبیعت پر اچھا اثر پڑا، ماڈل کا سوٹ دیکھ کر ''پہلی شعاع'' نے رمضان المبارک سے محبت اور عقیدت مزید بڑھادی۔ جزاک اللہ ''حمد و نعت'' سے فیضیاب ہوئے ''پیارے نبی کی باتیں'' پڑھ کر ایمان کو از سر نو تازہ کیا۔ کتنی بڑی نیکی کی آپ نے ''صلوٰۃ الضحیٰ'' سے لے کر ''فطرانہ'' کی ادائیگی تک سب بتادیا، مطلب'' دریا کو کوزے میں بند کیا۔'' ''ناتا جوڑا'' ف۔م بہن کی خوش نصیبی پر رشک آیا۔ ان کی خواہش پر۔ واقعی اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔

''دستک'' اور ''ملاقات'' کے مہمان دیکھ کر ''عروج یوسف'' کی طرح ہمیں بھی ''ہارٹ بریک والا ایموجی'' یاد آ گیا۔ یمنیٰ اور سائرہ دونوں ہی ناپسند ہیں۔

''خط آپ کے'' پیاری مصنفہ ''''نگہت سیما'' سے ملاقات نے خوشی دی مگر ساتھ ہی ساتھ ''ساجدہ حبیب'' کی وفات سے دلی دکھ ہوا۔ بلاشبہ بہترین مصنفہ تھیں۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت الفردوس عطا فرمائے۔ (آمین) مگر شاکنگ نیوز ''ناہید اسماعیل'' کے ناولٹ کا شائع ہونا ہے تو وہ کب، کہاں شائع ہوا، ہماری نظروں سے کیوں کر پوشیدہ رہا۔ یسریٰ ملک آپ کی دعاؤں کا شکریہ، آپ بھی سدا سلامت رہیں۔ فہمیدہ جاوید، عیسہ عائش، پروین وحید سمیت ہر تبصرہ ہی لاجواب رہا۔

تحریروں سے دو دو ہاتھ کیے تو ''شہر شام ہجر'' نے کمال کا اختتام کیا۔ ''فرح بخاری'' نے ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ اور خاصا بروقت بھی۔ یہ نہیں کہ سالوں تحریر کو لٹکائے رکھا۔ البتہ ''ارحم'' کے ساتھ تھوڑا برا نہیں ہوا جتنا اس نے وسیلے کے ساتھ کیا۔ ''ماہ الملوک'' ہمیشہ کی طرح خوب صورتی اور سبک روی سے اپنی منزل کی جانب رواں دواں تحریر۔ نگہت کبھی بھی قاری کو بور نہیں ہونے دیتیں۔ اور ''ہوائی'' الفاظ اور جملوں سے بچائے رکھتی ہیں۔ (ہوائی مطلب جو سر سے گزر جائیں)

''دستورِ وفا'' تھوڑا تھوڑا پرانا ٹچ لیے (مظلوم ہیروئن، ظالم آنٹی) نئی تحریر۔ لگتا ہے یہ تحریر ''شہر شام ہجر'' کی جگہ آئی ہے۔ مگر پلیز فارمیٹ نیا ہو۔

''فلک تنویر'' نے ایک اور شاندار ناول پیش کر دیا ''پھول زلفوں میں'' یہ نام دیکھ کر حیران پریشان ہوئے کہ ہمارے ڈائجسٹ والے اس طرح کے عنوان تو نہیں رکھتے تحریروں کے مگر اینڈ پڑھ کر خوب ہنسی آئی کہ یہ تو پختون گانے کے الفاظ ہیں۔ (ہاہاہا) بہرحال بے حد جاندار تحریر۔

''ناولٹ'' چھوٹی بہو بے حد دل چسپ رہا۔

''افسانے'' کی بات ہو جائے تو ''وقتی فائدہ'' اول رہا۔

''چند لقموں کی خاطر'' دوئم نمبر پر رہا۔

''معتبر'' تیسرے نمبر پر رہا۔ ایک راز کی بات یہ بھی ہے کہ مجھے ''ہاجرہ ریحان'' کی تحریریں پتا نہیں کیوں دو دفعہ پڑھ کر سمجھ میں آتی ہیں۔ (ہاہاہا)

ج۔ پیاری صدف! تفصیلی تبصرہ کے لیے ممنون ہیں۔ بہت اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ ایڈیٹ کرتے ہوئے افسوس ہوتا ہے۔ کاش صفحات کی مجبوری ختم ہو جائے۔ آپ کے تبصرے سے نہ صرف ہم پرچے کے بارے میں رائے سے آگاہ ہوتے ہیں بلکہ آپ کی تعریف و تنقید سے ہماری رہنمائی بھی ہوتی ہے۔

یسریٰ مالک نے کندیاں میانوالی سے لکھا ہے

سب سے پہلے خط آپ کے کھولا اپنا خط دیکھ کر مجھے جو خوشی ہوئی وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کس کو بتاؤں کہ میرا خط بھی شعاع میں شائع ہو گیا ہے کیونکہ میرے سسرال میں دور دور تک کسی کا کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ میری دونوں جیٹھانیاں میرے ڈائجسٹ پڑھنے پر بہت طنز کرتی ہیں کہ تین بچوں کی ماں بن گئی ہو مگر ابھی تک ان عشق محبت کی کتابوں کا پیچھا نہیں چھوڑا تم نے، اگر ان کو بھنک بھی پڑ جاتی کہ میں نے کسی رسالے میں خط لکھا ہے تو نجانے اس خط کا کیا مطلب لیا جاتا۔ کیونکہ ان کے نزدیک خط صرف پیار محبت کے قصے سنانے کے لیے لکھا جاتا ہے۔

خیر اور کوئی نہ ملا تو میاں جی کو یہ خوش خبری سنائی کہ دیکھیں میرا خط شائع ہوا ہے۔ انہوں نے فقط اتنا کہا کہ اچھا تمہارا خط چھپ گیا مبارک ہو اور پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

بہن کو بتایا تو وہ بہت خوش ہوئی مبارک بھی دی اور کہا کہ باجی اب لکھتی رہنا پڑھتی ہو تو لکھا بھی کرو۔ تم نے تو پڑھ لکھ کے سنوایا ہے۔ میں نے ایم اے اسلامیات کیا ہے۔ لیکن جاب میاں جی نے نہیں کرنے دی۔ اس لیے گھر کی ہو کر رہ گئی ہوں۔ کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہوں کیونکہ میرے میاں کو نہیں پسند بقول ان کے تمہارا جانا ضروری ہے، میری بھابیاں ہو آتی ہیں کافی ہے۔

بس ان کی یہ بات مجھے بہت پسند ہے کہ انہوں نے کبھی بھی مجھے رسالے پڑھنے سے منع نہیں کیا اور میرے کہے بغیر ہر ماہ وہ رسالے لے بھی آتے ہیں۔ میں نے ابھی پورا رسالہ نہیں پڑھا، صرف ''شہر شام ہجر'' پڑھا بہت خوب صورت اختتام۔

ج: پیاری یسریٰ! خط شائع ہونے کی اس قدر خوشی ہوئی ہے تو اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ سروے بھی شامل ہو جائے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

انیسہ عائش کوٹ رادھا کشن ضلع سے قصور سے رونق افروز ہیں، لکھا ہے

اس بار شعاع میں اپنا خط ہم نے اپنی چھوٹی بہن کو پڑھوایا تو وہ بولی۔ آپ کی رسالے میں کوئی خاص عزت نہیں۔ "ہائیں" ہم تو دھک سے رہ گئے۔ یہ دیکھیں نا! باقیوں کے ساتھ لکھا ہے، فلاں نے شرکت کی ہے، فلاں شریک محفل ہیں۔ رونق بخشی ہے وغیرہ وغیرہ اور آپ کے نام کے ساتھ یوں سیدھا سیدھا کہ انیسہ عائش نے قصور سے لکھا ہے۔

ہم نے رسالہ اس کے ہاتھ سے چھینا ساتھ ہی سارے خطوط پر نظر دوڑائی۔ ویسے ایسی کوئی بات نہیں باقی قاری بہنوں کے ساتھ بھی ایسے ہی لکھا ہے یہ تو رسالے والوں کا انداز ہے۔ ویسے یہ الفاظ رونق بخشی، شریک محفل ہیں میٹھا سا احساس دلاتے ہیں۔ اب آتے ہیں رسالے کے تبصرے کی طرف۔ بالآخر "شام شہر ہجر" کا اختتام ہو گیا۔ منصب اور وسیلہ کا آخری (نجلہ عروسی) والا سین اچھا لگا مگر یہ کیا عیسیٰ اور تانیہ کی کہانی کا ڈراپ سین پھیکا ہی رہ گیا۔ پھر پہنچے "ماء الملوک" اجبی کی زیب النساء کی زندگی میں انٹری اچھی لگی بقیہ قسط غیر دلچسپ رہی۔

"دستور وفا" از مریم عزیز متجسس سے ناول کی روانی میں بہتے چلے جا رہے تھے کہ بقیہ آئندہ ماہ کا اسٹاپ آ گیا۔ ویسے اس صورت حال کے پیش نظر ہمیں غفران اتنا بھی برا نہیں لگ رہا اس کے برعکس حذیفہ کے بزرگوار کے ساتھ سلوک پر غصہ آیا۔ "پھول زلفوں میں" شمارے کا نمبر ون ناول۔ پلوشہ کے بابا کی سوچ گویا ہمارے دل کی آواز تھی۔ مجتبیٰ کا کردار اور محبت بھرا خوشگوار اختتام مزہ دے گیا۔ "چوتھی بہو" سبق نہیں بلکہ اسباق پڑھا گیا۔ ہمیں اداکاروں سے انٹرویو اور "تاریخ کے جھروکوں" والا سلسلہ اچھا نہیں لگتا۔ امتحانات سے فارغ ہو کر ہمیں بھی نہ جانے کیا شوق چڑھا کہ فیس بک، یوٹیوب انسٹا پہ ناولز ڈھونڈ نکالے اور چند ایک کے علاوہ ہمارا ابھی یہی ماننا ہے کہ جیسے عارفہ فضل شاہ صاحبہ نے لکھا فیس بکی رائٹرز کی فحاشی کو چھوتی اوور رومانٹک تحریروں کا مقابلہ ان رسائل سے نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ان ڈائجسٹوں کے سرورق پر "صاف ستھرا تفریحی ادب" کندہ کرایا جانا چاہیے۔ اور ایک شکریہ ہماری پیاری اقراء کا جس نے ہمیں موبائلی دنیا میں گم ہونے سے بچا کر ڈائجسٹ کی طرف متوجہ کیے رکھا۔

ج: پیاری انیسہ! آپ کی سسٹر نے بالکل غلط اندازہ لگایا۔ آپ کی اہمیت، عزت اور محبت ہمارے دل میں خاص نہیں بلکہ خاص الخاص ہے۔ آپ ہماری مصنفہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری قاری اور تبصرہ نگار بھی ہیں۔ ہر ماہ خط لکھ کر اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کرتی ہیں۔

اداکاروں کے انٹرویو تو اب شاہین کم ہی لیتی ہیں زیادہ تر مصنفین کے انٹرویو شائع ہوتے ہیں۔ تاریخ کے جھروکوں سے کا سلسلہ معلوماتی ہی نہیں عبرت انگیز بھی ہے، کتنی قومیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو گئیں۔ وہ کون سے اعمال تھے جو ان کی تباہی و بربادی کا سبب بنے۔ یہ سب ہمیں تاریخ پڑھ کر پتا چلتا ہے۔

مصباح نذیر نے غریب وال سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

کہاں سے شروع کریں ہم۔ تب سے جب بڑے بھائی نے رسالوں کا ڈھیر جلا دیا تھا (شاید میٹرک میں) اور ساتھ ہمارا دل بھی۔ مگر سلام ہے ہماری لگن کو کہ تب سے اب تک، عملی زندگی میں آنے کے کئی سال بعد، دو بچوں کی اماں جان بننے کے بعد بھی آج کوئی کہتا ہے کہ ابھی تک رسالے پڑھتی ہو تو فخر سے مسکرا دیتے ہیں۔ اب پہلا خط ہے جو آپ کو لکھ رہی ہوں وہ بھی کتنی رکاوٹوں کو عبور کرنے کے بعد۔

دراصل جاب، گھر، بچے سب جھمیلوں نے جکڑ رکھا ہے۔ آج مارچ کی پہلی خوشگوار شام (اتفاق سے) موقع ملنے پر سوچا کہ برآمدے میں بیٹھ کر خاموشی سے بارش دیکھتے ہوئے پرانا زمانہ یاد کیا جائے تو اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ سب لوگوں کو بھی اپنی کہانی سنائی جائے جن کی

pklibrary.com

ہمیشہ سے پڑھتے آئے ہیں۔ (آہ مگر! ایک منٹ) ایک تو لکھنا بڑا مشکل پھر لائن چھوڑ کر، صفحہ چھوڑ کر۔ پہلے تو ورق ہی نہیں ملا پھر شکر ہے پنسے کے پلندے میں سے مل ہی گیا۔ کہانیوں پر تبصرہ پھر بھی کریں گے ابھی پچیس سال (چلیں بیس کرلیں) میں پہلا خط لکھنے کی خوشی ہی نہیں سنبھالی جارہی۔ گوشی کی طرح دل کر رہا ہے کہ لکھتی ہی جاؤں (ہاہاہا)۔

ج: پیاری مصباح! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ بیس پچیس سال سے شعاع پڑھ رہی ہیں۔ آپ نے خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں کی۔ اتنی دیرینہ رفاقت اور ایک بھی خط نہیں۔ چلیں خیر دیر سے سہی مگر آپ آئیں تو۔

ام ہادیہ نے لاہور سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

ناکامل ہمیشہ کی طرح شان دار خوب صورت ماڈل بہت اچھی لگ رہی ہے اور میری پڑھنے کی اسپیڈ دیکھیں صبح کو لے کر آئی، رات تک سارا پڑھ بھی لیا اور اب رات کے دس بجے بچوں کو سلا کر آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ جی تو جناب سائرہ یوسف سے ملاقات پسند آئی اور یمنیٰ زیدی تو میری بہت فیورٹ ہیں۔ والعصر کی یہ قسط اچھی تھی کہ اب کچھ سمجھ میں آرہی ہے ماہ الملوک بہت اچھا جارہا ہے اور میرا خیال ہے کہ استانی جی کے گھر جو مہمان پھرا ہے وہ یقیناً امان ہے اختر بانو کا بیٹا۔ سحرش کا کردار پسند آیا اور تنکو بابا زہرا کا گمشدہ بھائی مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے پھول زلفوں میں بہت پسند آیا۔ مجھے سخت نفرت ہوتی ہے ایسے مردوں سے جو اپنی بیوی پہ ہاتھ اٹھاتے ہیں چوتھی بہو بھی بہت اچھا تھا پر آج کل اچھی دیورانیاں جٹھانیاں کم ہی ملتی ہیں۔ مال غنیمت زبردست تھا۔ معتبر بھی سبق آموز تھا چند لقموں کی خاطر پڑھ کر مزہ آیا میں جو بچوں کی وجہ سے تھوڑی لاپرواہ ہوگئی تھی کہ بچے کھانا کھانے میں بہت تنگ کرتے ہیں سبزی ان کو بالکل پسند نہیں پر میں اب بہت توجہ دیتی ہوں کہ کسی بھی طرح رزق ضائع نہ ہو۔ میرے لیے یہ ایک جھٹکا ثابت ہوئی اب ہمیں دیں اجازت حنا صاحبہ آئی ہوئی ہیں ان کے دکھ سکھ بھی سن لوں ہاہا۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔

ج: پیاری تنسیم! آپ کا پچھلا خط پرچا پریس جانے کے بعد موصول ہوا۔ اس لیے شامل نہ ہوسکا۔ خط شامل نہ ہونے کا ہمیں بھی بے حد افسوس تھا۔ سوچا آئندہ ماہ شامل کرلیں گے لیکن چونکہ نیا خط آگیا ہے۔ اس لیے اسے شامل کررہے ہیں۔

آپ کے خط سے پتا چلا کہ آپ نے 6 فروری کو خط پوسٹ کردیا تھا۔ ڈاک کے نظام کو کیا کہیں۔ جدھر دیکھیں یہی حال ہے۔ پچھلے چند سالوں میں لگتا ہے کہ پاکستان میں انقلاب آگیا ہے۔ گیس اور بجلی کی نایابی، روزمرہ اشیاء کی گرانی، اداروں کی نااہلی اور کرپشن جدھر دیکھیں عجیب ہی افراتفری کا عالم ہے۔ دعا ہی کرسکتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے اختیار میں کیا ہے۔

نرگس مسکان گولارچی بدین سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

سب سے پہلے اپنے موسٹ فیورٹ ناول ''شام ہجر'' پہ دوڑ لگائی پہلے تو فرح آپی کو بہت مبارک باد، اتنا پیارے سے ناول کا اختتام بھی پیارا سا کرنے کے لیے۔ ''ماہ الملوک'' کی رفتار تو بہت زبردست ہے۔ شکر

ہے سلو نہیں ورنہ بوریت ہوتی ہے۔

''دستورِ وفا'' مریم عزیز نے کافی اچھا لکھا۔ انابیہ کا کیا رشتہ ہے سعید صاحب سے اور وہ کیوں ادھر ہے۔ یہ تو مریم آپی ہی آگے بتائیں گی۔ ویسے مجھے تو انابیہ بہت معصوم، مظلوم لگی۔

پھول زلفوں میں فلک تنویر بہت اچھا لگا یہ جان کر کہ کوئی کسی کی اولاد کو اتنا چاہے۔ (ہر کسی کا ظرف نہیں) پلوشہ (سوات کی پری) اور مجتبیٰ کی جوڑی اچھی لگی۔ اور دادی کا گھر پر ہولڈ بھی زبردست (تالیاں جی)

''چوتھی بہو'' راشدہ رفعت کا کافی اچھا تھا۔ نگین اور ماہ نور کی دوستی اچھی لگی اور ماہ نور کے مشورے بھی (ہاہا) افسانے سارے ہی اچھے لگے۔ لیکن چند لفظوں کی خاطر نمبرون (بازی لے گیا) رہا۔ انٹرویو میں یمنیٰ زیدی اور سائرہ یوسف سے ملاقات اچھی رہی۔ ''جب تجھ سے ناتا'' بھی اچھا سلسلہ ہے۔ کبھی اچھا تو کبھی بہت دکھی۔ (بہنوں کی بھڑاس نکلنے کے لیے)

خط آپ کے میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔ سب بہنوں، آپیوں کے خط بہت اچھے ہوتے ہیں۔ (سوائے میرے مجھے ایسا لگتا ہے) خاص طور پر صدف ناصر اور گوشی آپی (ویسے گوشی آپی آپ کا نام کیا ہے۔ میں نے تو اپنی عقل کے سارے گھوڑے دوڑائے پر مجھے کوئی نام ایسا نہیں ملا جس کا نک نیم گوشی ہو۔ ساجدہ حبیب صاحبہ کے لیے بہت سی دعائیں اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

آپی آپ سے ایک سوال ہے۔ کیا ہم کوئی بک منگوائیں تو پیسے بعد میں دے سکتے ہیں؟ جیسے پوسٹ مین کو جب کو ڈیلیور کرنے آئے؟

ج: پیاری نرگس کتابیں منگوانے کے لیے آپ پرویز صاحب کو فون کرلیں۔ وہ ساری تفصیل آپ کو بتا دیں گے۔

پچھلا خط تاخیر سے ملا، اس لیے شامل نہ ہوسکا۔ اس بار شامل کرنے کا ارادہ تھا لیکن آپ کا تازہ خط موصول ہو گیا۔ ہم اُسے شامل کررہے ہیں۔

عذرا آصف نے لاہور سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت ہی پیارا لگا۔ ''پہلی شعاع'' میں بہت بڑے فلسفوں کو چند لفظوں میں سمیٹ دیا۔ حمد و نعت زندگی کا مدار ہماری (مسلمانوں کی) زندگی ان ہی دو ہستیوں کی بلندی کے گرد گھومتی ہے۔ ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' ایسی آگہی جو ہر بار دوبارہ سے ذہن و روح کو تازگی اور سکون نصیب کرتی ہے۔ اپنا خط اور اس میں اپنی پوری فیملی کے نام دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ میرے بچے اپنے نام سن کر بہت خوش ہوئے unaisa ہے میری بیٹی کا نام ہماری قاری اور لکھاری بہنیں Aneesa یہ مجھے ضرور بتانا ہے۔

والحصر یار اس کہانی کا سسپنس اب ختم کریں۔ بہت ہوگیا ''شامِ شہرِ ہجر'' سیدھا سبھاؤ لیے رشتوں کے تمام رنگ لیے۔ زندگی کا ہر ذائقہ لیے۔ بہترین ناول بہت بہتر ہی کہانی کو ''ماہ الملوک'' سیما جی بہت ہی خوب صورت ناول کی فیملی کے ساتھ بھی وہی ہوا ہے۔ پلیز جبس کے موسم اتنا بہترین ناول کئی بار رلا گیا۔ فلسطین کا دکھ ایک بار پھر بے قرار کر گیا۔ اس بار رسالہ دس کو ملا۔ عبداللہ میرا بیٹا ایک ماہ سے تقریباً بیمار تھا ذہنی طور پر میں بہت ڈسٹرب تھی۔ پھر شادیاں اس ناول یعنی نعیمہ ناز صاحبہ کے اس ناول سے خط لکھنے پر مجبور کردیا۔

افسانے سارے ہی سبق آموز تھے۔ نازیہ رزاق کو لائیں یار اور بہت سی مصنفین جو غائب ہیں انہیں بھی۔

ج: عذرا! آپ کی تحریریں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ پرچے آنے کے بعد پڑھیں گے ان شاء اللہ۔ خط لیٹ ملا۔ اس لیے آپ کا خط اس ماہ شامل ہے کرپٹ لوگ کون ہیں۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ ہماری قوم اتنی تقسیم ہوچکی ہے کہ وہ کسی عدالت، کسی ثبوت، کسی دلیل کو ماننے کو تیار نہیں ہر شخص یہ ہی سوچتا ہے جو ہمارا موقف ہے بس وہی صحیح ہے۔ دن بہ دن ہم روبہ زوال ہیں۔ خود موازنہ کرلیں چند سال پہلے قیمتیں کیا تھیں اور اب کیا ہیں

فرخندہ تسلیم نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

بقیہ صفحہ نمبر 205

امت العزیز شہزاد

والعصر

ورئی اپنی نانی اور ماموؤں کے ساتھ رہتی ہے، اس کی ماں مر چکی ہے۔ گھر میں دو ماموں، ممانی اور ان کے بچے ہیں۔ ان میں آپس میں اچھے تعلقات ہیں مگر بڑی ممانی اسے پسند نہیں کرتی ہیں۔ عباد ان کا بیٹا ہے۔ جو ورئی کو چاہتا ہے۔

آتش جو سراپا اسرار ہے، وہ لوگوں کو اپنی گفتگو سے زیر کرتا ہے۔ اس کے بے شمار عقیدت مند ہیں۔

بی ذی ایک بے ہوش لڑکی کو لے کر آتش کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ آتش اپنے اسسٹنٹ خاقان کے ذریعے ڈاکٹر کو بلاتا ہے۔ نانی ورئی کو پڑھانے کی ذمہ داری عباد پر ڈال دیتی ہیں۔

لڑکی ہوش میں آتی ہے لیکن حواسوں میں نہیں۔ اپنا نام تک نہیں بتا سکتی۔ آتش کے گھر پولیس آجاتی ہے۔ پولیس کا نام سن کر بی ذی گھبرا جاتی ہے۔ آتش اسے پرسکون رہنے کا کہتا ہے۔ پولیس انسپکٹر امیر علی اپنے جونیئر فاروق احمد کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ آتش کو تربیتی ورکشاپ میں مدعو کرتا ہے۔ فاروق احمد تھوڑا تلخ ہے۔

عباد، ورئی کو پڑھاتے ہیں شریفہ کو یہ پسند نہیں عباد کے دوست سر عیسیٰ ورئی کو پڑھانے آتے ہیں، ورئی بتاتی ہے کہ وہ کمبائن امتحان دے رہی ہے، اور اسے ہر سبجیکٹ انتہائی مشکل لگتا ہے۔

فیروزہ کی بیٹی شونا کی شادی ہوتی ہے، اس میں بالی کا بھی نکاح کر دیا جاتا ہے، بالی انتہائی کم عمر ہے۔ شاکر فیروزہ کا بڑا بیٹا اپنے باپ کے حکم پر گھر تعمیر کروا رہے ہیں۔ ان کے والد بنگلہ دیش میں کاروبار کے سلسلے میں رہتے ہیں۔

فیروزہ کا چھوٹا بیٹا عامر بہت خودسر ہے۔ وہ عیسیٰ سے بہت چڑتا ہے۔ وہ ماں سے پیسے مانگتا ہے۔ انکار پر عیسیٰ کو بالکونی سے الٹا لٹکا دیتا ہے۔

ورئی کو سہراب سے ملنے کی خوشی اور گھبراہٹ ہوتی ہے عیسیٰ سمجھتا ہے کہ وہ امتحانات کی وجہ سے پریشان ہے۔

بی ذی کو آتش فون کر کے اطلاع دیتا ہے کہ وہ ٹی وی آن کر کے دیکھے علائنہ سے متعلق خبر آرہی ہے۔ پتا چلتا ہے کہ علائنہ کی لاش اس کے فلیٹ سے برآمد ہوئی ہے۔

ورئی پیپر دینے خوب تیار ہو کر جاتی ہے۔ اسے مفتاح چھوڑنے جاتا ہے، واشلہ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

رینا عامر سے کہتی ہے کہ عیسیٰ سے کہو کہ ایڈمیشن ٹیسٹ میں اس کے بھائی کو پاس کروادے۔

سید صاحب کو جب سے عامر نے عیسیٰ کے متعلق بتایا تھا کہ وہ سگریٹ نوشی کرنے لگا ہے سید صاحب بہت پریشان تھے۔ وہ فیروزہ بیگم کو واپس پاکستان بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔

وریٰ جلدی سے پیپر ختم کر کے سہراب کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہے۔

آتش چند روز کے لیے اسلام آباد جاتا ہے۔ خاقان دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہے خولہ کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ فون کر لے وہ فون کرتی دوسری طرف فون اٹھا لیا جاتا ہے۔ وہ جواب نہیں دے پاتی۔ دوبارہ نمبر ملاتی ہے اس وقت کوئی اسے آواز دیتا ہے۔

شریفہ سہراب کی دعوت کرتی ہیں اور بظاہر اسے گھیر لیتی ہیں، وہ دل ہی دل میں ان کے بے وقوف بن جانے پر ہنستا ہے۔ فاروق احمد، امیر علی خان سے کہتا ہے کہ علائنہ خان کے قتل کے تانے بانے آتش کدہ سے ملتے ہیں۔

عامر، عیسیٰ سے پوچھتا ہے کہ اس نے اس کا کام کر دیا عیسیٰ کے منع کرنے پر وہ اسے ڈانٹتا ہے۔ فیروزہ عامر کو سخت سست کہتی ہیں اور عیسیٰ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ عیسیٰ واپس آتا ہے تو وہاں سے اس کا جرنل غائب ہوتا ہے۔

بی ذی اپنا پروموشنل ٹرپ کر کے واپس آتی ہے تو اس کے دوست پارٹی رکھتے ہیں پارٹی میں اس کو ایک فون آتا ہے۔ وہ علائنہ خان قتل کیس کے سلسلے میں بی ذی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بی ذی خوف زدہ ہو کر لائن کاٹ دیتی ہے۔

شاکر کی بیوی فرح عیسیٰ اور عامر کی بحث کو بڑھا چڑھا کر جھگڑے کی شکل میں شوہر تک پہنچا کر کہتی ہے کہ ہمیں اپنے بچوں کو اس ماحول سے بچا کر الگ ہونا ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی سے کینیڈا یا امریکا جانے کے سلسلے میں

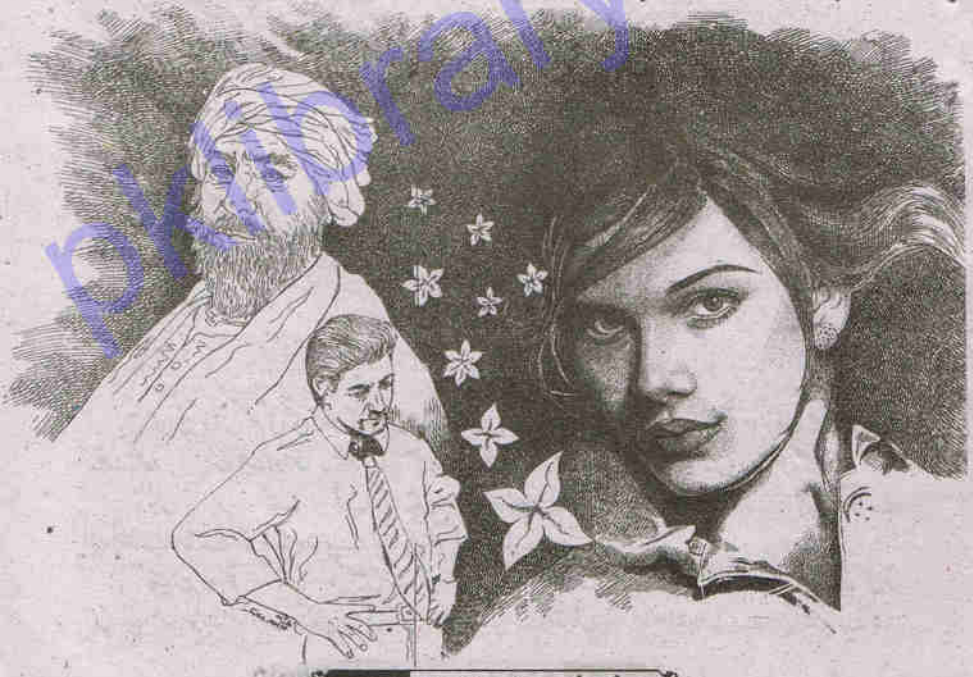

pklibrary.com

بات کا کہتی ہے۔
وری ریڈ سوٹ میں سہراب سے ملنے آئی تھی وہ اسے اپنے گھر لے جانے کی بات کرتا ہے۔ وری حامی بھر لیتی ہے۔ سہراب بہت خوش ہوتا ہے اسی وقت گاڑی کے سامنے عیسیٰ آ جاتا ہے۔ وری ڈر جاتی ہے۔
عامر بالی سے مل کر ماں اور عیسیٰ کی شکایت کرتا ہے۔ بالی اپنی کم عمری کی شادی اور غصیل شوہر کی وجہ سے پہلے ہی ناراض تھی۔ وری بھاگم بھاگ گھر پہنچتی ہے۔ گھر میں سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ خاقان سر آتش سے اجنبی لڑکی کے فون ااستعمال کرنے کی شکایت کرتا ہے۔
نمبر نہ نوٹ کرنے پر آتش اسے سخت سست سناتا ہے۔
سہراب وری کے بچ نکلنے پر غصہ ہوتا ہے۔ اسے فکر ہوتی ہے کہ عیسیٰ نے اپنے گھر والوں کو سب بتا نہ دیا ہو۔ وری رجا سے بات کرتی ہے۔

اٹھائیسویں قسط

ابن سلیمان !
اے شکوہ و شکایات کے
نت نئے مضمون باندھنے والے......!
فریادی کن فیکون!!
تو کہو......
اپنی قوت گفتار پہ نازاں تمہاری
زباں آج یوں خاموش کیوں ہے؟
کیوں نگاہ شاکی نہیں؟
اور جگر پرسوز کیوں ہے؟
بدن یہ لرزاں؟
نوک مژگاں پہ نمی؟
اور دل مدہوش کیوں ہے؟
کہو ابن سلیمان؟
کچھ تو کہو؟
کچھ تو؟
''لیں ......سر......''
زمین کی گردش تھم گئی تھی۔ اور آسماں دھواں دھواں تھا۔ بحر ساکت و جبل ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر گئے تھے۔ کچھ تو...... کچھ تو ایسا ہوا تھا کہ جو اس کی آنکھیں یک ٹک ''سامنے'' دیکھ کر بھی یقین نہیں کر پا رہی تھیں۔
''لیں...... سر...... آپ...... آپ...... میں...... مجھے پہچانے؟'' اشکوں کے اتھاہ سمندر سے ابھرنے والے ان چند بے ربط سے الفاظ میں نہ جانے کیا کیا کچھ پنہاں تھا۔
''پہچان...... تو...... میں...... تمہیں تب بھی نہیں سکا تھا۔'' اس نے بارہا سوچا تھا کہ اگر وہ کبھی سامنے آئی تو اس کے احساسات کیا ہوں گے پر یہ کبھی گمان نہ کیا تھا کہ اسے مقابل پا کر وہ ہر احساس سے ماورا ہو جائے گا۔

بالکل کسی بے روح جسم کی طرح..... سو وہ بے جان سے لہجے میں اٹک اٹک کر بولا تھا۔
''اور آج..... آج..... بھی بس دیکھ ہی رہا ہوں۔''
''سر پلیز.....'' وہ مضطربانہ دو قدم آگے بڑھ کر اس سے چند قدم فاصلے پر ایستادہ ہوتے ہوئے گداگروں کے سے لہجے میں بولی۔
''صرف ایسے دیکھیں مت..... کچھ بولیں..... کچھ تو کہیں؟''
''کیا کہوں؟'' یہ محض دو لفظ نہیں..... وہ اشک تھے جو دل ہی دل میں کہیں رہ کر یوں منجمد ہوئے کہ اسے پتھر بنا گئے تھے۔
''کچھ بھی کہہ لیں۔'' وہ بھنچی بھنچی سی آواز میں چلائی۔ ''برا بھلا کہیں..... بددعا ہی دے دیں۔''
''اور میرے یہ سب کرنے سے کیا ہو جائے گا؟'' اس نے بہت عجیب سے لہجے میں پوچھا تھا۔
اتنے عجیب لہجے میں کہ یک بیک پوری ہمت و بڑے حوصلے سے ''خولہ'' کا خول اتار پھینکنے والی ''بدرالوریٰ ظفر'' کو اپنی ساری قوت زائل ہوتی محسوس ہوئی۔ زبان خشک ہو کر تالو سے جا لگی اور حلق میں پھندے سے پڑنے لگے۔ اس سے اس معنی خیز سوال کا کوئی بھی جواب نہ بن پڑا تھا۔
تب ہی وہ چند ثانیے غبار آلود نگاہوں سے اس کے جواب کا منتظر رہنے کے بعد معاً ایک جھٹکے سے اٹھا اور فوراً سے پیش تر کتب خانہ عبور کر گیا۔ اور اسے روکنے کی خواہش میں وریٰ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ اور اب پورے کتب خانے میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

''کہہ رہی ہے کہ بچوں کے پڑھنے کی کوئی جگہ نہیں، اس لیے اس کمرے کو اسٹڈی روم بنا رہے ہیں۔''
اسے اس پر شور چائے کے ڈھابے سے اٹھ کر گھر جانے کی ذرا بھی جلدی نہ تھی۔ سو بڑے اطمینان سے خوشبودار چائے کے گھونٹ بھرتا رہا اور اس کا ذہن..... وہ کسی پروجیکٹر کی طرح کبھی کہیں تو کبھی کہیں روشنی کی ایک مہین سی چادر پھیلا کر اس پر یکے بعد دیگرے کئی مناظر اسے دکھانے کا اہتمام بڑی مستعدی سے کرتا چلا جا رہا تھا۔ اور فی الوقت یہ منظر اس کے سامنے بچھی لکڑی کی معمولی سی سال خوردہ میز کی سطح پر روشن تھا کہ جس میں شونا، بالی، نعمی اور شانی فیروزہ کے کمرے میں براجمان آپس میں محو گفتگو تھیں۔ جب کہ وہ خود..... وہ صوفی صاحب کے مشورے پر چالیس دن اللہ کی راہ میں لگا کر لوٹا تھا۔ ماں سے دائمی جدائی کا غم اپنی جگہ پر اب وہ کسی حد تک سنبھل چکا تھا۔ سو روز مرہ کے معاملات میں دل چسپی لینے لگا۔ اور ابھی وہ بہت دن بعد گھر میں اکٹھی ہونے والی بہنوں سے ملاقات کی غرض سے فیروزہ کے کمرے میں داخل ہوا تھا تب ہی اس نے شونا کو کہتے سنا۔
''ہے..... ہے'' بالی نے یہ سن کر لبوں پر چار انگلیاں رکھتے ہوئے جیسے حیرت آمیز ناگواری کا اظہار کیا۔
''اتنا کمرہ اور بھی تو ہے نے گھر میں..... اس کا پیچھا کیوں لے لی ہیں وہ؟''
''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ.....'' نعمی اپنی اب تک کی زندگی میں غالباً پہلی بار بالی سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے بولی۔
''کمرہ تو شاکر بھائی جان کا بھی ہے، اسے اسٹڈی روم بنا لیں۔''
''اسے تو اس نے گیسٹ روم بنا لیا ہے۔'' شونا نے ذرا ناپسندیدگی سے کہا۔ ''اس کے میکے والے آئے دن آ کر وہیں تو رکتے ہیں۔''
''اور چھوٹا کمرہ؟'' شانی نے پتا نہیں یاد دہانی کروائی تھی کہ ایک کمرہ وہ بھی تو ہے یا اللہ جانے سوال پوچھا

تھا۔ جس پر اس بار نغمی ترنت بولی۔
"وہ تو انہوں نے اپنے بیٹے کو دے دیا ہے۔"
"کیا ہوا؟" اس نے بہنوں کے چہرے سے مترشح ناگواری آمیز تفکر دیکھ کر استفسار کیا، وہ ان کے مابین جاری گفت گو سے ناواقف تھا۔
تب بالی نے اپنے مخصوص انداز سے رندھی ہوئی آواز میں اسے بتایا۔
"ریتا اس کمرے کو پڑھائی کا کمرہ بنانے والی ہے نے۔ اب تم ہی بتاؤ نے بابو...... ہم کا کریں؟"
"کیا کریں کا کیا مطلب؟" وہ تو یہ سنتے ہی بتھے سے اکھڑ گیا۔ "صاف صاف منع کریں انہیں اور کیا کریں گے۔"
"نہ بابا......" وہ بدکی...... "ہم کا ہے لینے لگے اس چونٹے (عامر) سے پنگا...... ابھی تو ہمیں ایہاں (یہاں) عزت سے بٹھار ہا ہے۔ کھلا رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ خفا ہو کر ہم پر گھر کا دروازہ ہی بیخ مارے (بند کر دے)"
"کیوں ہوگا ایسا؟" وہ بولا۔ "آخر یہ گھر آپ سب کا بھی تو ہے۔"
"گھر تو ہمارا وہی ہے جہاں اب ہم رہتے ہیں۔" شونا گمبھیرتا سے بولیں۔ "پھر کیا فائدہ یہاں کے معاملات میں مداخلت کرنے کا۔"
"مجھے تو ویسے بھی انہوں نے منع کر رکھا ہے کسی کے بیچ میں بولنے سے۔"
شانی حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی بول اٹھی۔
تب اس نے بہت متاسف نگاہوں سے اسے دیکھنے کے بعد نغمی کی جانب نگاہ کی۔
"دیکھو عیسیٰ!" وہ غالباً اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ چکی تھی تب ہی خاصی سنبھل کر مصلحت سے بولی۔ "ہاں ٹھیک ہے کہ ہم سب ہی ان کے اس ارادے پر دکھی ہیں، افسردہ ہیں مگر یہ بھی ہے کہ اعتراض کرنے کی صورت میں بدمزگی کا اندیشہ ہے سو میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گی کہ جانے دو۔"
"امی تو چاہی چکیں۔"
وہ ان مصلحت پسندوں کی مصالحت دیکھ کر حیران زیادہ ہوا تھا یا مغموم...... وہ خود نہیں جانتا...... مگر ایک بات سے واقف تھا کہ وہ یہ سب ہوتا دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتا...... سو بڑے واشگاف الفاظ میں بولا تھا۔
"اب ان کا کمرہ بھی یوں ہی جانے دوں...... نہیں...... یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔"
☆☆☆
"آپ کیسے ہیں عباد بھائی؟"
وہ رات گئے گوشہ عافیت میں جمنے والی خوش گوار محافل تو اب بس خواب و خیال بن کر رہ گئی تھیں، ایک ایسا خواب جو وہاں کے مکین جاگتی آنکھوں سے اب بھی دیکھا کرتے تھے اور خیال جو ان کے اذہان سے بھی محو ہوتا ہی نہ تھا...... اور ابھی ایسے ہی کسی خیال کے زیر اثر اب ہمہ وقت سنجیدہ رہنے والا مفتاح لڈو کی بساط بچھا کر بیٹھ تو گیا تھا مگر کسی اور کو پکارنے کی خواہش اس کے دل میں یوں نہ جاگی کہ سامنے بچھے اس مربع نما گتے میں اسے ماسوائے سیاہ کے، کوئی اور رنگ دکھائی ہی نہ دے رہا تھا۔
ہو وہ چند ساعت اسے یوں ہی بے تاثر نگاہوں سے دیکھے گیا، بعد ازاں بس ایک دم ہی بہت بے دلی سے اسے لپیٹ کر ایک طرف کر دیا اور ابھی وہ لاؤنج سے اٹھ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھا ہی تھا کہ معاً سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا فون بج اٹھا...... اس نے اٹھا کر دیکھا...... عباد کا نمبر تھا۔
عباد نے آج بڑے دنوں بعد از خود اسے یاد کیا تھا۔ سو وہ اس امر کو خوش گوار تصور کر کے اپنی ساری یاسیت

ایک جانب کرتے ہوئے قدرے بشاش سے لہجے میں بولا۔

''جی رہا ہوں!'' دوسری جانب سے ان کی نحیف وحد درجہ سنجیدہ سی آواز سنائی دی تھی۔ سو مفتاح کی ساری بشاشت آن واحد میں منہ چھپا کر کسی نامعلوم سمت نکل گئی۔ اور وہ خود چپ کا چپ رہ گیا۔

''بتاؤ نا مفتاح......'' اس کی خاموشی پر بے چین سا ہو کر عباد نے استفسار کیا۔ ''کوئی سراغ مل سکا اس کا؟''

مفتاح کی تو خواہش تھی کہ خود ساختہ جلاوطنی کاٹتے اس کے ماں جائے کو اس قیامت خیز واقعہ کی خبر نہ پہنچے مگر اب کیسے ممکن تھا؟

سو شریفہ نے اسے خود فون کر کے وری کا رشتہ طے ہو جانے سے لے کر ایک ایک بات نہ صرف نمک، مرچ بلکہ پورا گرم مسالہ لگا کر بتاتے ہوئے اس حرافہ سے اپنے معصوم لخت جگر کو بچانے کا سہرا بھی خود اپنے ہی سر باندھ لیا تھا۔ اور یہ سب سن کر ان کے معصوم لخت جگر پر کیا گزری؟ ظاہر ہے کہ یہ جاننے سے انہیں دل چسپی تھی نہ ہی ان کے پاس فرصت کہ ابھی تو بہتیرے کرنے والے اہم کام ان کی راہ تک رہے تھے۔ سو وہ تو یہ بھی محسوس نہ کر سکیں کہ اس کے بعد عباد نے پاکستان کال کرنا مکمل طور پر ترک کر دی تھی۔ یہ تو مفتاح تھا کہ جسے نہ صرف ان کے ''اجاڑ'' دیے جانے والے دل کا بھرپور احساس تھا بلکہ وہ ان کے گوشہ عافیت سے رابطہ نہ کرنے کو ان کا صاف صاف احتجاج گردان رہا تھا سو اس نے از خود انہیں فون کر کے ان کی روزانہ کی بنیاد پر خبر گیری کو اپنا فرض تصور کر لیا تھا۔

پہلے پہل تو رابطہ قائم ہونے پر وہ یوں خاموش رہتے گویا ان کے پاس کہنے کو کچھ باقی نہ بچا ہو اور یہی حقیقت تھی کہ اب کہنے سننے کو واقعی ان کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ مگر ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ واقعہ خواہ کتنا بھی دل خراش کیوں نہ ہو، حضرت انسان بہرحال نارمل ہو ہی جاتا ہے۔ سو وہ بھی شاید ہو ہی گئے تھے یا غالباً نہیں۔ کہ تب ہی تو سردست ایک ایسا دقیق سوال مفتاح سے پوچھ لیا تھا کہ وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔

''آں......اب تک تو نہیں۔'' وہ جواباً لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔ ''مگر امید ہے کہ وہ جلد مل جائے۔''

''نہیں مفتاح......'' وہ اس کے لہجے سے اس کا اصل جواب جان گئے تھے سو مغموم سے انداز سے اس کی بات درمیان ہی سے قطع کرتے ہوئے بولے۔ ''مجھے اب کوئی امید نہیں۔''

اور سچائی بہرحال یہی تھی کہ وہ خود بھی تقریباً مایوس ہو چکا تھا مگر ان کے سامنے اس اظہار کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

''کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہو گئے؟'' وہ غالباً یہ چاہتے تھے کہ مفتاح ان کی بات رد کر کے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرے کہ وہ غلط سوچ رہے ہیں مگر......

''آپ واپس کب آرہے ہیں؟'' مفتاح نے موضوع بدلتے ہوئے گمبھیرتا سے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ اچاٹ سے لہجے میں بولے۔ ''اور پھر واپس آکر کرنا بھی کیا ہے؟''

''آپ کا تو نہیں پتا کہ کیا کرنا ہے۔'' مفتاح پرتپش سے لہجے میں بولا۔ ''مگر ماما کا بتا دوں......وہ کل فرحی باجی سے آپ کے رشتے کی بات کرنے جا رہی ہیں۔''

''کیا انہیں اب بھی احساس نہیں کہ وہ میرے ساتھ کیا کر چکی ہیں؟'' انہیں یہ جان کر حقیقتاً دھچکا لگا تھا تب ہی بے ساختہ غم زدہ سے لہجے میں بولے۔

''یہی تو افسوس ہے بھائی۔'' مفتاح فون کان سے لگائے لگائے اب ٹیرس پر آ نکلا تھا۔ اور اس کی طیش میں ڈوبی آواز سناٹے میں دور تک جاتی تھی۔ ''اور سچ کہوں تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے یہ احساس وحساس ان کے اندر ہے ہی نہیں۔ ان میں صرف انا ہے۔ ضد بے پناہ گھمنڈ۔ اور یہی سب مل کر انہیں یقین دلا رہے ہیں کہ جو وہ چاہتی

pklibrary.com

ہیں ویسا ہو کر ہی رہے گا۔"

مفتاح بولتے بولتے آزردہ سا ہو گیا مگر اس بار جواباً وہ کچھ نہیں بولے۔ بس چند ثانیے توقف کے بعد اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ تب مفتاح نے بھی فون کاٹا اور گہری اداسی سے سیاہ آسمان کو دیکھے گیا کہ جس کے کنارے غبار آلود سرخی میں ڈوب رہے تھے۔

نا جانے اب کس طوفان کی آمد آمد تھی۔

☆☆☆

"اور اگر وہ جو اس زندگی میں میرے سامنے نہ آئی، تو میں یہ یقین کر لوں گا کہ جیسے "وہ" ہے ہی نہیں۔"

وہ لڑکھڑاتے قدموں اور ساکت ذہن کے ہم راہ آتش کدے سے کسی طور پر چلتا باہر آتو گیا مگر ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے جسم سے جان نکلی جا رہی ہو۔ اور جیسے..... جیسے وہ کہیں گر پڑے گا۔ اور وہ واقعی گر پڑا تھا..... منہ کے بل..... بڑے زور سے۔

"اگر وہ اس زندگی میں میرے سامنے نہ آئی، تو میں یہ یقین کر لوں گا کہ جیسے "وہ" ہے ہی نہیں۔"

مجہول حلیہ کے باعث اسے نشے میں دھت سمجھ کر کوئی بھی — "اٹھانے" کو آگے نہیں بڑھا تھا۔ اسے اگر اٹھنا تھا تو خود ہی اٹھنا تھا..... سو وہ چند ثانیے، فٹ پاتھ پر ماتھا ٹکائے یوں ہی پڑا رہا۔ پھر بدوقت تمام اپنے دونوں ہاتھوں پر زور ڈال کر اٹھا..... اور وہیں بیٹھ گیا۔

یہ فٹ پاتھ اس چوڑی سی گلی کے اختتام پر واقع ایک بنگلے کے ساتھ بنی تھی کہ جس کا باوردی چوکیدار اسے وہاں پر براجمان دیکھ کر چوکنا ہو گیا تھا۔ مگر اسے ان باتوں کا دھیان ہی کہاں تھا کہ وہ تو جیسے اس سے کسی اور ہی جہاں کا مسافر ہو چکا تھا۔

ذلت، اذیت، کرب و رنج کے کون کون سے باب تھے جو آج ایک بار پھر کھل کر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ اور ان ابواب کی ہر سطر دل خراش اور ہر لفظ جاں گسل تھا۔ اور وہ لہولہان ہوا جاتا تھا اس نظر کو یاد کر کے کہ جب وہ آخری بار اپنی حاجت لیے اس "بے نیاز" کے روبرو ہوا تھا۔

"تو میں یقین کر لوں گا کہ جیسے....."

"وہ ہے" اس بار سبک خرامی سے بہتی ہوا نے یہ جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی ایک پل کو اس کے نزدیک ٹھہر کر بڑے وثوق سے سرگوشی کی تھی۔ وہ بہت زور سے چونک کر گویا عالم تنویم سے باہر نکلا۔

"وہ ہے" فٹ پاتھ کے ساتھ نصب درخت کے پتے مسکرا کر گویا ہوئے۔ اس نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا۔

"وہ ہے۔" رنگ برنگ پرندوں کا ایک غول اچانک ہی نمودار ہوا اور خوش الحانی سے گنگناتے ہوئے اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔

"وہ ہے۔" سڑک پر بکھری خاک کے ذرے ذرے نے شور مچا دیا۔

"وہ ہے، وہ ہے" زمین آسمان پرند چرند الغرض ساری کی ساری فضا ایک آواز ہو کر اسی شہادت سے گونج اٹھی تھی اور یہ کیسی پراسرار واردات تھی کہ وہ ان سب ہی کو سن تو رہا تھا پر اب بھی یوں اپنی جگہ منجمد تھا گویا برف کا مجسمہ۔

"وہ ہے..... عیسیٰ..... وہ ہے۔" اب کی بار کوئی اس کے اندر سے بولا اور ساری برف پگھل گئی۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ ہے۔" اس کے خشک لب پھڑ پھڑائے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

☆☆☆

"یہ ہوتا کون ہے مجھے منع کرنے والا، یہ میرا بھی گھر ہے۔"
کوئی جگہ کی تنگی کے باعث عقب سے گزرتے ہوئے اس کی پشت سے ٹکرا گیا تھا۔
نتیجتاً ہاتھ میں موجود پیالی سے گرم گرم چائے چھلک کر اس کی پتلون کو داغ دار کرتے ہوئے اس کی ران کو جلا گئی۔ پر اسے زیادہ تکلیف یوں محسوس نہ ہوئی کہ اس سے زیادہ تکلیف دہ منظر تو وہ تھا کہ جب وہ عامر سے فیروزہ کے کمرے کو اسٹڈی روم نہ بنانے کی بابت الجھ رہا تھا اور کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہ تھا۔
"جس کے کمرے کو آپ دو ہی دن میں اجاڑنا چاہتے ہیں، اس کا بیٹا۔" وہ بے خوفی سے دوبدو تھا۔ عامر بپھر گیا۔
"ہاں تو وہ میری بھی ماں تھیں، تم زیادہ سگے مت بنو۔"
"بات زیادہ سگے بننے کی نہیں۔" وہ بولا۔ "اس احساس کی ہے جو ان کے کمرے سے جڑا ہے اور جو آپ کو محسوس نہیں ہو رہا۔"
"احساس ہے مجھے۔" سامنے موجود بہنیں ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھ رہی تھیں اور اس نے دیکھا کہ عیسیٰ کی اس بات پر سب ہی کی آنکھوں میں خاموش تائید کے رنگ جھلکتے تھے سو وہ لہجے کو آزردہ سا بنا کر بولا۔
"پر اپنے بچوں کی وجہ سے مجبور ہو گیا ہوں۔" وہ کہاں بیٹھ کر پڑھیں گے؟"
"گھر میں اور بھی کمرے ہیں۔"
"کہاں ہیں کمرے؟" وہ تیز ہوا پھر خود پر قابو پا کر بولا۔ "ایک گیسٹ روم ہے، دوسرا شاباکا کمرہ۔ اور تیسرا تمہارا..... اب بتاؤ..... کے کمرہ بدر کروں؟"
"جانے دو عیسیٰ۔" شونا بولیں۔ "پھر اب جھگڑے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ امی تو چلی گئیں کمرہ یونہی خالی پڑا ہے۔ بچوں کے کام آجائے تو ہرج ہی کیا ہے۔"
"وہ کمرہ خالی نہیں ہے باجی....." وہ عجب انداز سے ہنس کر گھمبیرتا سے بولا۔ "پر افسوس کہ آپ سب کو خالی لگ رہا ہے۔"
"پاگلوں جیسی باتیں کرتا ہے۔" عامر نے دانت پیسے۔ "میں عاجز آ گیا ہوں اس سے۔"
"ٹھیک ہے تو پھر تم اپنا کمرہ انہیں دے کر خود امی کے روم میں شفٹ ہو جاؤ۔"
نعمی نے یقیناً جھگڑا ختم کروانے کی غرض سے اپنے طور پر درمیانی راہ نکالی تھی۔ پر یہ زیادتی کرنے والے کو شہ دینے والی بات تھی جس کا یقیناً اسے ادراک نہیں تھا۔ پر عیسیٰ کو تو تھا سو وہ اکڑ گیا۔
"نہیں..... میں اپنا کمرہ نہیں چھوڑوں گا۔ اور نہ ہی امی کے کمرے کو اجاڑنے دوں گا۔ بھائی جان کا روم خالی پڑا ہے۔ یہ چاہیں تو وہاں اسٹڈی روم بنا سکتے ہیں۔"

☆☆☆

"میں نے جاتے ہی راشدہ سے دوٹوک کہا کہ "دیکھو بھئی..... سب جانتے ہیں کہ میرا عباد لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایک ہے۔ ایسا خوب رو، پڑھا لکھا، مودب، درہم کمانے والا..... میں تو جہاں چاہوں اس کا رشتہ کر دوں۔"
سرخ نگینوں سے جھلملاتے، گہرے نیلے ریشمی جوڑے میں ملبوس، سونے کا جڑاؤ ہار اور کانٹے پہنے، لبوں پر بے تحاشا سرخ رنگ پھیرے بیٹھی شریفہ — ابھی ابھی ہی گوشہ عافیت واپس لوٹی تھیں..... وہ عینا کے ساتھ جا کر آج اپنی خالہ زاد بہن کے ہاں عباد کا رشتہ ڈال آئی تھیں۔ بلکہ ڈال کیا آئی تھیں، اپنی دانست میں عباد اور فرحی کی بات تقریباً پکی کر آئی تھیں اور اس وقت لاؤنج کے صوفے پر بڑے ٹھسے سے براجمان وہاں کی روداد

جملہ حاضرین کو جڑے زعم سے سنانے میں بے طرح منہمک تھیں۔
عینا کا آج یہیں ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ سو وہ اپنا بچہ مزے سے وائلہ کے حوالے کیے، وہیں صوفے پر نیم دراز ہو کر اپنے نئے نویلے کیمرے والے فون میں مصروف ہو چکی تھی۔
رجا سب کے لیے چائے لے آئی تھی جب کہ عارفہ کہ جن کی صحت لیاقت بیگم کے بعد سے بہت گری گئی تھی۔ وہ اپنے لبوں پر ہمیشہ موجود رہنے والی سادہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بے نقط بولتی شریفہ بیگم کی جانب متوجہ تھیں۔
''میں نے کہا۔'' وہ رعونت آمیز لہجے میں گویا تھیں۔ ''لوگ تو میرے عباد کے لیے اپنی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ نہ صرف بنگلہ، گاڑی بلکہ ہیرے موتی تک دینے کی بات خود آگے بڑھ بڑھ کر اپنے منہ سے کر رہے ہیں مگر بھئی میں ٹھہری خاندانی، وضع دار عورت.....'' انہوں نے بڑے انداز سے اپنے مزید مختصر کروا دیے گئے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔
''اسی لیے بھئی مجھے تو یوں منہ پھاڑ پھاڑ کر اپنی بیٹیاں خود پیش کرنے والے لوگ ذرا اچھے نہیں لگتے، اب چاہے وہ بنگلہ دیں، ہیرے یا موتی مجھے تو بھئی اپنے بچے کے لیے ہیرے جیسی خاندانی اور شریف لڑکی چاہیے۔ بس اسی لیے میں فرحی کا ہاتھ مانگنے چلی آئی ہوں۔''
''بہت اچھی بات ہے۔''
''ہیرے جیسی لڑکی'' پر عارفہ کو یاد تو اس سے وہ کوہ نور صورت بڑی شدت سے آئی تھی کہ جسے انہوں نے بے مول گردان کر اس بے دردی اور حقارت سے مسترد کیا تھا کہ پھر وہ واقعی خود کو ''بے مول'' ہی کر گئی۔ مگر وقت کچھ بھی کہنے سننے سے بہت آگے بڑھ گیا تھا، سو وہ اخلاق کے تقاضے نبھاتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔
''ہاں تو واقعی ہے ہی اچھی بات۔'' وہ نخوت سے بولیں۔ ''میرے بیٹے میں برائی ہی کیا ہے سوا سے ہاں کرتے ہی بنی۔''
''ماشاء اللہ۔'' عارفہ کو واقعتاً قلبی مسرت محسوس ہوئی کہ گوشتہ عافیت پر مسلسل چھائے یاسیت و غم کے بادل چھٹنے کی کوئی کرن جو نظر آئی تھی۔ تب ہی بہت خلوص سے تہنیتی لہجے میں بولیں۔ ''بہت بہت مبارک ہو بھابھی بیگم آپ کو۔''
''ہاں بھئی۔'' خیر مبارک۔'' وہ رجا سے چائے کا کپ لیتے ہوئے ان کی مبارک باد احسان کرنے والے لہجے میں وصولتی ہوئی بولیں۔ ''میں دراصل یہی چاہ رہی تھی کہ وائلہ کے ساتھ ساتھ عباد کی بھی شادی کر ہی دوں۔ تم تو جانتی ہی ہو اپنے جیٹھ صاحب کو..... اک اک روپیہ خرچنے میں ہزار ہزار تو صلواتیں سناتے ہیں۔''
''وا..... وائلہ؟'' گو وہ واقف تھیں کہ ایک نہ ایک روز یہ ضرور ہو گا مگر پھر بھی۔ پھر بھی یک لحظہ وہ کچھ چونک سی گئیں کہ اپنے محنتی لخت جگر کا سادہ سا چہرہ ان کی نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا، سو وہ ہکلاہٹ زدہ سے لہجے میں بولیں۔ ''وائلہ کی کہاں کر رہی ہیں؟''
''ارے وہی سہراب.....'' شریفہ چائے کا بڑا گھونٹ بھر کر مزے سے بولیں۔ ''وہ ایک دو دن میں لے کر آ رہا ہے نا اپنی مورے کو.....''
''سہراب؟'' عارفہ یہ نام سن کر ذرا حیران و پریشان سی ہو گئیں کہ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ وری کے نکاح کے روز ہوئے واقعے نے ان کا ارادہ بدل دیا ہو گا کہ بہر حال احتیاط پسندی کا تقاضا یہی تھا مگر.....
''مگر وہ تو.....'' عارفہ اس سے آگے کچھ کہہ ہی نہ سکیں۔ پر شریفہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔
''کیا وہ تو؟''

''اماں بیگم کو وہ لڑکا کچھ بھایا نہیں تھا بھابھی بیگم۔'' معاملہ صرف ان کے ''بیٹے'' کا نہیں۔ بلکہ گھر کی بچی کا تھا، سو وہ ذرا ہمت کر کے رسانیت سے کہہ گئیں۔

''اور پھر اس روز وریٰ کے سر کے ساتھ ہوئی اس کی جھڑپ.....''

''کوئی جھڑپ وڑپ نہیں۔'' وہ ان کے کہنے پر بھڑک کر بات کاٹتے ہوئے بولیں۔

''وہ مردود اپنی خفت چھپانے کو خوامخواہ اس بچے پر الزام دھر رہا تھا۔ میں نے پوچھ لیا تھا اس سے، سب بتا چکا ہے وہ مجھے اور اماں بیگم کی تو رہنے ہی دو..... انہیں تو میں بھی نہیں بھائی تھی تو کیا اب میں خود کو آگ لگا لوں؟''

''نہیں..... نہیں..... بھابھی بیگم! خدانخواستہ میرا وہ مطلب تھوڑی تھا۔'' انہیں شعلہ جوالا کے روپ میں ڈھلتے دیکھ کر عارفہ اپنی جگہ مجرم سی بن گئیں۔ تب ہی جلدی سے وضاحتی لہجے میں بولیں۔ رجا ماں کو اس موضوع پر مزید بولنے سے ٹوکنا چاہتی تھی پر چونکہ اس کی یہ تربیت نہیں تھی سو وہ ایک نظر ان پر ڈال کر، اپنا کپ اٹھا کر خاموشی سے لان کی جانب نکل گئی۔

اور واشلہ.....

واشلہ کا سانس اچانک ہی سینے میں بری طرح اٹکنے لگا تھا۔ وہ بھی رجا کی طرح لان کی طرف نکل جانا چاہتی تھی مگر۔

اچانک اپنی جگہ سے اٹھی، اور بنا کسی کی طرف دیکھے تقریباً بھاگتے ہوئے اوپر جاتی سیڑھیوں کی سمت بڑھ گئی۔ اور اس کے قدموں سے لپٹا بے آواز احتجاج عارفہ نے بہت غور سے دیکھا تھا جب کہ شریفہ..... ان کے پاس جو آنکھیں تھیں۔ وہ صرف دولت کے انبار ہی دیکھ پاتی تھیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں، سو وہ عارفہ کی وضاحت پر بڑی زور سے گردن مار کر اب عینا کی جانب متوجہ ہو کر کہہ رہی تھیں کہ۔

''ذرا میرے عباد کو تو فون ملا دے..... اسے تو یہ خوش خبری سنا دوں کہ تیرا رشتہ طے کر آئی ہوں۔''

☆☆☆

''اوہ خولہ! تم جاگ گئیں؟''

ابھی تو اس کی وائرل ویڈیو کا قصہ ہی تمام نہ ہوا تھا مستزاد آتش کی تازہ بہ تازہ کتاب کے مواد پر روزانہ سوشل میڈیا پر ہونے والا کوئی نہ کوئی ہنگامہ۔

بی، ذی کہ ان دنوں — اپنا فون ہاتھ میں اٹھانے کے خیال تک سے وحشت ہو گئی تھی۔ سو اس نے وقت گزاری کے لیے آتش کے کتب خانے سے ایک انگریزی ناول اٹھا لیا تھا۔ اور اب وہ انتہائی غیر دل چسپی اور بے دلی سے اس ''وار اینڈ پیس'' نامی بھاری بھرکم اور دقیق ناول کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ تب ہی اس نے صوفہ پر ٹھکری سی بنی پڑی خولہ کو کسمساتے دیکھا تو جھٹ سے ناول ایک طرف ڈال کر فی الفور اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

دراصل وہ پچھلے دو روز سے مسلسل بخار میں پھنک رہی تھی۔ اتنے شدید بخار میں کہ بار بار گردن ایک طرف ڈال کر گہری غنودگی میں چلی جاتی تھی۔ زیادہ تشویش ناک امر یہ تھا کہ کوئی بھی دوا اس کے بخار کی حدت پر اثر انداز نہ ہو پا رہی تھی۔

''جی میم.....!'' وہ کراہ کر بولی۔ ''پور پور میں اتری اذیت بتا رہی ہے کہ میں واقعی جاگ چکی ہوں۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' بی ذی جو نیم دراز تھی۔ کہنیوں پر زور ڈال کر بیٹھتے ہوئے ذرا طمانیت سے بولی۔ ''مجھے بتاؤ کہ تم اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''ایسا کہ جیسے میں انگاروں پر لیٹی ہوئی ہوں۔'' وہ بے نور نگاہوں سے خلا میں تکتی ہوئی بھید بھرے لہجے میں بولے گئی۔ ''اور آسمان تک بلند ہوتے سرخ آگ کے شعلے مجھے نگلنے کو میری جانب مسلسل لپک رہے ہیں۔''

''توبہ..... توبہ.....'' جلی بھنی سی رضیہ، جو اس کی بیماری کے باعث دہرے تہرے کام نمٹانے پر مجبور تھی اور اسی وقت بی ذی کا ناشتہ ٹرے میں سجائے کمرے میں لا رہی تھی۔ وری کا بی ذی کو دیا جائے والا جواب سن کر بے ساختہ جلبلائی ہوئی بولی۔

''ایسی ڈرامے بازی کی باتیں..... میں بتا رہی ہوں آپ کو میڈم جی..... یہ کوئی بیمار ویمار نہیں..... بس کام سے بچنے کے لیے ناٹک کر رہی ہے۔''

وہ بی ذی کے لیے بستر پر ہی میز سیٹ کرتے ہوئے مسلسل اس کے خلاف بولے چلی جا رہی تھی۔ تب ہی بی ذی نے ناگواری سے ایک دم اسے ٹوک دیا۔

''اوہ یوشٹ آپ پلیز.....'' پھر اسے تنبیہی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ''یہ کام چور نہیں..... بلکہ اپنی ساری ڈیوٹیز بہت اچھی طرح سے سرانجام دینے والی لڑکی ہے۔ یہ پچھلے ایک سال سے میری ہیلپر ہے اور اس نے اپنے اس کام میں ایک بار بھی کوتاہی نہیں کی..... آج مجھ میں جتنی بھی امپروومنٹ ہے، اس کا کریڈٹ کچھ نہ کچھ اسے بھی جاتا ہے سو پلیز، تم اس کے بارے میں ایسی بات مت کرو اور جاؤ، اس کے لیے چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو لے آؤ۔ اس کی میڈیسن کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

''جی میڈم.....'' رضیہ کو بی ذی کی ''خولہ'' کے لیے اس مدح سرائی نے جی ہی جی میں چراغ پا کر دیا تھا تاہم بظاہر وہ تابع داری سے بولی۔

''ابھی لے کر آتی ہوں۔'' وہ بی ذی کا ناشتا میز پر رکھ چکی تھی، سو کبہ کر مڑی اور حال سے بے حال پڑی وری پر ایک جھلستی ہوئی نگاہ ڈالی۔

(ایک تو میرا اتنا ''چھوٹا'' سا کام بھی نہیں کیا اوپر سے میڈم صاحبہ کی نظر میں ہیروئن بھی بن گئی۔ ناٹک کر کے جتنا آرام کرنا ہے کر لے..... تجھے مزہ تو اب میں چکھاؤں گی)

وہ دل ہی دل میں پکا ارادہ کرتے ہوئے کمرہ عبور کر گئی۔ اور وری..... وہ ایک بار پھر غنودگی میں جا چکی تھی۔

''یہ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔'' بی ذی اسے ہاتھ پیر چھوڑے دیکھ کر تشویش زدہ سی سوچ گئی۔

''اسے ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔''

☆☆☆

''اے ہے، تو پھر کیا ہوا؟''

وہ چائے ختم ہونے کے بعد بھی تادیر وہیں، اس ڈھابے بیٹھا رہا..... مگر کب تک؟ سو آخر کار پیسے دے کر وہاں سے نکل آیا۔ اور بہت آہستہ روی سے چلتا آگے بڑھنے لگا۔ سرمئی شام کبھی کی ڈھل کر سیاہ ہو چکی تھی۔ دھرتی نے آج اپنا ایک اور سفر مکمل کر لیا تھا اور ایک وہ تھا کہ جو تا حال راستوں ہی میں بھٹک رہا تھا۔ ماضی بعید کے پر پیچ راستوں میں..... اور جسے وہ ''حال'' گماں کر رہا تھا۔ عن قریب ان مناظر نے بھی ماضی ہی بن جانا تھا۔ پر اسی وقت تو اس کے قدم سامنے کی سمت اٹھ رہے تھے اور اس کے تعاقب میں تھا ایک اور ایسا منظر کہ جو اس نے تو کبھی نہیں دیکھا۔ ہاں مگر اس گھر کے در و دیوار نے ہو کر جو اس کا ہوتے ہوئے بھی اب اس کا نہیں رہا تھا۔

اس نے فیروزہ کے کمرے کو اسٹڈی روم بننے نہیں دیا اور نہ اپنا کمرہ چھوڑنے ہی پر آمادہ ہوا سو ہٹ دھرمی

سے عامر نے شاکر کے کمرے کو اسٹڈی بنانے والی پیش کش بھی رد کر دی۔ اور نیز اس کمرے کو اسٹڈی بنا کر کرنا بھی کیا تھا کہ جیسے پہلے ''گیسٹ روم'' کا درجہ دیا جا چکا۔ اور یہ درجہ اسے ایسے ہی محض نام رکھنے کو نہیں دے دیا گیا تھا بلکہ اسے بڑے بھرپور طریقے سے تصرف میں لیا جا رہا تھا کہ وہاں آئے دن رینا کے گھر سے وارد ہونے والا کوئی نہ کوئی ''مہمان'' بڑے مزے سے ٹھہرا ہوتا تھا۔ کبھی کوئی ہمشیرہ تو کبھی بھانجی، کبھی کوئی تو کبھی کوئی.....

اور آج تو خیر رینا کی سال گرہ تھی سو وہ والدہ ماجدہ سمیت ساری ہی ادھر رونق افروز تھیں۔ پلاؤ، سیخ کباب اور چرغے کی دعوت اڑائی جا چکی تھی۔ ہما کے شاہ خرچ سرتاج کے توسط سے کیک، بطور خاص کلفٹن کی ایک معروف بیکری سے منگوایا تھا۔ جسے تاحال کاٹا نہ جا سکا کہ صاعقہ کا انتظار تھا جو کسی بہت ہی خاص وجہ سے اب تک یہاں نہیں پہنچ سکی تھی مگر اپنے 3210 سے انہیں لینڈ لائن پر کال کر کے جلد پہنچنے کا مژدہ ضرور سنا چکی تھی۔ سو وہ ساری ہی لاؤنج میں ادھر ادھر لڑھکی ہوئی، کچھ تو وقت گزاری کی غرض سے اور کچھ عادتاً لوگوں کو اپنی نیکیاں اندھا دھند بانٹنے میں مصروف تھیں۔ سو رینا نے بھی کہ جس کا دل واقعتاً سلگا ہوا تھا، لگے ہاتھ اپنا تازہ ترین دکھڑا انہیں سنانا شروع کر دیا۔ بلا تھکان بولتی رینا نے ذرا دم لینے کو ہاتھ میں موجود سوفٹ ڈرنک کا گھونٹ بھرا اور بس اتنی ہی دیر اسے بغور سنتی نجمہ کو بہت گراں گزاری تھی سو اس نے بڑی بے قراری سے استفسار کیا۔

''ہونا کیا ہے؟'' رینا لب کشا ہو پاتی، اس سے قبل ہما تمسخرے ہنس کر بہت وثوق سے بولی۔ ''اس کے میاں کو بات ماننا پڑی ہوگی اس سر پھرے کی۔''

''ہا مورے!'' نجمہ نے بے ساختہ افسوس بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا واقعی؟'' تب رینا کا چہرہ اہانت سے سرخ پڑ گیا اور وہ سلگتے لہجے میں بولی۔

''ہاں..... ہوا ابھی یہی ہے مگر جلد میں اسے یہاں سے نکلوا دوں گی۔ کیونکہ اب یہ گھر صرف اور صرف میرا اور میرے بچوں کا ہے۔''

اور جس سے وہ اس عزم کا اعادہ اپنی بہنوں کے سامنے کر رہی تھی اس وقت بھی عیسیٰ جیسے دنیا و مافیہا سے غافل صوفی صاحب کی مجلس میں براجمان تھا۔ اور اس کا یہ غیر متوازن رویہ خود اس کے لیے کس قدر تباہ کن ثابت ہونے والا تھا، اس سچائی کا اسے ادراک ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

''میرے بچے میرے لعل کیسا ہے تو؟''

''اس وقت تو کیا، اگلے دو دن سب ہی کے فون کرنے کے باوجود عباد نے کسی کی بھی کال وصول نہیں کی تھی بس ''مصروف ہوں۔'' کا پیغام بھیج دیا تھا۔ بہر کیف دو چار روز بعد وہ سب جب رات کا کھانا تناول کر چکے تب ایک بار پھر شریفہ نے عباد کو کال ملانے کا کہا..... اور اس بار واشلہ نے ان کے نمبر سے نہیں بلکہ شریف احمد کے فون سے عباد کو کال ملائی تھی جو انہوں نے دو چار بیل کے بعد اٹھالی۔ اور واشلہ کے ہیلو کرتے ہی شریفہ نے لپک کر اس سے فون چھین لیا۔ اور چھوٹتے ہی اپنے لہجے میں زمانے بھر کا دلار بھر کر ان سے پوچھا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' وہ شریف احمد کے نمبر سے شریفہ کی آواز سن کر چونکے تاہم سنبھل کر خشک سے لہجے میں جواباً بولے تھے۔

''اتنی یاد آ رہی ہے تیری، تو کب آئے گا پاکستان؟''

رجا اب واشلہ کے ساتھ مل کر میز سمیٹ رہی تھی جب کہ عارفہ چائے، قہوہ وغیرہ تیار کرنے کی غرض سے

باورچی خانے کا رخ کر چکی تھیں۔ عارف احمد ٹی وی لگا کر بیٹھ گئے تھے جب کہ شریف احمد بجلی کے بلوں کی فائل لیے صوفے پر بیٹھے تھے اور خدا جانے کیا حساب کتاب کر رہے تھے۔ مہرو تو خیر سب سے پہلے میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں جا چکا تھا اور رہا مفتاح تو وہ اب ان سب کے ساتھ نہ ناشتہ ہی کیا کرتا تھا نہ عشائیہ۔ سو وہ بس ابھی ابھی ہی کہیں سے واپس آیا تھا اور گھر میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کی سماعت سے شریفہ کی شیرے میں لتھڑی آواز ٹکرائی

''ابھی تو بہت مشکل ہے۔'' انہوں نے دوسری جانب سے خاصے کھردرے لہجے میں کہا تھا۔ شریفہ دہائی دینے لگیں۔

''ارے تو پھر لعنت بھیج ایسی نوکری پر اور فوراً آجا یہاں..... میں تو ترس گئی تیری صورت دیکھنے کو.....''

''ترسا تو میں بھی بہت تھا۔'' وہ کہہ کچھ اور رہے تھے پر شریفہ ''کچھ اور'' سمجھ کر انہیں پچکارنے لگیں۔

''ارے بچے تو کس نے کہا ہے ترسنے کو، آجانا یہاں اور پھر اب تو یوں بھی تجھے آنا ہی پڑے گا۔''

''کیوں؟'' وہ چونکے۔ ''کیوں آنا پڑے گا؟''

''میں نے تیری بات جو فرحی سے پکی کر دی ہے میرے بچے۔'' وہ خوشی سے سرشار لہجے میں انہیں مطلع کرتے ہوئے بولیں۔

''ہوں۔'' وہ یہ خوش خبری سماعت کرنے کے بعد یک لحظہ توقف کے بعد معنی خیز ہنکارا بھرتے ہوئے بولے۔ ''اور بات پکی کرنے سے پہلے آپ نے میری رائے لینا تو درکنار، آپ نے مجھے آگاہ کرنا تک ضروری نہیں سمجھا.....؟''

''آگاہ ہی تو کر رہی ہوں۔'' وہ اپنے زعم میں تھیں، سو ان کے لہجے کا غیر معمولی پن محسوس کیے بنا چہکتے ہوئے بولیں۔

''یعنی آپ کی نظر میں گویا ایسی ہی بے جان شے ہوں میں؟''

''بے جان شے کی کیا بات ہے۔'' وہ خفا سے لہجے میں بولیں۔ ''میں مان ہوں تیری، اتنا تو مان ہے تجھ پر کہ جانتی ہوں، تو مجھے انکار نہیں کر سکتا۔''

''سنیے!'' ابھی شریفہ اس ضمن میں اور بھی بہت کچھ کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں کہ دوسری جانب سے سنائی دینے والی ایک لوچ دار، مترنم سی آواز نے انہیں بے طرح ٹھٹھک کر خاموش ہونے پر مجبور کر دیا۔

''کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' وہ جو کوئی بھی تھی یقیناً عباد سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔ ''پہلے کھا لیجیے، بات بعد میں کر لیجیے گا۔''

''یہ..... یہ..... یہ۔'' شریفہ بوکھلاہٹ زدہ لہجے میں کہتے ہوئے ایک دم چوکس ہو بیٹھیں۔ ''یہ کس کی آواز ہے؟''

''میری بیوی کی!''

جواباً عباد نے نہ تو قف ہی کیا اور نہ ہی ہچکچائے۔ بلکہ پورے سکون اور اعتماد سے شریفہ کی سماعت پر ایٹم بم دے مارا تھا۔

''یہ..... یہ۔'' شریفہ کو چکر آنے لگے۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے تو۔''

''وہی جو آپ نے سنا۔'' وہ بہت اطمینان بھرے لہجے میں بولے۔

''میں یہاں شادی کر چکا ہوں۔''

''نہیں.....'' شریفہ کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔''

''بالکل ہوسکتا ہے مام۔'' وہ اس بار ہنسے تھے۔ بے رحم سی ہنسی۔
''کیوں کہ آپ اگر میری ماں ہیں ناں، میں بھی آپ ہی کا بیٹا ہوں۔''

☆☆☆

''عاشق بنایا، عاشق بنایا آپ نے۔''

وہ نہ جانے کب سے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سر جھکائے یونہی بے مقصد سڑکوں کی خاک چھانے چلا جا رہا تھا اور حقیقت یہ تھی کہ اب وہ اس بے سمت مسافت سے تھک چکا تھا، گھر جانا چاہتا تھا مگر

''گھر؟''

جولڑائی چند سال قبل وہاں شروع ہوئی تھی، اس نے اسے گھر کہاں رہنے دیا تھا۔ وہ تو ''میدان جنگ'' تھا جہاں ہمہ وقت چوکنا رہنے کی ضرورت یوں تھی کہ کسی بھی سمت سے وار کا خدشہ تھا۔ سو وہ نڈھال سا ہو کر یونہی فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا تھا اگر جو وہ بھی دیگر کی طرح عامر اور رینا کے معاملے میں منافقانہ رویہ اختیار کر لیتا؟

مگر نہیں، منافق تو بزدل ہوتے ہیں اور وہ حق پر ہوتے ہوئے بزدلی کا مظاہرہ کیسے کر سکتا تھا؟ ہرگز نہیں کر سکتا۔ کرنا بھی نہیں چاہیے کہ حق بجانب ہوتے ہوئے مصلحتاً اختیار کی گئی خاموشی باطل کو شہ دینے کے مترادف ہے۔ اور وہ کسی طور اپنے نام کا اندراج باطل کی طاقت کو بڑھاوا دینے کا سبب بننے والوں کی فہرست میں نہیں کروانا چاہتا تھا سو ہمیشہ اس نے وہی کیا کہ جو کرنا چاہیے تھا۔ اس سی روز کہ جس دن وہ اپنی غیرت ''ذرا سی'' کم کر کے خود کو ہزار ہا دشواریوں سے بچا سکتا تھا مگر وہ ان دنوں گھر سے باہر زیادہ تر مسجد میں صوفی صاحب کی سنگت میں وقت گزارا کرتا تھا۔ کمرے والے واقعے کے سبب اس کا دل جیسے سب ہی سے مزید اچاٹ اور دور ہو گیا تھا۔

اسی مطلب پرست و مصالحت پسند دنیا میں وہ مسجد ہی اس کی ''جائے پناہ'' تھی۔ سو وہ زیادہ تر وہیں رہا کرتا اور شب بسری کے لیے واپس گھر لوٹتا تھا مگر اس دن صوفی صاحب کسی سفر پر روانہ ہو رہے تھے اور خود اس کی طبیعت بھی کچھ ناساز تھی سو وہ سہ پہر ہی کو گھر لوٹ آیا۔

یوں تو گھر والے اپنے اپنے کمروں میں تھے مگر اونچی آواز میں بجتے ڈیک نے ایک ہنگامہ سا مچا رکھا تھا۔

یہ کون تھا جو اتنی اونچی آواز میں اس وقت گانے سن رہا تھا؟ اسے تعجب ہوا اور آواز کی صورت سر پر برستے ہتھوڑوں سے پریشانی بھی۔ تب ہی وہ والیوم ذرا کم کرنے کی درخواست کرنے کی غرض سے آواز کے منبع کی جانب بڑھا۔

آواز ''گیسٹ روم'' سے آ رہی تھی!

سو وہ دو چار قدم چل کر دروازے کے نزدیک پہنچا اور اسی پل ایک جی کو متلانے پر مجبور کرتی ناگوار سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔

''آخر یہ اندر کون ہے؟ اور کر کیا رہا ہے؟'' اس نے تشویش و تناؤ کی ملی جلی سی کیفیت کے زیر اثر دو چار مرتبہ دروازے پر دھیرے سے دستک دی۔ جیسے غالباً سنا ہی نہ جا سکا یا پھر کیف و سرور کے ریلے میں بہتے دانستہ نظر انداز کر دیا گیا، کیا معلوم؟ پر جو بھی تھا۔ چوتھی دستک کے بعد عیسیٰ نے اپنی چھٹی حس کے مسلسل اشاروں کو سمجھتے ہوئے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا اور..... دوسرے ہی پل چرس دام الخبائث کے نشے میں ڈولتا ایک حسینہ کے ساتھ مصروف سہراب نگاہ کے سامنے تھا۔

''بے غیرت'' اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا، اپنے گھر کے تقدس کی اس درجہ پامالی دیکھ کر سو اس نے ہر

مصلحت بالائے طاق رکھتے ہوئے جھٹ سے اس کا گریبان پکڑ لیا اور تابڑ توڑ مکوں سے اس کی تواضع کرتے ہوئے اسے کمرے سے باہر گھسیٹ لایا۔

''میرے والد نے اس لیے بنایا تھا یہ گھر کہ تیرے جیسے خبیث یہاں آ کر عیاشیاں کریں۔''

''ہائے اللہ۔'' شور شرابا سن کر سوئی جاگی سی رینا اپنے کمرے سے افتاں وخیزاں برآمد ہوئی۔ ''کیا ہوا؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''پوچھیں اپنے بے حیا بھانجے سے۔'' اس کے منہ سے کف اڑ رہا تھا اور چہرہ اس قدر لہو رنگ تھا کہ رینا سہم گئی۔

''یہ کیا کر رہا تھا اندر اور خیر آپ کیا پوچھیں گی؟'' وہ اچانک چونک کر بولا۔ ''آپ تو یقیناً سب جانتی ہی ہوں گی وگرنہ یہ کسی کو یہاں تک کیسے لے کر آ سکتا تھا؟''

''دیکھو عیسیٰ؟ میری بات سنو۔'' یقیناً پھنسی تو وہ بہت بری تھی سو جلدی سے جوڑ توڑ کرنے کے بعد اسے پچکارتے لہجے میں بولی۔

''کچھ نہیں سننا مجھے۔'' وہ بھڑکا۔ ''آج کے بعد اگر یہ اس گھر میں نظر آیا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

☆☆☆

''بی۔ذی کو مطلع کر دو کہ میں آیا ہوں۔''

اک آگ سی تھی کہ جس نے اس کا تن من برسوں سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا مگر وہ پھر بھی خاکستر ہو کر نہ دیتا تھا۔

اور کیوں ہو کر نہ دیتا تھا؟

اس کا بڑا بھرپور جواب تین روز قبل اسے آتش کدے میں مل چکا تھا۔ اور کچھ یوں ملا تھا کہ اب وہ ''وہ'' نہیں رہا تھا جیسا کہ ''اس قیامت'' سے پیش تر ہوا کرتا تھا۔ ہاں وہ جس کے مل جانے کی امید کے موہوم سے خیال کا شائبہ تک دم توڑ چکا تھا، اس آس کا معا مجسم سامنے آ جانا گویا ایک طرح کی قیامت ہی تو تھا یا شاید نہیں کہ بروز حشر تو ابن آدم کو اس کے ہر سوال کا جواب مل جانے کی نوید سنائی گئی ہے جب کہ یہاں تو یہ تھا کہ اس کا ہر سوال تا حال تشنہ تھا۔

اور یہی تشنگی اس کی روح کو بے چین کیے ہوئے تھی۔

ہر چند کہ وہ اب دوبارہ کبھی آتش کدے کا رخ نہیں کرنا چاہتا تھا مگر واقعہ کچھ یوں تھا کہ اس کے چاہنے سے آج تک کچھ ہوا تھا جو اب ہو جاتا؟ سو آج گویا کسی مقناطیسی قوت نے اس کے بے سمت اٹھتے قدموں کا رخ آپ ہی آپ آتش کدے کی جانب موڑ دیا تھا۔

اور اس وقت وہ کسی معمول کی طرح آتش کدے کے مہمان خانے میں بیٹھا اس کے لیے پانی لے کر آنے والی رضیہ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ بالعموم وہ اسی طرح کسی کے بھی ذریعے اپنی آمد کی اطلاع بی زی تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ پھر وہ کچھ دیر بعد اسے کمرے میں طلب کر لیا کرتی یا پھر اب بھی کبھار باہر بھی آ بیٹھتی۔ مگر آج ان دونوں صورتوں میں سے ''تیسری'' نے ظاہر ہونا تھا۔ تب ہی رضیہ کڑوا سا منہ بنا کر بولی۔

''بڑی جی وہ تو گھر میں ہیں نہیں۔''

''گھر میں نہیں ہیں؟'' وہ جو پانی کا گھونٹ بھر رہا تھا، چونک کر پوچھا۔

''تو پھر کہاں گئیں؟''

''وہ جو ان کی نوکرانی نہیں ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں چبا چبا کر بتایا۔ ''اسی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی

ہوئی ہیں۔"

"نوکرانی؟" اس نے ذرا الجھ کر پوچھا۔ "کون نوکرانی؟"

"ارے وہی کم بخت۔" رضیہ کے ہاتھ تو گویا سنہرا موقع لگ گیا تھا اس کی برائی کا سو وہ بے دھڑک شروع ہو گئی۔

"جو ہر وقت میڈم کے ساتھ چپکی ہوئی ہوتی ہے۔ ان کے ساتھ جو مجبوری ہے وہ اللہ توبہ توبہ اپنی جگہ۔" اس نے زور زور سے اپنے گال پیٹے۔ "مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے جان بوجھ کر انہیں اپنا محتاج بنا رکھا ہے۔ غسل خانے تک تو وہ لے کر جاتی ہے انہیں۔"

"کک..... کیا ہوا ہے اسے؟" ہاں اس نے دیکھا ہی تھا، بی۔ زی کی ذاتی خدمت گزار کو مگر تب ظاہر ہے کہ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا "اصل" کیا ہے اور اب جب کہ وہ واقف ہو گیا تھا تو۔

تو یہ تفصیلات جان کرنا جانے کیوں وہ کچھ دیر تو چپ کا چاپ رہ گیا۔ پھر چند ثانیے بعد بدقت تمام خود کو گویائی پر آمادہ کرتے ہوئے بولا تھا۔

"معمولی سا بخار ہو گیا ہے۔" رضیہ نے طنز آمیز، زہر خند سے لہجے میں بتایا۔

"پر وہ تو ایسے ڈرامے کر رہی ہے جیسے کہ موت آنے والی ہو اور میڈم کو دیکھو۔"

"کب تک واپس آنے کا کہہ گئی ہیں؟" اس نے رضیہ کی بات درمیان سے قطع کرتے ہوئے اضطرار سے پوچھا تو رضیہ نے اس بار بہت برا سا منہ بنا کر اسے دیکھا۔ پھر کٹ کھنے سے لہجے میں بولی۔

"مجھے کچھ نہیں پتا کہ وہ کب واپس آئیں گی کب نہیں۔ آپ اگر یہاں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ اونہہ۔"

وہ کہہ کر ناگوار سے انداز سے گردن جھٹکتے ہوئے چلتی بنی۔

اور وہ۔

اس نے یہیں بیٹھ کر بی۔ زی یا شاید وری کی واپسی کا انتظار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

"تو آج آپ نے بتا دیا اپنے گھر پر؟"

شریفہ سے بات کے بعد تو کیا کھانا اور کہاں کا کھانا..... وہ فون رکھ کر پہروں گم صم رہے اور اس نے عباد کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے انہیں یوں ہی رہنے دیا۔ کہ بھلے وہ رشتہ ازدواج میں محض ہفتہ بھر پہلے ہی بندھے ہوں، مگر مزاج آشنا تھی۔ عباد سے چار برس بڑی میمونہ مرزا ..... دفتر میں ان کی معاون تھی۔ وہ فربہی مائل، گہری سانولی مگر گول پرکشش چہرے والی اڑتیس کے ہندسے کو چھوتی مہربان، دل کش مسکراہٹ والی لڑکی یا عورت دس برس قبل شمالی ہند سے رخصت ہو کر یہاں آئی تھی۔ شوہر اس کا یہاں ایک مارٹ میں ملازم تھا مگر خواب اس کے بڑے تھے۔ سو وہ موقع ملتے ہی پہلی فرصت میں یورپ سدھارا۔

وہ واپس گھر جانا چاہتی تھی پر اس کا حکم تھا کہ وہ معاشی طور پر اس کا ساتھ دینے کے لیے یہیں رہ کر نوکری کرے۔ تاکہ وہ دونوں جلد از جلد یورپ میں ایک بہتر زندگی کی شروعات کر سکیں۔ وہ فطری طور پر سادہ اور فرماں بردار تھی۔ سو مجازی خدا کا حکم بجالائی اور اپنی جوانی کے سنہری سال محنت کی بھٹی میں اس امید پر جھونک دیے کہ ایک نہ ایک دن اسے منزل ملے گی۔

منزل تو کیا ملتی البتہ ایک روز ڈاک سے اسے طلاق نامہ بمعہ خط ضرور مل گیا۔ خط میں روایتی مجبوریوں کا

ذکر تھا اور گرین کارڈ کے حصول کے لیے وہیں شادی کرنے کی اطلاع بھی۔ وہی دن تھے کہ جب عباد اس کے دفتر میں نیا نیا تعینات ہوا تھا۔ دل اور پندار کا ٹوٹ کر پاش پاش ہو جانا اپنی جگہ مگر وہ اپنی روزی کو لات نہیں مار سکتی تھی سو دفتر میں اپنے نجی حالات کے سبب غلطیوں پر غلطیاں کرتی رہی۔ اور یقیناً وہ بھی اپنے نجی حالات ہی کے باعث دیگر افسران کے برعکس اسے رعایت پر رعایت دیے گئے۔ وہ وقت اس کے لیے کڑا تھا جو عباد کی مہربانی کے باعث نسبتاً آسانی سے گزر گیا۔

وہ ان کی احسان مند تھی۔ ان کے مابین روزانہ کے ساتھ کے سبب ایک دوستانہ فضا کے علاوہ احترام کا رشتہ بھی قائم ہو چکا تھا۔

اور ان دنوں وریٰ کے اس بھری دنیا میں کہیں ''گم'' ہو جانے کی خبر انہیں ملی اور اس خبر نے انہیں اس بری طرح توڑا تھا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ دنوں آفس سے غیر حاضر رہے۔ نوکری کا برقرار رہنا یا نہ رہنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا سو دفتر اطلاع بھی نہ کی۔ تب ایک روز میمونہ گھبرا کر ان کے چھوٹے سے فلیٹ پر چلی آئی۔ اور تب جا کر اسے صورت حال کا علم ہوا۔ قصہ مختصر اسے احسان چکانے کا اچھا موقع ملا تھا۔ سو وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھائے گئی مگر اس کے باوجود اس سے ''آگے'' اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ ذہن گیا ہی نہیں اور پھر ایک روز بہت اچانک بالکل ہی غیر متوقع طور پر عباد نے اس سے سوال پوچھا تھا۔

''کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی؟''

تب وہ ہکا بکا رہ گئی۔ حیرت و تعجب جب کم ہوا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔ مگر خود آگاہ تھی سو پس و پیش سے کام لیا۔ مگر عباد نے تو جیسے ضد ہی پکڑ لی تھی۔ سو کئی مراحل کے بعد بالآخر وہ ان کے نکاح میں تھی۔

اور آج وہ اس کے بارے میں شریفہ کو آگاہ کر چکے تھے۔

''جی!'' عباد جو سر جھکائے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے اس کی لوچ دار آواز پر سر اٹھا کر اس کا مسخ چہرہ دیکھا۔

''بتا دیا!''

''کچھ کہہ رہی تھیں؟'' اس کی چمک دار آنکھوں سے روایتی خوف مترشح تھا۔ جسے دیکھ کر وہ اٹھے اور بہت متانت سے اس کا دایاں گال تھپتھپا کر بولے۔

''وہ کچھ بھی کہیں، اب آپ میری بیوی ہیں۔ سو ہر خدشہ دل سے نکال دیں۔''

☆☆☆

''یہ کیا سن رہا ہوں میں؟ تم نے چرس پینا شروع کر دی ہے؟''

اس کا تنفس تیز ہو گیا تھا، سو وہ یک دم ہی فٹ پاتھ سے اٹھا اور خالی رفتار سے چل دیا..... اور اس بار اس کا رخ پورے اعتماد سے گھر ہی کی جانب تھا کہ اسے ابھی ابھی ہی ادراک ہوا تھا کہ وہ اس جنگ کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ چھوڑ دینے کا مطلب ہر اس الزام کا اقرار تھا کہ جو آج تک اس پر لگائے جاتے رہے تھے۔ قصوروار بلکہ گناہ گار بھانجا تھا، مگر رینا نے اسے بالالفاظ دیگر خود کو بچانے کے لیے اس خوبی سے کہانی گھڑی کہ ہمیشہ کی طرح اسے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا اور یوں اس وقت شاکر جو عموماً بہت حلاوت اور شائستگی سے بہت محتاط الفاظ میں گفتگو کیا کرتے تھے محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اس پر گرج رہے تھے۔

''میں نے؟'' وہ یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ ''یہ کس نے بتایا آپ کو؟''

''عامر ہی نے بہت پریشانی سے بتایا ہے۔'' وہ بگڑ کر بولے۔ ''اور کون بتائے گا؟ والدین کے گزر جانے کا

یہ مطلب نہیں کہ تم جو چاہے وہ روش اختیار کرلو۔"
"آپ میری وضاحت سنیں گے یا فیصلہ کر چکے ہیں؟" اس نے ان کے الفاظ پر بے تاثر لہجے میں پوچھا تو وہ سخت خفا ہو گئے۔
"بڑے بھائی سے بدتمیزی کرو گے؟"
"بدتمیزی نہیں، صرف سوال کر رہا ہوں کہ کیا صفائی کی گنجائش ہے یا آپ مجھ پر لگائے گئے اس گھناؤنے الزام پر یقین کر چکے ہیں؟"
"میری بات ایک طرف رکھو اور اپنی بتاؤ۔" وہ بولے۔ "کیا صفائی دینا چاہتے ہو؟"
"دیکھیے بھائی جان۔" ان کے پوچھنے پر وہ چند ثانیے توقف کے بعد ایک گہری سانس لے کر گویا بڑے بھائی کے روبرو مناسب ترین الفاظ کا چناؤ کر کے کہنا شروع ہوا۔ "بات دراصل کچھ یہ ہوئی کہ۔"
"حد ہوتی ہے کسی بات کی۔" عیسٰی کی زبانی سہراب والا واقعہ سماعت کر کے ہی وہ سخت برہمی سے بولے۔
"یہ تم دونوں آپس میں کیا ٹیلیم ٹیم کھیل رہے ہو۔ ماں باپ کی عزت ہی کا خیال کرلو۔ میرے بھی فیملی پرابلم ہیں۔ مجھے مت پریشان کرو۔ اور تم نے اب تک یونیورسٹی میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟ کن چکروں میں پڑ گئے گھریلو سیاست سے باہر نکلو، کیریئر بناؤ۔ ادھر ادھر دھیان مت دو۔"
انہوں نے ترشی سے ساری کی ساری اچھی اچھی روایتی نصائح کے دفتر کھول کر فون بند کر دیا تھا۔
تب عیسٰی نے بھی بہت آہستگی سے چونگا واپس رکھا اور عین اسی لمحے اس نے اچھی طرح یہ جان لیا تھا کہ یہ واقعی صرف اور صرف اس کی جنگ تھی۔ اور اسے اس نے تن تنہا ہی لڑنا تھا۔
☆☆☆
"ہائے میں یہاں اس کے لیے ہیرے تلاشتی رہ گئی اور وہ وہاں خود سے بڑی کالی بھجنگ سے بیاہ رچا کر بیٹھ گیا۔ ہائے۔"
شریفہ یہ اطلاع پا کر غش پہ غش کھانے کے بعد اب سر پر ہاتھ رکھے روئے چلی جاتی تھیں۔ یہ کیا ہوا، کیوں ہوا، کیسے ہوا، انہیں تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ زندگی کی بساط پر اب تک انہوں نے صرف شہ ہی شہ دیکھی تھی۔ یہ پہلی مات تھی اور ایسی بھرپور مات تھی کہ دل کو کسی طور قرار آ ہی نہیں پا رہا تھا۔
"ہائے اسے فون تو کریں۔ پوچھیں تو سہی کہ آخر ایسی کیا افتاد آن پڑی تھی جو اس کالے کوے سے ہاتھ سیاہ کر بیٹھا۔"
وہ اپنے بستر پر لوٹنیاں کھاتی ہوئی، سامنے صوفے پر بہت چپ اور خاموش سے بیٹھے شریف احمد سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھیں۔ پر اس سوال کا جواب ان کے پاس نہیں۔ بلکہ کمرے کے داخلی دروازے کے سامنے، سینے پر ہاتھ باندھے چہرے پر طیش آمیز زخمی مسکراہٹ لیے کھڑے مفتاح کے پاس تھا۔ سو وہ بہت چبا چبا کر جتاتے لہجے میں بولا۔
"ہیرا تو ان سے آپ نے چھین لیا تھا ماما! سو اب یہی ان کا مقدر تھا۔"
"دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں آپ۔" وہ بلبلا کر شریف احمد کے سامنے فریادی ہوئیں۔ "بدبخت کیسا تاک تاک کر طنز مار رہا ہے مجھے۔ دل پھٹ رہا ہے میرا۔ اسے ذرا احساس نہیں۔"
"آپ کا بیٹا ہوں نا۔" وہ اداسی سے ہنسا۔ "سو مجھے کسی کے دل کا احساس کہاں ہو سکتا ہے۔"
"نکل......" اچانک ہی شریفہ نے پاس پڑا تکیہ بڑے غصے سے اس کی جانب اچھالا۔ "دفع ہو جا یہاں سے۔ دو بول دلا سے کے تو بولے نہیں جا رہے بے غیرت سے۔ الٹا یہاں کھڑا میرے زخموں پر نمک چھڑک رہا

ہے۔"

"نمک نہیں چھڑک رہا۔" وہ پاس آ گرنے والے تکیے کو ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ "آپ کو احساس دلانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کیا کر چکی ہیں آپ؟"

"کیا؟" وہ بھر گئیں۔ "کیا کیا ہے میں نے؟"

"جب آپ کو یہی نہیں پتا کہ کیا کیا ہے آپ نے تو بس پھر رہنے ہی دیں۔"

"نہیں اب بتانا مجھے۔" وہ دیوانگی سے چیخیں۔ "بول، کیا کیا ہے میں نے؟ ارے اگر اپنے بچوں کا بھلا چاہا تو کیا غلط کر دیا؟"

"اپنے بچوں کی بھلائی کی خاطر دوسروں کی اولاد کا برا نہیں کرتے مام۔" وہ بہت معمولی سے لہجے میں بولا تھا۔ شریفہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

"اپنی دادی بیگم کی زبان بولتا ہے بے غیرت۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مفتاح کو باقاعدہ دھکے دے کر کمرے سے نکالتے ہوئے بولیں۔ "نکل..... چلا جا یہاں سے..... تو بھی دفع ہو جانیں چاہیے مجھے ایسی بے شرم اولاد جسے ماں ہی کا احساس نہیں۔"

اور مفتاح، جس کے پاس انہیں کہنے کے لیے ابھی بہت کچھ تھا۔ ضبط کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

"بھاڑ میں جاؤ، مر جاؤ سارے۔ چھوڑ دو مجھے میرے حال پر، میں تو ہوں ہی بری۔ ہاں ہاں بہت بری۔"

وہ اب وہیں کھڑی زور زور سے چلا رہی تھیں اور ان کی آواز پورے گوشہ عافیت میں گونجتی تھی۔

جب کہ شریف احمد وہ اب بھی اسی زاویے سے گم صم بیٹھے تھے۔

☆☆☆

"اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟"

وہ آتش کدے میں ان کا منتظر بیٹھا رہا، یہاں تک کہ دھوپ دیواروں پر چڑھتے چڑھتے معدوم ہو گئی۔

تب بی۔ ذی تو نہیں مگر اس کا فون آیا۔ وہ رضیہ کو اسپتال طلب کر رہی تھی کہ کوئی تو ہو جو "خولہ" کے ساتھ اسپتال میں رہ سکے کہ اس کے بخار کی تبدیج بگڑتی صورت حال نے ڈاکٹر کو اسے داخل کر لینے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور بی ذی خواہ کتنی بھی فعال کیوں نہ ہو گئی ہو، اس کی ہمت اب جواب دے رہی تھی کہ وہ تو خود بڑی حد تک اس پر انحصار کرتی تھی تو اس کی تیمارداری بھلا کیسے کر سکتی تھی۔ سو اسے کسی مددگار کی ضرورت تھی۔

لہٰذا اس نے رضیہ سے اس ضمن میں مدد چاہی۔ وہ تو پہلے ہی یہاں خود پر "خولہ" کی بیماری کے سبب پڑ جانے والے زائد کاموں کے سبب بھری بیٹھی تھی اور پھر معاملہ بھی اس کا تھا کہ جس سے اسے اب ذاتی پرخاش بلکہ دشمنی ہو چکی تھی سو اس نے تو اپنے بچوں کا بہانا کر کے فوراً سے پیش تر انکار کر دیا اور جھٹ پٹ آتش کدے سے روانگی کی تیاری پکڑ کر جاتے جاتے عیسیٰ کو بھی اسی بابت اطلاع دے گئی کہ ان کی واپسی تو اب مشکل ہے چنانچہ وہ اپنی راہ لے۔

اور اپنی راہ لینا کیا اسی قدر سہل تھا؟

نہیں ہرگز نہیں۔ سو وہ لمحوں میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے۔ وہیں سے بی۔ ذی کو فون کر کے اسپتال کی تفصیلات لینے کے بعد کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچ چکا تھا۔

"وہ ٹھیک نہیں ہے شرر۔" وریٰ کو احتیاط کے پیش نظر انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ اور وہ دونوں اس وقت وارڈ سے ملحقہ انتظار گاہ میں آمنے سامنے موجود تھے۔ بی ذی کے ستے ہوئے چہرے پر بے

اندازہ تھکاوٹ اور "کچھ کھو دینے" کے احساس کا خوف رقم تھا۔
اور وہ پریشان سے لہجے میں جواباً اسے بتا رہی تھی۔
"اس کا ٹمپریچر کم نہیں ہو رہا۔ ڈاکٹرز کے مطابق یہ تشویش ناک بات ہے۔ اس کے مختلف ٹیسٹ کیے جا چکے ہیں۔ رپورٹس کل تک آنے کی امید ہے۔ رپورٹس دیکھ کر ہی ڈاکٹر صحیح طرح سے بتا پائے گا کہ دراصل اسے ہوا کیا ہے؟"
اور وہ شاید رپورٹس دیکھے بنا بھی اندازہ کر چکا تھا کہ درحقیقت اسے ہوا کیا ہے؟ تب ہی بے کل سے لہجے میں معاً سوال کیا۔
"وہ پہلے بھی کبھی اس طرح سے بیمار پڑی ہے؟"
"وہ اس حادثے کے سبب کافی عرصہ بیمار رہی تو ہے۔" بی ذی پر سوچ سے لہجے میں بولی تو وہ بے طرح چونکا۔
"حادثے کے سبب؟" اس نے پوچھا۔ "کون سے حادثے کی بات کر رہی ہو؟"
"کچھ عرصے پہلے کی بات ہے۔" اسے "شرر" پر بھروسا تھا سو وہ یک لحظہ توقف کے بعد دھیرے دھیرے اسے بتائے گئی کہ کن حالات میں وہ اسے ملی تھی اور پھر بعد ازاں کن محرکات کی بنا پر اسے یہیں رکھ لیا گیا اور پھر اب..... اب تو خیر بات ہی دوسری ہو گئی تھی کہ اس کی بے لوث خدمت گزاری بی۔ ذی کے دل میں اس کا ایک علیحدہ مقام بنا چکی تھی۔
"کیا تمہیں کبھی اس کا ماضی جاننے کا خیال نہیں آیا؟" وہ چپ ہوئی تو بہت دیر بعد وہ یوں بولا گویا کہیں بہت دور کھڑا خود کو بولتے سن رہا ہو۔
"سچ کہوں تو نہیں۔" وہ برملا بولی۔ "اور پھر اس کا ماضی جان کر مجھے کرنا بھی کیا تھا؟ میری حالت تم دیکھ ہی رہے ہو۔ وہ فیم، وہ اسٹارڈم وہ فین فالوونگ سب مجھے چھوڑ کر جا چکے۔ بس اب تو یہی میری ساتھی ہے یا پھر تم..... تم میرے ساتھی ہو نا شرر؟"
اس کے استفسار میں سوال سے بڑھ کر کوئی احساس تھا۔ جسے وہ فی الوقت سمجھ ہی نہ سکا کہ ذہن تو اندر بیڈ نمبر چار کی مریضہ کی جانب لگا تھا۔ تب ہی سادگی سے بولا۔
"ہاں بی۔ ذی ہم ساتھ ہیں۔ اب تم گھر جا کر آرام کرو، میں ہوں یہاں۔"
"اس کا خیال رکھنا شرر....." وہ جانا نہیں چاہتی تھی مگر جانے پر مجبور تھی سو افسردگی سے بولی۔ "یہ ساری ساری رات سجدے میں گری روتی رہتی تھی۔ کوئی غم لگا ہے اسے..... مجھے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ شاید کچھ کہہ سن لینے سے اس کا دل ہلکا ہو جاتا اور آج وہ یوں بے حال نہ پڑی ہوتی۔ خیر اب جب وہ واپس گھر آئے گی تو میں اس سے ضرور پوچھوں گی۔"
ایک ارادہ وہ کر رہی تھی اور ایک تقدیر.....
اور یہ بتانے کی حاجت تو نہیں کہ کس کا ارادہ پورا ہونا تھا۔!!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

ملیا سمیون

چھٹ یاراں

"آگیا میرا ببر شیر......" بابا نور محمد کی پرجوش آواز پر ان تینوں نے چونک کر دیکھا۔ ببر شیر کی لات سے گیٹ کھلا تھا۔ روٹی پکاتی فاطمہ سہم کر اندر بھاگی کیونکہ ببر شیر کا رخ اس کی طرف تھا۔

اس نے تھوڑی ہی دیر میں سارے صحن کا ستیاناس کردیا۔ ابھی پرسوں ہی تو ان تینوں نے سارے صحن میں گارے اور مٹی کا لیپ کیا تھا۔

"یہ جمالا کدھر ہے؟...... آکے سنبھالے اس بلا کو...... ہائے کم بخت نے گھڑا بھی توڑ دیا...... آج سیدھا کروں گی جمالے کو...... نکمے (فضول) شوق......" ہمیرا کی بات پر بابا نور محمد کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔

اسی وقت جمالا ہانپتا ہوا آیا...... پسینے میں تربتر، کرتا پھٹا ہوا اور ناک سے رستا خون، ہمیرا کے دل پر ہاتھ پڑا فاطمہ بھی دوڑتی آئی۔

"یہ چوٹ کیسے لگی؟" وہ ہمیرا کے سوال کو نظر انداز کرتا اپنے بیل کی طرف بڑھا اور اسے نتھ سے پکڑ کر گھر کے اس حصے کی طرف لے گیا۔ جو انہوں نے جانوروں کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ ادھر گنتی کے چند جانور بندھے ہوئے تھے۔ اس نے بیل کو کھرلی کے ساتھ متصل لوہے کے کنڈے سے مضبوطی سے باندھا، جھاڑو سے کھرلی صاف کی اور کھاری میں پڑے چارے کو کھرلی میں ڈال دیا۔

"دس تاریخ کو داندوں (بیلوں) کا جلسہ ہے ساتھ والے پنڈ۔" وہ نلکے سے ہاتھ منہ دھو کر آیا تو بابا نے اطلاع دی۔

"بابا! میں سوچ رہا ہوں کہ اس جلسے میں اپنے ببر شیر (بیل کا نام) کو بھی دوڑاتا ہوں۔ اس کی ٹور دیکھ کر شریکوں کے دلوں میں آگ لگ جاتی ہے۔"

بیل دوڑ ان کا من پسند موضوع گفتگو تھا۔ وہ بابا کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھا کہ دفعتاً اس کی نگاہ امامہ پر پڑی۔ وہ ٹوٹے گھڑے کی ٹھکریاں اکٹھی کرتی تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی۔ نگاہیں ملتے ہی سرعت سے پلٹ گئی۔ اس کی شہد رنگ آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں۔

"اسے کیا ہوا؟" جمالا متحیر تھا۔

☆☆☆

عمیرہ پورے پانچ ماہ بعد میکے آئی تھی۔ خوشی سے اماں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ سب ایکدم اس کی خاطر مدارت میں لگ گئے۔ چھوٹا بھاگ کر نکڑ والی دوکان سے بوتل لے آیا۔ اماں نے سب بچوں کو دوڑا کر دیسی مرغا پکڑوایا کہ جا کر جمالے سے ذبح کرواؤں۔

"اماں! بھا جمالا کہہ رہا ہے کہ لت (لیگ پیس) شام کو بھجوا دینا۔" جواباً اماں بڑبڑا کر رہ گئیں۔ عمیرہ ہنس دی۔

"آپ سب بس بھی کرو اب...... میں کوئی مہمان تھوڑی ہوں پورا ہفتہ رکوں گی ادھر...... کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔"

"عمیرہ! تو خوش تو ہے ناں؟" اماں نے نواسے کو گود میں لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"ہاں اماں! میں بہت خوش ہوں، ماموں، ممانی اور منیب بھی میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ پتا ہے منیب نے علی کی پیدائش پر مجھے یہ سونے کی چوڑیاں دی ہیں۔" اماں کی نگاہیں جگر جگر کرتی چوڑیوں پر اٹک گئیں۔

عمیرہ اور امامہ کے اکلوتے ماموں چند سال پہلے شہر شفٹ ہوگئے تھے۔ عمیرہ کی شادی تقریباً ڈیڑھ سال قبل اس کے ماموں زاد منیب سے خوب دھوم

pklibrary.com

دھام سے ہوئی تھی۔

"واہ..... اچھا یہ بتا تیری مامی نے سراج کے بارے میں کیا سوچا؟" اماں نے اس کے دیور کا نام لیا۔

"مامی اس کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں..... چھوڑو اماں کوئی اور بات کرو، ادھر گاؤں میں سب ٹھیک ہیں؟"

☆☆☆

گاؤں میں گندم کی کٹائی شروع ہوگئی تھی۔ جن لوگوں کی فصل اچھی ہوئی تھی انہوں نے ساری فصل مشین کی مدد سے کٹوالی تھی۔ اب جمالے کی قسمت کہ اس کی گندم کا قد ایک ڈیڑھ فٹ سے بڑھا ہی نہیں وہ اگر مشین سے کٹواتا تو صرف سٹہ اترنا تھا۔ سارا بھوسہ ضائع چلا جاتا۔

جمالا، فاطمہ اور سمیرا ترکے ہی درانتیاں لے کر کھیتوں کی طرف چلے گئے تھے۔

"اماں! میں بھی چلی جاؤں فاطمہ لوگوں کی مدد کرنے.....؟ میں کام بھی سیکھ جاؤں گی۔" امامہ نے اجازت مانگی۔

"تجھے بہت شوق ہو رہا ہے دھوپ میں جلنے کا....." اماں نے طنزاً کہا۔

اماں نے اپنے کھیتوں کی ساری گندم بھوسے کے ٹھیکے (اس ٹھیکے میں مزدور سارا کام کرکے اپنی مزدوری کے طور پر صرف بھوسہ لے کر جاتے ہیں) پر کٹوائی تھی انہوں نے کبھی اپنی بیٹیوں کو کھیتوں پر کام کرنے نہیں بھیجا تھا۔

"رنگت پہلے ہی لاجواب ہے اوپر سے دھوپ میں جلو تو مزید کباب بن جاؤ گی۔" اماں کی گل افشانی پہ اس کی جوت بجھ گئی۔

عیرہ کو بھی برا لگا۔ عیرہ کی کھلتی ہوئی رنگت کے برعکس امامہ کی رنگت سانولی تھی مگر اس کی جھیل جیسی آنکھوں کے سامنے سب کچھ پس پردہ چلا جاتا تھا۔

"اماں! جانے دیں اسے..... گرمی سے گھبرا کر جلد ہی لوٹ آئے گی۔" عیرہ نے اس کی طرف داری کی۔

"ٹھیک ہے، جاؤ..... پر جلدی لوٹ آنا..... اور یہ صورت کیوں اتر گئی ہے۔ نکلی تمہارے ہی بھلے کے لیے کہتی ہوں۔" اماں کو بھی شاید اپنے الفاظ کی بدصورتی کا احساس ہو گیا تھا۔

امامہ اجازت ملتے ہی مسرور سی باہر نکل گئی اور گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے سمیرا لوگوں کے پاس جا رکی۔ وہ لوگ پہلے تو اسے دیکھ کر حیران ہوئے پھر فاطمہ نے اسے گندم کی گڈیاں باندھنا سکھائیں اور تھوڑی دیر بعد وہ بھی اسی منظر کا حصہ بن گئی۔

☆☆☆

عیرہ چند دنوں بعد واپس اپنے گھر چلی گئی تھی مگر اماں کا ذہن سونے کی چوڑیوں میں ایسا اٹکا کہ اب انہیں امامہ کا جمالے کے گھر بار بار چکر لگانا ناگوار گزرنے لگا۔ اس کا اظہار انہوں نے امامہ کے سامنے کیا تو وہ حق دق رہ گئی۔

فاطمہ اور سمیرا اس کے مرحوم چاچے کی بیٹیاں تھیں اور بہترین سہیلیاں بھی، ان کے بغیر تو اس کی روٹی ہضم نہیں ہوتی تھی۔

"امامہ! کیوں نہ ہم شہر جا کر عیرہ سے مل آئیں۔ علی بہت یاد آ رہا ہے۔" امامہ کو حیرت ہوئی یہ اچانک ان کو شہر جانے کا خیال کیسے آ گیا۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو عیرہ لوٹ کر گئی تھی۔

"ٹھیک ہے اماں! جیسے آپ کہیں۔"

اگلی صبح اماں، امامہ اور چھوٹے کو ساتھ لے کر بس میں سوار ہو گئیں۔ ماموں ان کو دیکھ کر اتنے خوش ہوئے مگر مامی کا رویہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ منیب بھائی بازار سے کیک اور چکن رول لے آئے جو عیرہ نے چائے کے ساتھ سب کو پیش کیے۔

"کھاؤ، کھاؤ تم لوگوں نے کہاں دیکھی ہوں گی ایسی چیزیں۔" امامہ کا بڑھتا ہاتھ ادھر ہی رک گیا۔

"گھر آئے مہمانوں سے کوئی ایسے بات کرتا ہے۔" اسے مامی کا انداز برا لگا۔

کافی دیر بعد جب ماموں اور منیب بھائی کسی کام سے باہر نکلے تو عیرہ نے موقع ملتے ہی انہیں اپنے کمرے میں بلا کر بتایا۔

"اماں! ماموں سراج کے لیے امامہ کا رشتہ مانگنا چاہتے ہیں مگر مامی اس بات کے سخت خلاف ہیں گھر میں

عجیب تناؤ پھیلا ہے ہر وقت، آپ کو اس طرح بنا بتائے نہیں آنا چاہیے تھا۔" کہتے ہی اس نے نظریں چرا لیں۔
اگلی صبح ماموں کے لاکھ روکنے کے باوجود اماں ان کو لے کر واپس لوٹ آئیں۔

☆☆☆

قریبی گاؤں میں بیل دوڑ کی تقریب منعقد ہوئی تھی۔ جمالا پورے زور شور سے اپنے بیل کی سیوا کرنے میں مگن تھا۔ ابھی بھی جمالا اپنے بیل کو نہلانے کے بعد تولیے سے صاف کر رہا تھا کہ اپنے گھر کی چھت سے یہ منظر دیکھتی امامہ چڑ سی گئی۔ وہ اماں کی باتوں کو سوچ سوچ کر کڑھ رہی تھی ان کو لگتا تھا کہ ماموں بہت جلد مامی کو منا کر امامہ کا رشتہ لینے آئیں گے اور سراج سے بیاہ کے بعد امامہ کی قسمت کھل جائے گی۔
امامہ چاہتے ہوئے بھی ان کو نہ بتا پائی تھی کہ ہوش سنبھالتے ہی اس کے دل نے صرف جمالے کے نام پر دھڑکنا سیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں نے صرف جمالے کے خواب دیکھے تھے۔ وہ ان خوابوں کو کیسے نوچ کر پھینک سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔
جمالے کو اپنے بیل کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا تھا۔ وہ جس شخص کے لیے اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا سکتی تھی وہ ہی اس کے جذبات سے بے خبر تھا۔
وہ اپنے ہی خیالوں میں غلطاں بے آواز آنسو بہائے جا رہی تھی۔ جب فاطمہ، اچانک وہاں آئی اور اس کے آنسوؤں کا سبب دریافت کیا اس نے فاطمہ کو اپنا ہمراز بنا لیا۔
"دل کی باتیں دل میں ہی دبائے بیٹھی ہو بھا جمالے کو بھی نہیں بتایا۔"
"اظہار محبت میں پہل کرنے والی لڑکیاں بے حیا کہلاتی ہیں۔ ادھر اماں مجھے کسی اور سے بیاہ دیں گی ادھر تمہارا "بھا" بیلوں کی پشت پر تولیے رگڑتا رہ جائے گا۔" اس نے جل کر کہا تو فاطمہ ہنسی۔
"اچھا اب نیچے چلو، میں کچھ کرتی ہوں۔"

☆☆☆

بابا نور محمد آج اپنے لاڈلے پوتے کا رشتہ لے کر دیوار کے اس پار اپنی ہی پوتی کے گھر گئے تھے۔ ادھر ساتھ والے پنڈ میں بیل دوڑ شروع ہو رہی تھی۔
جمالا اپنے ببر شیر کو لے کر یاروں کے ساتھ نکلا تو بابا کو جلسہ میں جلدی پہنچنے کی خاص تاکید کر کے نکلا تھا۔
ادھر گھر میں فاطمہ اور سمیرا بڑی سی کڑاہی میں سوجی کا حلوہ پکا رہی تھیں۔ آج ان کے بھرا کا بیل دوڑ جیت کر آنے والا تھا اس کے سب یاروں نے تماشے سے واپسی پر ادھر ہی روٹی کھانی تھی۔ ساتھ والے چولہے پر بکرے کا گوشت بھی پک رہا تھا۔
فاطمہ کو جمالے کے فون کا انتظار تھا تاکہ وہ بندوں کے حساب روٹیاں بھی پکا سکے۔ بیل دوڑ اور جمالے کے نظریات سے لاکھ اختلافات کے باوجود وہ دونوں جمالے کے لیے دعا گو تھیں۔
ادھر بابا نور محمد نے اپنی نوں کے سامنے رشتہ کی بات شروع کی تو ان کے سستے موبائل پر بار بار جمالے کی کال آ رہی تھی۔ وہی جلدی پہنچنے کی تاکید، بابا نے تنگ آ کر موبائل آف کر دیا۔
"اپنی وڈی دھی کو بھی اگر گاؤں میں بیاہتی تو وہ ادھر مٹی کے ساتھ مٹی ہو رہی ہوتی۔ اس لیے میں نے اسے شہر بیاہا۔ اب ادھر عیش کر رہی ہے۔ کپڑے دھونے والی مشین، کپڑے سکھانے والی مشین، آٹا گوندھنے والی مشین...... (وہ انگلیوں پر گن کر بتا رہی تھیں) ایسی کون سی مشین ہے جو میری بیٹی کے گھر نہیں ہے۔ بٹن دباتے ہی سارے کام ہو جاتے ہیں......"
امامہ کی اماں پورے کروفر سے بول رہی تھیں۔ آواز بھی قدرے بلند ہو گئی۔ فاطمہ اور سمیرا گھبرا کر دیوار کے پاس کھڑی ہو کر دیکھنے لگیں۔
"اس بار بھی گاؤں آئی تو اس کی کلائیاں سونے سے سجی تھیں۔ میں تو دوسری بیٹی بھی شہر ہی بیاہوں گی۔ جمالے کے پاس اسے دینے کے لیے کیا ہے؟" امامہ کو اماں کی مادیت پرستی پہ افسوس ہوا۔
بابا نور محمد بھی دنگ رہ گئے ان کی یہ بہو شروع سے ہی مزاج کی تیز تھی۔ اس لیے وہ اس کے معاملات میں دخل دینے سے گریز کرتے تھے۔ مگر اب معاملہ ان کے پوتے، پوتی کی خوشیوں کا تھا وہ اپنی نوں کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

pklibrary.com

''جمالے کی جمع پونجی تو بہنوں کے داج پر خرچ ہوجائے گی۔ میری بیٹی کے ہاتھ کیا آئے گا؟ ہاں اگر جمالا بھی منیب کی طرح سونے کی چوڑیاں امامہ کو دلائے گا جیسے عبیرہ نے پہنی ہیں تو پھر شاید۔''

بالآخر انہوں نے اندر کی بات اگل دی تھی۔

☆☆☆

جمالے کے نمبر پر بابا نور محمد کی کال آرہی تھی۔ بیل کی پشت پر ''نجالی'' سیٹ کرتے ہوئے اس نے سیل فون کان سے لگایا۔ اسپیکر پر جمالے کا نام پکارا جارہا تھا۔ اس کے گاؤں کا نام، سوار کا نام جو اس کا جگری یار گلاب ہی تھا۔ آوازیں۔ شور شرابا۔

سیٹیاں..... باؤ ہو، دوڑ شروع ہوچکی تھی۔ اس کا بیل برق رفتاری سے دوڑتا ساتھی بیل کو بھی اپنے ساتھ تقریباً گھسیٹتے جارہا تھا۔

جمالے کی سماعتوں نے بابا نور محمد کا ایک ایک لفظ سنا تھا۔ وہ جہاں کا تہاں رہ گیا تھا۔

تائی حمیدہ نے جان بوجھ کر چوڑیوں کی شرط رکھی تھی کیونکہ جمالے کی مالی حیثیت کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ گھر میں میری بہنیں میرے لیے دعا گو ہوں گی اور ساتھ والے چھت پر وہ شہد رنگ آنکھیں کچے راستے پر ٹکٹکی باندھے جمالے میری منتظر۔

جمالے کی نظریں بے اختیار چوہدری منصوبہ پہ جا ٹھہری جو منہ مانگی قیمت پر اس کا بیل خریدنے کو تیار بیٹھا تھا۔ جمالے کو اپنے بیل سے بہت محبت تھی۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ترین امر بن گیا۔ وہ جمیل جیسی شہد رنگ آنکھیں آج لفظ ''انتظار'' کی مکمل تفسیر بنی ہوئی تھیں۔ شام ڈھلی پھر رات آئی۔ جمالے کی کوئی خبر نہ تھی۔ تماشے پر جانے والے مغرب کے وقت لوٹ آتے تھے۔ وہ جلے پیر کی بلی کی طرح ادھر سے ادھر ٹہلتی رہی۔ اس کی بے چینی دیکھ کر اماں سوچ میں پڑ گئیں۔

شور سن کر وہ ایک دم چونکی۔ جمالے کے دوست اس کے بیل کو نتھ سے پکڑے گیٹ سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ پھولوں کے ہار مبارک باد چٹائی بچھا کر کھانا لگائی فاطمہ اور سمیرا۔

امامہ بھی اس منظر کا حصہ بننا چاہتی تھی مگر اماں کے ڈر سے چپکی بیٹھی رہی۔ ادھر خوب رونق لگی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد امامہ بھی چھت پر چلی گئی۔

''خدا جانے آج میری زندگی کا کیا فیصلہ ہوگا۔'' وہ عالم استغراق میں بے وجہ ٹہلتی رہی دفعتاً کسی کے کھنکھارنے پر ہڑبڑا کر پلٹی۔

''تم مجھے مبارک باد دینے نہیں آئیں۔'' جمالے نے شکوہ کیا۔

''تو تم مبارک باد وصول کرنے خود ہی پہنچ گئے۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''مبارک ہو۔''

جمالے نے جیب سے مخملیں ڈبیا نکالی اور امامہ کو سوچنے کی مہلت دیے بنا سونے کی چوڑیاں نکال کر اس کی کلائی میں پہنا دیں، امامہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''یہ تم نے کیسے لیں؟ میرا مطلب ہے اتنے پیسے کہاں سے آئے؟''

''بیل جیتنے پر انعام میں ٹریکٹر ملا تھا تو اسی انعام والے ٹریکٹر کو بیچ کر سنار سے چوڑیاں خرید لایا ہوں۔'' وہ اس کے تاثرات سے محظوظ ہونے لگا۔

''اب تو تائی حمیدہ تمہارے ماے کے پتر کو ہاں نہیں کرے گی ناں.....''

''ماے کا پتر رشتہ لایا ہی کب تھا؟'' وہ مسکرا دی۔

''کیا..... یعنی میں فضول میں سارا دن پریشان رہا۔'' اس کے سر سے کوئی بوجھ سرک گیا تھا۔ وہ ایکدم ہلکا پھلکا ہوگیا۔

ان دونوں کے درمیان بہت کم بات ہوتی تھی۔ آج پہلی بار دوستانہ ماحول میں باتیں کرنا امامہ کو اچھا لگ رہا تھا۔

''ہوں..... تو کیا کہا تھا کہ تم کسی اور کے سنگ بیاہ کر چلی جاؤ گی اور میں بیل کی پشت پہ تو لیے رگڑتا رہ جاؤں گا۔'' وہ خفت سے لال پڑ گئی۔

فاطمہ سے اس غداری کی توقع نہ تھی۔ جب کوئی جواب نہ سوجھا تو سرپٹ دوڑتی سیڑھیاں اتر گئی۔ اس کے سانولے چہرے کی جگمگاہٹ آج چاند کو مات دے رہی تھی۔

☆☆

حنا شاہد

سیرت کا پھول

بچپن ہی سے مجھے چچی بہت اچھی لگتی تھیں۔ ہم لوگ ایک ہی گھر میں اوپر نیچے پورشن میں رہتے تھے۔ چچی بہت خوب صورت تھیں یہی وجہ ہے کہ میں ان سے بہت متاثر تھی۔ اور لاشعوری طور پر ہر وقت

امی اور چچی کا موازنہ کرتی رہتی تھی۔

چچی کے گھر میں صبح گیارہ بجے ہوتی تھی۔ اور گھر کے تمام کام ماسی کے سپرد تھے۔ وہ اپنی جلد کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل انواع اقسام کی کریموں اور لوشنز سے بھری ہوئی تھی۔ ہمہ وقت ہیئر کٹ اور نیل کلران کی شخصیت کا خاص جز تھے۔

مزاجوں کے کھلے تضاد کے باوجود امی سے ان کی بہت اچھی دوستی تھی۔ دونوں میں دیورانیوں، جیٹھانی والی کوئی بات نہ تھی۔ میں بچپن سے ہی کتابی کیڑا تھی اور یہ واحد شوق مجھے اپنی امی سے وراثت میں ملا تھا۔ لیکن چونکہ میں چچی سے بہت متاثر تھی لہٰذا ان کی ہی طرح ہمہ وقت بن سنور کر رہتی تھی۔ خاص طور پر مجھے ریڈ نیل پالش بہت پسند تھی لیکن چونکہ امی نے کبھی نماز چھوڑنے کی اجازت نہ دی تھی تو میں اپنا نیل کلر لگا کر فوراً ہی چھڑانے بیٹھ جاتی۔

میری سوچ کا دائرہ اس وقت وسیع ہوا جب میں کالج میں آئی۔ جب میری فرینڈز مجھ سے پوچھتیں۔

''نیہا! تم اپنی امی میں ملتی ہو یا ابو میں؟'' تو میں جواب دیتی۔

''بھئی میں تو اپنی چچی جیسی ہوں۔''

کبھی میں سوچتی کاش چچی میری امی ہوتیں۔ امی زیادہ تر گھر کے کاموں میں مصروف رہتی تھیں۔ ان کا رنگ اور ناک نقشہ اچھا تھا جسے انہوں نے کبھی نکھارنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ وہ یونیورسٹی کی ٹاپر تھیں اس لیے اکثر وہ طلباء کو آن لائن پڑھایا کرتی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر وہ چچی کی طرح نک سک سے رہتیں تو ان کی طرح نہیں تو ان سے کم بھی نہیں دکھائی دیتیں۔

''امی! مجھے چچی کی طرح کا ہیئر کٹ لینا ہے۔''

بہت دنوں سے میں سوچ رہی تھی۔ امی کا اچھا موڈ دیکھ کر بات کروں گی۔

''مگر کیوں؟'' امی نے سوال کیا۔

''کیونکہ مجھے پسند ہیں، ان کے جیسے بال۔''

میں نے ضد کی۔

''مگر بیٹا مجھے آپ کے لمبے بال ہی پسند ہیں۔'' امی نے جواب دیا۔

ہمیشہ ہی ایسا ہوتا۔ امی منع نہ کرتیں مگر ہامی بھی نہ بھرتیں..... اور میں ٹھہری اچھی بیٹی سو نا چاہتے ہوئے بھی میں امی کی بات سے اختلاف نہ کر پاتی۔

''یار نیہا! تم نے کبھی ہمیں اپنے گھر نہیں بلایا بس اس ویک اینڈ پر ہم تمہارے گھر آ رہے ہیں۔''

ہمارے گروپ کی انعم نے کہا۔

''اچھا موسٹ ویلکم۔'' میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''آنٹی سے کہنا، اچھی اچھی ڈشز بنا کر رکھیں۔ ہمیں امید ہے تمہاری امی بھی تمہاری طرح ڈشنگ ہوں گی۔'' صفیہ بولی۔

اور یہاں مجھے نئی فکر نے آلیا۔ گھر آ کر میں امی کے سر ہو گئی۔

''امی! آج آپ فیشل کروانے چلیں۔'' امی حیران تھیں۔

''دراصل اس ہفتہ میری فرینڈز آ رہی ہیں تو میں چاہ رہی تھی آپ ان کو فریش نظر آئیں۔'' میں نے اٹکتے اٹکتے وجہ بتائی۔

''اچھا چلو، چلتے ہیں'' امی میری بات سن کر مسکرا دیں۔ اور جب وہ فیشل کروا کے آئیں تو مجھے لگا وہ واقعی چمک رہی ہیں۔

''نیہا! اپنی فرینڈز کو لنچ پہ انوائیٹ کر لینا۔'' امی نے کہا۔

''جی اچھا، امی میری ایک بات اور مان لیں'' جب میری فرینڈز آئیں تو آپ چچی سے کوئی اچھا سا جوڑا لے لیں پہننے کے لیے۔''

امی نے تیز نظروں سے مجھے گھورا۔

''اصل میں چچی کے کپڑے بہت اسٹائلش ہوتے ہیں نا'' میں نے جلدی سے وضاحت دی۔

''بیٹا شیر کی کھال پہن لینے سے گدھا شیر نہیں بن جاتا۔'' امی نے جواب دیا۔ اور میں خاموش ہو گئی۔

آخر کار ویک اینڈ آ گیا۔ یہ لوگ کالج سے میرے۔ ساتھ ہی آ گئیں۔ میں نے ان کو خاص طور پر چچی اور امی سے ملوایا۔ جاتے وقت شیزا بولی۔

''نیہا تمہارا گھر اور گھر کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ خاص طور پر تمہاری گریس فل سی مما مجھے بہت پسند آئیں۔ بہت نائس ہو تم۔''

انہوں نے چچی کا ایک دفعہ بھی نام نہ لیا حالانکہ میں سوچ رہی تھی کہ وہ ضرور کہیں گی تمہاری چچی بہت اسٹائلش ہیں۔

بہر حال حال اپنی امی کی تعریف سن کر مجھے لاشعوری طور پر بہت خوشی ہوئی۔ اور اس کے بعد میں نے کئی مرتبہ نظروں کا زاویہ بدل کر امی کو غور سے دیکھا کہ امی میں وہ کیا تھا جو مجھے کبھی نظر نہ آیا۔ میں نے اکثر اپنے خاندان میں دیکھا امی کو ہر جگہ اہمیت دی جاتی۔ ان کو ہر معاملے میں بہت عزت دی جاتی تھی۔ لوگ ان کو دیکھ کر ان کے لیے اپنی جگہ خالی کر دیتے۔ بہت سے لوگ مختلف معاملات میں مشورے کے لیے گھر آیا کرتے تھے۔

آخر کئی سالوں بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی جب میرے شوہر نے مجھے کہا۔

''نیہا! تمہیں پتا ہے تم بالکل اپنی امی جیسی ہو۔''

''کیا واقعی؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''ہاں تم نے کبھی غور نہیں کیا؟'' انہوں نے مجھے پکڑ کر آئینے کے سامنے کھڑا کیا ''دیکھو وہی ذہانت سے بھری ہوئی آنکھیں وہی تمکنت، وہی وقار اور ویسے ہی خوب صورت لمبے بال۔

میں نے اپنی امی سے کہا تھا، شادی کے لیے لڑکی بھلے خوب صورت نہ ہو مگر اس کے بال لازمی خوب صورت ہونے چاہئیں۔'' وہ میرے بالوں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

میری امی کے عام سے چہرے میں وہ خاص کیا تھا جو مجھے کبھی نظر نہ آیا۔ وہ اپنے فارغ وقت میں ہمیشہ کتابیں پڑھتی پائی جاتی تھیں وہ علم کے سمندر میں غرق تھیں جو ان کے ماتھے پر نور بن کر چمک رہا تھا۔

ان کی ذہانت، تفکر تدبر ان کو چچی سے الگ کرتی تھیں۔ چچی جو ایک عام سی عورت تھیں ان کے خواب اور خواہشیں کپڑوں اور فیشن کی حد تک ہی محدود تھے۔

اپنے شوہر کے منہ سے تعریف سن کر آج مجھے احساس ہوا تھا کہ پروان چڑھانے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہے علم اور تربیت۔ میں نے اپنے اللہ کا شکر ادا کیا کہ واقعی میں اپنی امی جیسی ہوں۔

☆☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

میرے خواب لوٹا دو
نگہت عبداللہ

کسی راستے کی تلاش میں
میمونہ خورشید علی

اُجالوں کی بستی
فاخرہ جبیں

ایک میں اور ایک تم
تنزیلہ ریاض

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی
فون نمبر: 32735021

قرۃ العین سکندر

تم ہو میت میرے

''اماں! مجھے بتا ہی دیا ہوتا کہ بی فیروزہ نے میرے لیے شیشے اور دھاگوں کے کام والے سادہ سے کپڑے تیار کیے ہیں۔ اب شام کو میں اداہاشم کی مہندی میں یہ سادہ سے کپڑے پہنے کیا خاک اچھی لگوں گی۔''

مدحت نے نخوت سے کپڑوں کو چھوکر بے دردی سے پرے دھکیل دیا تھا۔ اس کے انداز دیکھ کر ساجدہ بیگم بوکھلا سی گئیں۔ جانتی تھیں کہ چار بھائیوں کی اکلوتی چھوٹی بہن کے نخرے آسمان کو چھوتے ہیں۔ مزاج کے خلاف کوئی بھی بات اس کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔ اس وقت بھی مہندی کے فنکشن کے لیے بنائے گئے کپڑے اس نے آرام سے رد کردیے تھے۔ اس کو سرچڑھانے میں اس کے باپ اور بھائیوں کا اہم کردار تھا۔

''نہ دھی رانی، ضد نہیں کرتے۔ دیکھ تو کتنا پیارا کام ہوا ہے۔ پھر یہ تو ہمارے ثقافتی ورثہ کی نمائندگی کرتا ہوا لباس ہے۔ پھر میری دھی رانی تو ہر رنگ اور ہر لباس میں جچتی ہے۔''

آخری جملے ساجدہ بیگم نے بے حد لگاوٹ سے ادا کیا تھا۔ جانتی تھیں کہ اسے سمجھانا بے حد مشکل کام ہے چند گھنٹوں کے بعد ہی فنکشن تھا۔ سرشام ہی ڈھولک کی تھاپ شروع ہوجاتی تھی۔ آج تو سارا گھر ہی مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ مگر وہ مدحت ہی کیا جو مان جاتی۔

''نہ اماں، میں ابھی جا کر اداسے کہتی ہوں۔ شہر کون سا دوری پر ہے۔ بازار سے نیا سوٹ لے آتی ہوں۔''

وہ ان سنی کرتی باہر نکل گئی اور پھر اس نے اپنا کہا پورا کر دکھایا تھا۔ اداقاسم سے اس نے دوٹوک کہہ دیا تھا کہ شادی کے لیے اسے سارے نئے من پسند لباس چاہئیں۔ ورنہ وہ شادی میں ہی شریک نہیں ہوگی۔ گھر بند کر کے بیٹھ جائے گی۔ اس کی ضد تو سب ہی جانتے تھے۔ چوہدری صاحب نے بھی آنکھ کی جنبش سے قاسم کو اشارہ کیا تھا کہ وہ اسے لے جائے۔ یہ موقع خوشی کا تھا اور اس میں کسی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتے تھے۔ یوں بھی مدحت میں تو ان کی جان تھی۔

''جاؤ بابا لے جاؤ۔''

انہوں نے بارعب لہجہ میں کہا۔

''مگر بابا میں آپ کی پیجارو میں جاؤں گی۔''

اس نے فیصلہ کن انداز میں ہتھیلی سامنے پھیلا دی تھی۔ چہرے پر دبا دبا جوش اور خوشی کے گہرے رنگ پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی چہیتی بیٹی کو دیکھ کر مسکرا دیے۔ اس کی گلابی ہتھیلی پر چابی رکھ دی وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

☆☆☆

بلند وبالا دیواروں پر دیدہ زیب ثقافتی رنگ منقش زدہ تہذیب لیے، یہ حویلی ان کے پرکھوں نشانی تھی۔ چوہدری حشمت اور چوہدری حکمت دونوں بھائی تھے۔ مگر حکمت کا دل یہاں حویلی میں نہ لگتا تھا۔ وہ پڑھائی لکھائی کے شوقین تھے۔ دس جماعتیں پاس کر کے بس نہ کی۔ تعلیم کے حصول کا سفر جاری رکھا۔ یہی لگن اور شوق ان کی اقدار روایات سمیت شہر لے

گیا۔ مگر وہ شہری رنگ میں بہت جلد رنگ گئے تھے۔ وہاں انہوں نے بہت ساری ڈگریاں ہی حاصل نہیں کی تھیں۔ بلکہ وہاں یونیورسٹی میں اپنی کلاس فیلو ہما سے بھی شادی کرلی تھی۔ یہاں بڑے بھائی ان کو یاد کرتے بلاتے تھے۔ وہ آتے اور پھر لوٹ جاتے۔

جلد ہی چوہدری پر انکشاف ہوگیا کہ بھائی تو شہر میں ازخود ہی بیاہ رچا چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بھی اپنی برسوں کی منگ ساجدہ سے شادی کرلی تھی۔ پھر اوپر تلے چار بیٹوں کی پیدائش کے بعد ایک من موہنی سی بچی کی پیدائش ان کی زندگی کا ہر خلا پر کر گئی تھی۔ چار بیٹے ان کے لیے ان کے بازو تھے۔ زندگی تھے۔ اس طرح وہ حکمت کے جانے کے غم کو بھی بھلا بیٹھے تھے۔ بھائی کی یاد ستاتی تھی تو خود ہی شہر جا کر مل آتے تھے۔

حکمت ایک آدھ مرتبہ ہی اپنی فیملی سمیت یہاں آئے تھے۔ ان کی بیگم کو یہاں آکر شدید گھٹن کا

ناولٹ

pklibrary.com

احساس ہوتا تھا۔ حکمت مجبور ہو کر بیوی بچوں سمیت واپسی کی راہ لے لیتے تھے۔ اگرچہ وہ شہری زندگی میں رچ بس چکے تھے۔ مگر ان کی شدید آرزو تھی کہ ان کے بچے ان کی اقدار و روایات، تہذیب و تمدن کو اپنائیں۔ ان کے پس منظر سے واقفیت رکھیں۔

پھر وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ یہ ملنا ختم ہوگیا اور اب بہت عرصے بعد وہ چوہدری حشمت کے سب سے بڑے بیٹے ہاشم کی شادی میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ حما نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ صرف ولیمے پر شریک ہوں گی۔ اس لیے باپ بیٹا اور بیٹی پہلے چلے جائیں۔ اس لیے حکمت اپنے بیٹے اسفند اور بیٹی سارہ کے ساتھ آچکے تھے۔ ساجدہ بیگم اور چوہدری حشمت ان کے آگے بچھے جارہے تھے۔ فنکشن شروع ہو چکا تھا جب مدحت کی واپسی ہوئی تھی۔ آتے کے ساتھ ہی اپنے کمرے میں بند ہوگئی تھی اور اعلان کر دیا تھا کہ جب تک وہ تیار نہیں ہو جاتی اس کو بلانے کوئی نہ آئے۔ وہ خود ہی باہر آجائے گی۔

ریڈی میڈ سرخ کام دار کپڑوں میں وہ ملبوس لپ اسٹک لگائی۔ کاجل سے سجائی قد آدم آئینے میں اپنا عکس ہر زاویے سے دیکھ رہی تھی۔ سرخ پراندے میں اس نے اپنے بالوں کو بے حد نفاست سے مقید کیا تھا۔ وہ بالکل ہی الگ سی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے اپنا دوپٹا اٹھایا اور گلے میں ڈال کر نکل آئی۔ سامنے ہی ساجدہ بیگم چلی آرہی تھیں۔ اسے آتے دیکھا تو اس کی خوب بلائیں لیں۔

"چل دھی رانی سب بار بار تیرا پوچھ رہے ہیں۔ بہت دیر کر دی تو نے۔"

"اماں تو نے بتایا ہی نہیں میں لگ کیسی رہی ہوں۔"

وہ جو یہ سوچ کھڑی تھی کہ اب اپنی ڈھیر ساری تعریفیں سنے گی۔ یوں اچانک اماں کی چپ پر اندر تک مرجھا سی گئی تھی۔

"یہ بھی پوچھنے کی بات ہے میری دھی تو ہزاروں لاکھوں میں ایک ہے۔"

انہوں نے لپک کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔ مبادا وہ پھر منہ بنا کے بیٹھ جائے۔ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جانا اس کی عادت تھی۔

دالان برقی قمقموں سے جگمگ کر رہا تھا۔ سارے مہمان خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ خاصی رونق لگی ہوئی تھی۔ خاندان بھرا اکٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی سہیلیوں کا جھرمٹ اس کے گرد اکٹھا ہوگیا تھا۔

"واہ کیا لشکارے مار رہی ہے۔ ہائے کتنا سوہنا لباس ہے۔ کہاں سے لیا ہے۔"

یہ سدرہ تھی جو اس کے لباس کو ستائشی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"سوٹ کا کمال نہیں ہے۔ میں تو ہوں ہی خوب صورت۔ آج ہی لائی ہوں شہر سے۔ میں کچھ بولوں اور میری بات ٹل جائے۔ یہاں حویلی میں تو ممکن نہیں ہے۔"

وہ ادائے بے نیازی سے بولی۔

"ہائے یہ سونے کا سیٹ کتنا وزنی اور خوب صورت ہے۔"

دوسری سکھی اس کے جگمگے زیور پر فدا ہو رہی تھی۔ تب ہی ندیم بھائی کی آواز پر وہ آگے بڑھی۔ پھر اس کی نگاہ اس اجنبی پر پڑی تھی۔ جو نگاہوں میں دلچسپی لیے اس کی جانب ہی متوجہ تھا۔

"سوہنی لگ رہی ہے۔" ندیم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور تعریف تو اس اجنبی کی نگاہیں بھی کر رہی تھیں۔ جو بالکل شہری بابو جیسا تھا۔ اس کے عقب میں کھڑی وہ خوب صورت نازک سی لڑکی لانگ فراک میں اس ماحول سے بالکل الگ تھلگ دکھائی دے رہی تھی۔

"سارہ جاؤ بھئی کزن سے ملو۔"

اسفند نے پہلی مرتبہ لب کشائی کی تو وہ چونک گئی تھی۔ تب دور بابا کے پاس بیٹھے چوہدری حکمت کو دیکھ کر وہ ساری بات سمجھ کر سر ہلا گئی تھی۔ برسوں پہلے بچپن کے نقش اب بھی ذہن کے دریچے پر تر و تازہ ہی

تھے۔

تب ہی اس اجنبی کو دیکھ کر ایک عجیب سی انسیت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ان کا اپنا ہی تو تھا۔ ان کا اپنا خون تھا۔ سارہ جھجک کر آگے بڑھی تھی۔ اور سلام کیا تھا۔ اس کے خلوص کا جواب اس نے بھی اس کا ہاتھ تھام کر دیا تھا۔

اللہ اللہ کر کے مہندی کی رسمیں ختم ہوئیں کھانا کھلا اور سب ادھر متوجہ ہو گئے۔ وہ سارہ کا ہاتھ تھامے اسے ایک جانب لے آئی تھی۔

خانساماں ان کے قریبے سے کھانا نکال کر رکھ گیا تھا۔

کالی پینٹ اور میرون شرٹ میں ملبوس سرخ وسفید اسفند نے اسے اپنی نگاہوں میں جکڑ رکھا تھا۔ اس سے کہاں کھایا جا سکتا تھا۔ وہ سارہ کی میزبانی ہی کرتی رہ گئی تھی۔ مگر فنکشن کے بعد اس نے فیروزہ بی سے ٹرے میں اپنے کمرے میں کھانا منگوایا تھا اور خوب ڈٹ کر کھایا تھا۔ صبح سے چائے ایک کپ ہی پیا تھا۔ جب کمرے میں اماں کے ساتھ سارہ اور اسفند داخل ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ قورمہ میں دوبے اور منہ میں نوالہ تھا۔ اس نے شدید خفت محسوس کی تھی۔

"ارے آپ دوبارہ کھانے بیٹھ گئیں، سنا تو تھا کہ دیہاتی بہت کھاتے ہیں۔"

اسفند کی زبان سے نکلے لفظ اس کی روح پر جیسے نشتر کا کام کر گئے تھے۔ لفظ دیہاتی تو جیسے اسے بطور خاص سنایا گیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی بوٹی پلیٹ میں پٹخ دی تھی۔ اور نخوت سے کھڑی ہوئی تھی۔

"شہری ہونے کے باوجود آپ بھی اس مٹی کا حصہ ہیں۔ مت بھولیں۔"

وہ برا سا منہ بنا کر دوبدو لڑنے کو تیار کھڑی تھی۔ اماں اس کے تیور دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھیں۔

"ارے دھی وہ تو مذاق کر رہا تھا۔ میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ سارہ تیرے ساتھ ہی سوئے گی رات کو۔ بلکہ جتنے دن یہاں ہے۔ یہیں رہے گی۔"

اماں نے اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔ وہ لاکھ نخریلی اور چہیتی سہی مگر وہ لوگ بھی پرائے نہ تھے۔ برسوں بعد ان کے مجازی خدا کے چہرے پر گہری آسودگی اور خوشی کے رنگ چھائے تھے۔ تو وہ ان بچوں کی مرہون منت ہی تھے۔ ہر رشتے کا مقام الگ ہوا کرتا ہے۔ اور ہر رشتے کا ذائقہ بھی الگ ہوتا ہے۔ ہر رشتہ اس کی اصل کے ساتھ ہی روح کو سرشار کرتا ہے۔ اولاد کی محبت اپنی جگہ مگر خون کے رشتوں کی اہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہوا کرتی ہے۔

وہ پاؤں پٹختی کمرے سے نکلی تھی۔ ساجدہ بیگم کو سخت ندامت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔

"بیٹا! برا نہ ماننا۔ وہ دل کی بری نہیں ہے۔ بس غصہ کر جاتی ہے۔ ابھی لاتی ہوں اسے۔ تم آرام سے سو جاؤ ادھر۔"

فیروزہ بی نے لپک کر کھانے کی ٹرے اٹھائی اور باہر لے گئی تھی۔ اسفند نے سفری بیگ جس میں سارہ کے ملبوسات اور دیگر سامان تھا۔ ایک جانب رکھ دیا تھا اور سارہ ٹھنڈی سانس بھر کر بیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔

اسفند لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ راہداری کے کونے میں وہ منہ بسورے ابھی تک لال کپڑوں میں لال پری بنی کھڑی تھی۔ اس کی پشت اس کی جانب تھی۔ اس نے پراندے میں موتیا کی کلیاں پرو رکھی تھیں۔ جن کی مہک سے اسفند نے قریب سے گزرتے اپنی سانس کو معطر کیا تھا وہ کسی طور پر بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہ تھی۔ اسفند کو دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

مگر اسفند ایک لفظ کہے بنا آگے چلا گیا تھا۔ وہ اس کے جاتے ہی واپسی کے لیے مڑی تھی۔ کمرے میں بھرپور بشاشت لیے وہ واپس لوٹی تھی۔

سارہ اس لڑکی کے ہر رنگ کو تحیر زدہ ہو کر دیکھ رہی تھی۔ اور قدرے مطمئن سی بھی ہو گئی تھی۔ گویا اس کی چغلی اسفند اسے تھی۔ اس کی ذات سے اسے کوئی پرخاش نہ تھی۔ وہ اسے رات بھر اپنے گوٹھ کے قصے اپنی سہیلیوں کے نام بتاتی رہی۔ باتوں ہی باتوں میں

نجانے کب وہ دونوں نیند کی وادی میں گم ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

بارات میں سب اہل خانہ کے علاوہ خاندان بھر کے لوگ شریک تھے۔ وہ گلابی لباس میں بے حد شگفتہ لگ رہی تھی۔ آج اس نے اپنے لمبے سیاہ بالوں کو پشت پر کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ آج تو اس کی جھجک ہی نرالی تھی۔ سارہ سے اس کی گہری دوستی ہو چکی تھی۔ سارہ یہاں آکر بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔ بلکہ اس کے دل میں ملال بھی تھا کہ اس کی مام نے ان کو اتنے خوب صورت رشتوں سے ایک عرصے تک دور رکھا تھا۔ اسے ہمیشہ سے ہی ایک بہن کی کمی کھلتی تھی اور مدحت نے اس کمی کو جیسے اپنے جلترنگ قہقہوں اور خوش رنگ باتوں سے پورا کر دیا تھا۔

دودھ پلائی کی رسم ہو رہی تھی۔ یہ خاندان کے بچوں میں پہلی شادی تھی۔ سب ہی بے حد پرجوش تھے۔ اس وقت ہاشم اپنی دلہن ندرت کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہاشم کے بائیں طرف ہی اسفند قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ جب سے آیا تھا اس کو وی آئی پی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ جبکہ ندرت کی دائیں طرف پہلے سے ہی اطوئی بہن قبضہ جمائے بیٹھی اور مدحت کے ساتھ ہی سارہ تھی۔ کل سے اب تک وہ دونوں یک جان دو قالب کی بہترین نمائندگی کرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

ہاشم اور ندرت کی جوڑی کمال کی لگ رہی تھی۔ ہر زبان پر تعریفی جملہ اور ہر آنکھ میں ستائشی انداز تھا۔ ندرت کی چھوٹی بہن جمی نے دودھ پلائی کی رسم ادا کی تھی۔ اس کے ہمراہ کافی ساری لڑکیاں بھی تھیں جو اس کی سہیلیاں تھیں اور اس وقت اس کا ساتھ نبھانے کی غرض سے گھیرا بنائے کھڑی تھیں۔

"چلیں دولہا بھائی نکالیں پیسے جیب ڈھیلی کریں۔"

کسی چلبلی لڑکی نے لقمہ دیا تھا۔ اسفند خاموش سا بیٹھا تھا۔ جبکہ ہاشم زیر لب مسکرا رہا تھا۔ پہلا تجربہ، پہلی خوشی اور پہلا احساس، بے حد یادگار ہوتا ہے دل کی مسند پر اب ندرت ہی تھی۔

"ارے واہ آج کوئی جمعرات تھوڑی ہے۔ جمعرات کے دن آنا مغلئی کہیں کی۔"

مدحت کا لب ولہجہ اچانک بے حد ہتک آمیز سا ہو گیا تھا۔ ایک تو خاندانی رکھ رکھاؤ وقار اور دولت کی ریل پیل کیا کم تھی کہ رہی سہی کسر اس کے ناز و نخرے اٹھا کر پوری کر دی گئی تھی۔ وہ خود سر اور ضدی ہو چکی تھی۔ ندرت کا پس منظر ان کی نسبت کم تھا۔ ندرت کے والدین خوش حال ضرور تھے۔ مگر معاشی اعتبار سے چوہدریوں کے ہم پلہ ہرگز نہ تھے۔ مگر یہاں رشتے بناتے وقت ہاشم کے والدین نے اپنی چوہدراہٹ کو پس پشت ڈال کر محض حق محبت نبھایا تھا۔ اپنی اولاد کی محبت کا حق اس کی چاہت کو اپنا کر بخوبی نبھایا تھا۔ وہ لڑکی مدحت کی بات کا سخت برا مان کر ایک دم چپ ہو گئی تھی۔ مگر دوسری لڑکی اس کی جگہ بولی تھی۔

"ارے جمعرات نہیں تھی تو ہاشم بھائی بھی دلہن کو لینے نہ آتے، جمعرات کو ہی آتے تو اچھا تھا۔"

دوبدو جواب مل گیا تھا۔ جو مدحت کو تیر کی طرح لگا تھا۔

"ہاشم ادا نے تو احسان کیا ہے۔"

مدحت نے بے نیازی سے کہا تھا۔ مگر اس کا کہا گیا جملہ اس قدر ہتک آمیز تھا کہ ندرت کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

"یہ رویہ درست نہیں ہے۔ وہ بھی اس موقع پر۔"

اسفند بولے بنا نہ رہ سکا تھا۔ مدحت کھول کر رہ گئی تھی۔ آج تک اس کی بات کو کسی نے یوں رد نہ کیا تھا۔

"کیوں اس میں کیا غلط کہا میں نے۔" وہ وہیں اسٹیج پر ہی لڑنے کو تیار ہو کر تلخ لہجے میں بولی تھی۔

"احترام کو ملحوظ خاطر رکھ کر شائستہ گفتگو کریں یوں گنوار پن نہ دکھائیں۔"

نہ جانے اسفند کو بھی کیا ہوا کہ وہ کہے گیا لفظ گنوار پن نے اسے اشتعال دلا دیا تھا۔ پہلو بدل کر بولی تھی۔

"آپ ہوتے کون ہیں مجھے گنوار کہنے والے۔ آپ بھی اس مٹی کا حصہ ہیں۔

خون وہی دوڑ رہا ہے آپ کی رگوں میں جو ہم میں گردش کر رہا ہے۔" وہ بات کو گھما کر نجانے کہاں سے کہاں لے گئی تھی۔ مدحت کو یہی گمان گزرا تھا کہ اسے اپنے شہری ہونے کا زعم ہے۔ اور اب جتا رہا ہے۔

"بات خون کی نہیں بلکہ تربیت کی ہے۔ بات کرنے کے انداز کی ہے۔ کب کہاں کس وقت کیسے بات کرنی ہے۔ وہ لڑکی والے ضرور ہیں۔ مگر عزت نفس سب کی مجروح ہوتی ہے اس طرح کی گفتگو سے۔" وہ سنبھل کر اب وضاحتی لہجہ اپنا گیا تھا۔

"اپنی نصیحتیں اپنے پاس سنبھال کر رکھیں اور دفعان ہو جائیں یہاں سے۔"

اس کا اتنا کہنا تھا کہ پاس کھڑے قاسم نے صورت حال کو غلط رخ پر جاتے دیکھ کر اچانک ہی آگے بڑھ کر۔ مدحت کی کلائی کو زور سے تھاما تھا۔

"ابھی جاؤ یہاں سے — کہیں اور چلی جاؤ۔" وہ آہستہ سے بولا۔

مدحت نے اپنی آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو پیتے خوں خوار نگاہوں سے اسفند کو دیکھا تھا۔ جو اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ بلکہ اس وقت ہاشم کا کندھا تھپتھپا کر اسے گویا حوصلہ دے رہا تھا۔

مدحت کو یوں روتا دیکھ کر اس کی سکھیاں اس کے پاس آ گئی تھیں۔

وہ آنسو بہاتی ڈرائیور کے ساتھ گھر آ گئی تھی۔

وہ رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی۔ اس کے آنسو اس کے اندر کی آگ کو بجھانے میں ناکام ہو چکے تھے۔ شہنائیاں سنائی دینے لگیں۔ ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔ ان لمحات کا اس نے کتنی بے صبری سے انتظار کیا تھا اور ان سارے خوش کن لمحات سے وہ محروم رہ گئی تھی۔ صرف اور صرف اس اسفند کی وجہ سے اپنی نارسائی کا دکھ اس کی آنکھ میں منجمد ہو گیا تھا۔ ٹھہرے ہوئے پانی کی طرح۔

ماں جی نے ساری رسمیں نبھانے کے بعد اس کو پکارا تھا۔

"مدی رانی باہر آ...... بھابھی اور بھرا سے آ کر مل۔"

ماں کی آواز سن کر اس نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ اور دروازے کے پاس جا کر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"جہاں سب رسمیں کر آئی ہو یہ بھی کر لیتی تھی۔ میں سونے لگی ہوں۔ اس چھیتی سارہ کو اپنے پاس سلا لینا۔"

اس وقت وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ قاسم سے اس کی خاص دوستی تھی۔ مگر ادا قاسم نے بھی اس کو اس طرح بے عزت کر کے رکھ دیا تھا۔ مجمع میں تضحیک آمیز رویہ اس نے پہلے کب سہا تھا۔ روتے روتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

☆☆☆

صبح اس کی آنکھ کھلی تو۔ اس کا سارا بدن درد کر رہا تھا۔ چہرہ متورم تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بھوک نے الگ نڈھال کر رکھا تھا۔ حویلی میں چہل پہل تھی۔ وہ دوپٹہ پھیلائے باہر نکل آئی۔ پہلے اس کا سامنا بابا سائیں سے ہوا تھا۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

"چھوٹی چھوٹی باتوں پر یوں روٹھا نہیں کرتے پگلی! وہ تیرا بھائی ہے۔ کچھ کہہ دے تو سمجھ جاتے ہیں۔ میں نے قاسم کی خوب کھنچائی کی ہے۔ وہ اب ایسا نہیں کرے گا۔ تو چل سب ناشتے پر تیرے منتظر ہیں۔"

وہ بابا سائیں کے ساتھ کھڑی اپنی گردن تفاخر سے اٹھی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے بابا اس کو مینار ہے تھے۔ اس کی خاطر ادا قاسم کو بھی ڈانٹ پلائی تھی۔ وہ اتنی اہم تھی۔ پھر ناشتے کی میز پر سب نے اس کا

والہانہ استقبال کیا تھا۔ دور بیٹھی سارہ نے بھی اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔ مدحت نے ایک طائرانہ نگاہ میز پر اور پھر اطراف میں سب چہروں پر بھی ڈالی تھی۔ اسے یہاں وہ ستم گر کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کا ساری رات رو رو کر حال خراب رہا تھا۔ اس نے بھی اس کے تصور پر لعنت بھیجتے ہوئے ناشتے کی جانب اپنی توجہ مبذول کر لی تھی۔ نظر انداز ہی کرنا بہتر تھا۔

فیروزہ اس کے من پسند آلو کے پراٹھے اس کی پلیٹ میں گرم گرم لا کر رکھ رہی تھی۔ کچھ بھوک کا بھی شدید احساس تھا اس نے دو پراٹھے کھا کر چائے کا بڑا سا مگ تھام لیا تھا۔ پہلا گھونٹ ہی لے سکی تھی کہ اسے اسفند ایک بے حد ماڈرن سی خاتون کے ہمراہ آتا دکھائی دیا تھا۔ سارہ مام کہہ کر لپکی تھی۔

"اٹھ کر طریقے سے چاچی کو سلام کرنا اور ملنا دیکھ ہمیں شرمندہ نہ کروانا۔"

اماں کی بات پر آگے بڑھ کر چاچی سے ملی تھی۔ ہما بیگم، جو سفر کی تھکان سے اور صبح سویرے جاگنے کی وجہ سے کچھ بے زاری محسوس کر رہی تھیں۔ اسے سرسری سے انداز میں سلام کا جواب دے کر حکمت صاحب سے باتوں میں لگ چکی تھیں۔ وہ وہیں سے پلٹ گئی۔

"ہونہہ شہری انداز تو ملاحظہ فرمائیں۔" وہ جی ہی جی میں کڑھتی واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز حکمت صاحب نے محسوس کیا تھا۔

"تم نے مدحت کو دیکھا ماشاء اللہ کتنی پیاری ہو گئی ہے۔" حکمت صاحب کل کی بدمزگی کو شاید ختم کرنا چاہتے تھے۔

"ہاں ماشاء اللہ کافی رنگ روپ نکال لیا ہے مدحت نے۔" ہما نے بھی باآواز اس کو سراہا تھا۔

"بعض لوگ قد کاٹھ تو نکال لیتے ہیں۔ مگر عقل والا خانہ خالی رکھتے ہیں۔"

اسفند نے شرارتی انداز میں لقمہ دیا تھا۔ اماں ہنس دی تھیں۔ اب تک سب ہی اس کو سمجھ چکے تھے کہ اسفند شرارتی سا ہے۔ مگر مدحت کو تو اس کی بات نے بری طرح تپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ہما بیگم کو جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا وہ سب سے زیادہ خوب صورت اور کشادہ تھا۔ ہر طرح کی آسائشات اور سہولیات سے مزین وہ کمرہ بھی ہما بیگم کو اپنے شایانِ شان نہیں لگ رہا تھا۔ جبکہ ساجدہ بیگم ان کے سامنے بچھی چلی جا رہی تھیں اور یہ ان کا خلوص ہی تھا۔ نمود و نمائش تو ان کو چھو کر بھی نہ گزری تھی۔

"بھرجائی! کسی شے کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اگر کسی بھی شے کی ضرورت ہو تو بتانا۔ یہ فیروزہ اور اس کی بیٹی ہے ہاجرہ۔ دونوں جی جان سے آپ کی خدمت کریں گی۔ اور ہاں اب آپ آئی ہیں تو آپ نے ہفتے سے پہلے نہیں جانا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں رہیں۔ ہمیں میزبانی کا شرف بخشیں عزت افزائی ہے ہماری۔"

ساجدہ بیگم کے انداز میں بے حد محبت اور لگاوٹ تھی۔ جبکہ ہما نے پورے ہفتے کا سن کر اپنی تیوری چڑھائی تھی۔

"نہ بابا مجھے تو اپنے بستر کے علاوہ کہیں نیند ہی نہیں آتی ہے اور یہ ماحول یہاں کا شور شرابا مجھے برداشت نہیں ہے۔ اور یہ کیا بار بار سب خواتین آ کر گلے مل مل کر جاتی ہیں۔ انجر پنجر ہل کر رہ گیا ہے میرا، دیکھ لیا کافی ہے۔ یہ کیا گلے کا ہار ہی بن گئیں۔"

ہما یہاں آ کر سخت عاجز آ گئی تھیں۔ جب سے یہاں آئی تھیں۔ ارد گرد کے ملنے جلنے والے آ رہے تھے۔ پھر خواتین کا بھرپور طریقے سے والہانہ انداز میں گلے لگانا۔

"آپ پریشان نہ ہوں میں سب کو سمجھا دوں گی۔ اب کوئی پریشان نہیں کرے گا۔"

وہ دکھی انداز میں کہتی پلٹ گئی تھیں۔ ہما کے چہرے پر واضح ناپسندیدگی کی تحریر رقم تھی۔ ان کا یہاں ہفتہ بھر رہنے کا ارادہ نہیں تھا۔

شام کو ولیمہ تک ہما بیگم اپنے کمرے میں ہی بند رہیں شام سے ہی حویلی میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ اب تک مدحت نے اپنی بھابھی اور بھائی کے کمرے میں قدم نہیں دھرا تھا۔ اس کے دل میں بھابھی کے لیے میل آ گیا تھا۔ اور وہ انا کی ماری لڑکی کیسے اپنی بے عزتی بھلا کر اپنے قدم آگے بڑھاتی۔ ماں کے بار بار بلانے پر بھی نہ گئی۔ سارہ از خود اس کے اردگرد دوبارہ منڈلانے لگی اور پھر مدحت اس پیاری لڑکی سے زیادہ دیر تک خفگی برقرار نہ رکھ سکی تھی۔

ویسے پر مدحت کے کالے کپڑوں پر بے حد نفیس کام اور دوپٹے کے کناروں پر موتی ٹکے ہوئے تھے۔

سارہ تو اس کو مبہوت دیکھتی ہی چلی گئی تھی۔ ہما بیگم امیر تھیں۔ خاندانی اعتبار سے بھی اونچا رتبہ تھا۔ مگر شکل وصورت میں وہ کسی طور پر بھی ساجدہ بیگم کے برابر نہ تھیں۔ ساجدہ بیگم، خالص دیہاتی ماحول کی پروردہ تھیں اور خاندانی پس منظر بھی وڈیروں والا تھا۔ خالص خوراک اور بہترین ماحول کی بدولت ان کی اٹھان اور شکل وصورت بھی منفرد تھی۔ اس وجہ سے مدحت کا رنگ روپ بھی دیکھنے والا تھا۔ سارہ گندمی رنگت والی لڑکی تھی۔ جو اپنی ماں کی نسبت بے حد پرخلوص اور محبت لٹانے والی تھی۔ جبکہ ہما بیگم کو اپنے پڑھے لکھے ہونے کا بے حد زعم تھا۔ اور اسی لیے وہ یہاں بھی اپنی تفاخر زدہ گردن کو اکڑائے بیٹھی تھیں۔ اچانک سارہ کو مدحت کے ہمراہ آتے دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی تھیں۔ مدحت کے چہرے سے نگاہ ہٹانا ہی مشکل ترین امر لگ رہا تھا۔ وہ اتنی دلفریب اور اس منظر کی اصل خوب صورتی کا سبب لگ رہی تھی۔ وہ اسے یک ٹک دیکھتی چلی گئی تھیں۔

''امی! دیکھیں مدحت کتنی پیاری لگ رہی ہے نا۔''

سارہ کے لہجہ میں واضح ستائش تھی قدرے فاصلے پر کھڑے قاسم سے باتوں میں مصروف اسفند نے مدحت کو گہری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ بہت پیاری اور سیدھا دل میں اترنے کا ہنر جانتی تھی۔ مگر کچھ نا سمجھ اور بدحواس تھی۔ اپنی زبان کی تیزی سے ہر خوب صورت احساس کو زائل کر دیتی تھی۔ مگر اسفند بھلا کب ہار ماننے والوں میں سے تھا۔

''محترمہ شکل وصورت اور دولت کے بل بوتے پر اکڑتی ہیں۔ مگر محبت تو اچھے اچھوں کی عقل ٹھکانے لگا دیتی ہے۔ اور چاروں شانے چت کر دیتی ہے۔ اس کی اکڑ کو بھی عجز میں بدل کر ہی دم لوں گا۔''

دل میں مصمم ارادہ باندھتے اسفند کی نگاہوں اور توجہ کا مرکز وہی تھی۔ جو سارہ کی کسی بات پر اچانک کھلکھلا کر ہنسی تھی — جلترنگ ہنسی نے فضا کو بھی مہکا سا دیا تھا۔ اچانک ہی مدحت کی نگاہوں کا تصادم اس ستم گر دشمن جاں سے ہوا تھا۔ جو اس کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نامحسوس طریقے سے اپنا رخ موڑ گئی تھی۔ اب اس کے سیاہ لمبے بال اس کی نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ وہ اس کی اس ادائے بے نیازی پر زیر لب مسکرا کر رہ گیا تھا۔

قاسم نے مدحت کانوں میں نجانے کیا پھونکا تھا وہ ایک دم ہی سب کے ساتھ سیدھی ہو گئی تھی۔ سوائے اس ایک شخص کے، جو اس کی توجہ کا طلب گار تھا اور اس سے کم بھی نہ تھا۔ سب نے دیکھا کہ قاسم کے ہمراہ وہ اسٹیج پر گئی اور بھابھی کو سلام کیا اور بھیا کو مبارک دی۔ اور ہنستے ہنستے تصاویر بنوانے لگی تھی۔

دور کھڑی ساجدہ بیگم نے دل ہی دل میں اللہ پاک کا شکر ادا کیا تھا۔ ابھی پہلے پہلے بیٹے کے فرض سے سبکدوش ہوئی تھیں۔ اور نہیں چاہتی تھیں کہ گھر کی فضا میں تناؤ پیدا ہو۔ یوں عزیزوں اور قرابت داروں کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے کہ بہو کے آتے ساتھ ہی مدحت نے نند کا کردار نبھانا شروع کر دیا ہے۔

فنکشن کے اختتام سے ہی ہما بیگم نے واپسی کے لیے تیاری کر لی۔

''ارے اب تو رات ہو رہی ہے آپ صبح ہی تو آئی ہیں۔''

ساجدہ بیگم ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

''ابھی سارہ اور اسفند ادھر ہی رہیں گے۔ مجھے اجازت دیں۔ ہما کو اپنے گھر میں ہی آرام سے نیند آتی ہے۔ وہ صبح سے بے چین ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ وہ بیمار نہ ہو جائے۔''

آج بھی حکمت، ہما کی زبان بول رہے تھے۔ حشمت کے چہرے پر دکھ کے گہرے سائے پھیل چکے تھے۔ مگر وہ لبوں پر قفل لگائے بیٹھے تھے۔

''جی اور رات کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے کا سفر ہے۔ اصل مسئلہ تو بے سکونی ہے۔ رات گئے بھی گھر پہنچے تو سکون تو ملے گا۔''

ہما بیگم بتانا نہ بھولی تھیں۔ اتنی زیادہ نوازشات اور اتنے زیادہ حسن سلوک نے بھی ان کو متاثر نہ کیا تھا۔ ساجدہ بیگم دل مسوس کر ان دونوں کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ یہی کیا کم تھا کہ ہفتہ کے لیے اسفند اور سارہ ادھر ہی تھے۔

☆☆☆

شادی کی فراغت کے بعد سب نے مل کر پروگرام بنایا گاؤں کی سیر کو جایا جائے۔ اس طرح سے سارہ اور اسفند کو پہلی مرتبہ دیہاتی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی مل سکے گا۔ سب کھیتوں کی سیر کو نکل کھڑے ہوئے تھے۔

گاؤں کا یہ سارا علاقہ چوہدری حشمت کی ملکیت میں تھا۔ اطراف کی ساری آبادی چوہدری حشمت کی بے پناہ عزت کرتی تھی۔

وہ جب گھوم پھر کر تھک گئے تو ٹیوب ویل کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ سارہ ٹیوب ویل سے تیز بہتے پانی کو دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ پھر نذیراں نے ان کو کھانے کی دعوت دے ڈالی۔ کھیتوں کا سارا نظام دیکھ بھال نذیراں اور اس کے شوہر بخشو کے حوالے تھا۔

سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی، ساتھ لسی سے بھرا گلاس اور مکھن میں تر بتر ——— گرما گرم روٹی نے اس قدر لطف دیا کہ اسفند ضرورت سے زیادہ کھانا کھا گیا تھا۔ یوں بھی جب سے وہ لوگ آئے تھے۔ تب سے گوشت کھا کھا کر عاجز آ چکے تھے۔ جبکہ سارہ اور اسفند کی نسبت وہ کچھ بھی نہیں کھا رہی تھی۔ ہنوز چپ چاپ بیٹھی اطراف میں کھیتوں کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے بعد ٹھنڈے کر کے لائے گئے آم ان کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ آم تو مدحت کی کمزوری تھے۔ آم کھاتے کھاتے اس کے ہاتھ بھر چکے تھے۔ وہ جس پھوہڑ پن سے کھا رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر اسفند جو بہت دیر سے اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اچانک ہی قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

''یہ کون سا طریقہ ہے آم کھانے کا، بندہ کاٹ کر طریقے سے منرز سے کھائے۔''

وہ اسے جتائے بنا نہ رہ سکا تھا۔ وہ ایک دم جیسے گہری سوچ سے بیدار ہوئی تھی۔ اس نے آم وہیں سامنے بھری ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ اور غصے سے بولی تھی۔

''یہ منرز وغیرہ آپ اپنے پاس ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ ہم بھی جاہل نہیں ہیں۔ الحمدللہ اس سال میں نے بھی گریجویشن مکمل کر لینا ہے اور اس سے اگلے ماہ ہاسٹل میں شفٹ ہو کر یونیورسٹی جاؤں گی۔ اپنے اصل کو نہیں بھولوں گی۔ مگر آپ اور آپ کی مام دونوں پر ہی مجھے ترس آتا ہے۔ جنہیں اپنا آپ سب سے زیادہ مہذب دکھائی دیتا ہے۔''

وہ خوں خوار انداز میں بولتی چلی گئی تھی۔ سارہ کو اپنی ماں کے حوالے سے اس کی بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی۔ اور پھر اس کے بعد قاسم اسے ٹوک گیا تھا۔

''بس کرو مدحو بات ختم کرو واپس چلتے ہیں۔''

وہ لجاجت سے بولا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایک مرتبہ وہ لب کشائی پہ اتر آئی تو اس کو خاموش کروانا دشوار گزار مرحلہ ثابت ہوگا۔ مگر اسفند بھی اس طرح کی حاضر جوابی پر آگ بگولہ سا ہو گیا تھا۔

''مذاق میں کی گئی بات کا رخ تم نے میری مام کی جانب پلٹ دیا۔ حیرت ہے۔''

وہ بے حد سنجیدہ سا سیدھا کھڑا اس کی جانب جواب طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''میرا اور آپ کا کوئی مذاق نہیں مسٹر، سمجھ گئے۔''

وہ کہتی ہنستاتی ہوئی گاڑی میں جا بیٹھی تھی۔ قاسم اسفند کا کندھا تھپتھپا کر رہ گیا تھا۔ شرمندگی کے سائے اس کے چہرے پر رقم تھے۔ جبکہ اسفند نے گہری سانس بھری تھی۔ اس کی بات کا ہی اثر تھا کہ اسی شام سارہ اور اسفند سب کے لاکھ منع کرنے اور روکنے کے باوجود واپس لوٹ گئے تھے۔ گھر میں اچانک ہی گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد سب ہی اداس تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں سب اسے ہی مورد الزام ٹھہرا رہے تھے۔ جو دو دن مہمان نوازی کے تقاضے نہ نبھا سکی تھی۔

اس نے پوری رات ٹہل کر گزاری تھی۔ ندامت شرمندگی اضطراب اور پشیمانی اس کے چہرے پر تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ ایک خاص جذبہ تھا۔ جس سے وہ خود ابھی تک آشنا نہ ہو سکی تھی۔ جاتے وقت وہ روکنا چاہتی تھی اور سارہ کی کلائی تھام کر اسفند سے معذرتی کلمات ادا کرنا چاہتی تھی مگر اکڑ اور برسوں کی انا کا وہ مینار اب ایک دم اچانک کیسے پاش پاش ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

صبح سویرے ہی وہ باہر لان میں نکل آئی تھی۔ جہاں چلتی ٹھنڈے ہوا اس کی روح میں اترتی پشیمانی کم نہ کر سکی تھی۔ اسفند سے معذرت تو کرنے کا حوصلہ پہلے ہی نہ تھا۔ اس پر اسفند نے سفری بیگ تھامے پردے کے پیچھے چھپتی ہوئی مدحت کو دیکھ لیا تھا اور اس کی کاٹ دار نگاہیں اس کی روح کو بھی تازیانہ لگا گئی تھیں۔ اب گھر کتنا ویران سا ہو گیا تھا۔ اتنے دنوں سے سب مل کر جل کر رہتے تھے۔ صبح سویرے ناشتا اکٹھے کیا جاتا تھا۔ اسفند کا ہمہ وقت مسکرانا اور ہنسی مذاق اب اسے شدت سے یاد آنے لگا تھا۔ اپنی انا کا بت پاش پاش نہ ہو۔ اس لیے گھر میں بھی اس نے کسی کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف نہ کیا تھا۔ اماں جان چپ چاپ دیکھتی رہتیں۔ پھر ایک دن اسے اپنے پاس بٹھا کر بولیں۔

''چند دنوں بعد تو تو نے بھی شہر چلے جانا ہے جب تک یہاں ہے۔ خوب ہنس بول۔ اس طرح کملائی ہوئی ادھر ادھر نہ ڈولتی رہا کر۔ دیکھ میرا جی گھبراتا ہے۔''

ساجدہ بیگم کے چہرے پر بکھرتی ہوئی بے بسی کو دیکھ کر مدحت کو گہرے ملال نے گھیر لیا تھا۔ تب ہی تو اس نے ماں جی کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ اور ان کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیا تھا۔

''پتا نہیں میں وہاں کیسے رہوں گی۔ اماں تیری یاد ستائے گی۔''

وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر اپنی آنکھیں موند گئی۔

''تو کس نے کہا ہے کہ تو اتنے پاپڑ بیل، اتنا تو پڑھ لکھ لیا ہے اور اب کیا ضرورت ہے آگے مغز ماری کرنے کی۔''

اماں کو بھی موقع مل گیا تھا۔ وہ اکثر اسے یہی سمجھاتی رہتی تھیں کہ وہ ناز و نعم میں پلی بڑھی ہے۔ یوں اجنبی جگہ اور اجنبی ماحول میں رہ نہیں کر پائے گی۔ ماشاء اللہ بی اے پاس ہے۔

مدحت کے لیے شاید کسی اور وقت میں ان باتوں کو مان لینے میں کوئی عار نہ ہوتا۔ مگر اب تو اسے بھی ضد سی ہو گئی تھی۔ اسفند اسے اس کی تعلیمی قابلیت کی وجہ سے ہی شاید کم تر سمجھ رہا تھا۔ وہ شہری لوگ سمجھتے ہیں کہ اعلا تعلیم اور سہولیات پر صرف ان کا ہی حق ہے۔ اس نے بھی دل میں پختہ عزم کر لیا تھا وہ بھی شہر میں جا کر پہلے پہل اپنی تعلیم مکمل کر لے گی۔ پھر بابا پر زور دے گی کہ وہ یہاں آ جائیں۔

پھر اسی ہفتے وہ قاسم ادا کے ساتھ روانہ ہو گئی تھی۔ اس کا ایڈمشن قاسم یونیورسٹی میں خود جا کر کروایا آیا تھا۔ جب وہ سفر کے لیے نکلی تو بابا جان کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ جبکہ ساجدہ بیگم تو باقاعدہ گلے لگا کر روئی تھیں۔

ان کا ہی تو قصور تھا اس کی ہر ضد مان کر اب

اسے اتنا ضدی بنا ڈالا تھا کہ اس ضد پر بھی ان کو اپنا سر جھکانا پڑا تھا۔ وہ شہری راستوں سے قطعی انجان شیشے کے پار نگاہیں ٹکائے بیٹھی اطراف کے نظاروں میں گم تھی۔ چونکی تو تب جب کار ایک عالی شان محل نما کوٹھی میں داخل ہوئی تھی۔

"قاسم ادا! یہ ہاسٹل ہے کیا؟"

اس کی آنکھوں میں گہرا استعجاب در آیا تھا۔ اور قاسم زیرلب مسکرا دیا تھا۔

"پگلی ہوگئی ہے کیا۔ بابا تجھے کب ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دے سکتے تھے۔ کچھ تیری ضد مانی اور کچھ اپنی منوا گئے۔ یہ تو حکمت چاچا کا گھر ہے اور تجھے اب یہیں رہنا ہوگا۔ جب تک تو تعلیم مکمل نہیں کر لیتی اور تجھے چھوڑنے لے جانے کی تمام تر ذمہ داری بھی حکمت چاچا کی ہے۔ اب دیکھ کوئی ایسی بات نہ کرنا یہاں کہ کوئی بدمزگی پیدا ہو۔ ورنہ تیرا اعلا تعلیم کے حصول کا خواب پھر تشنہ ہی رہ جائے گا۔"

قاسم اس پر انکشاف کر رہا تھا اور وہ واقعی اس وقت زلزلوں کی زد میں تھی۔ جس چہرے کے سامنے جانے سے وہ اب کتراتی تھی۔ اور دعا مانگتی تھی کہ اس کا اسفند سے سامنا نہ ہو۔ تو اب کیا دن رات اس چہرے کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ بوکھلا کر رہ گئی تھی۔

"دیکھ تو میرا ابھرا ہے، چل واپس چل، ابا کو کون بتائے گا تو ہاسٹل لے چل۔" وہ ترلے منتوں پر اتر آئی تھی۔

"کملی ہوگئی ہے کیا۔ یہاں سب کو معلوم ہے کہ ہم آرہے ہیں۔ سب منتظر ہیں۔ اب سیدھی طرح اتر۔"

قاسم نے اسے تنبیہ کی تو وہ منہ بسورے دل پر پتھر رکھ کر اتر گئی تھی۔

سامنے ہی بے حد خوب صورت کشادہ لان تھا۔ جہاں اطراف میں قدرے فاصلے سے بے حد خوب صورت کیاریاں بنی تھیں۔ سرسبز منظر دل کو بہلا رہا تھا۔

ملازم ان کی آمد کی اطلاع دیے آیا تھا۔ یہاں ملازموں کی ایک فوج بھرتی تھی۔ حکمت چاچا بہ نفس نفیس ان کے والہانہ استقبال کے لیے باہر آ گئے تھے۔

"رک کیوں گئے۔ بچو یہ اپنا گھر ہے تمہارا آؤ اندر آؤ۔ کب سے سب منتظر ہیں۔"

حکمت چاچا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی جبکہ قاسم کو گلے لگا لیا تھا۔ وہ قاسم اور حکمت چاچا کی ہمراہی میں اندر چل دی تھی۔ اندرونی حصہ بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر بہت خوب صورت تصاویر آویزاں تھیں۔ وہ تو مبہوت ہی رہ گئی تھی۔ سجاوٹ واقعی دیدہ زیب تھی۔ اس کو اپنی حویلی یاد آئی۔ جہاں صرف دیواریں تھیں یا بیرونی دیواروں پر منقش شدہ الفاظ تھے۔ تزئین و آرائش میں اس کا حویلی سے کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ وہ لاؤنج میں داخل ہوئے تھے۔ جہاں سارہ ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھتے ہوئے چینل سرچنگ میں مصروف تھی۔ اسے آتا دیکھ کر اس نے ریموٹ رکھ دیا اور لپک کر اس کو گلے لگا لیا۔

"میں بہت خوش ہوں۔" سارہ کی خوشی واقعی اس کے چہرے پر عیاں ہو رہی تھی۔ اس کے عین عقب میں وہی تھا۔ جو اسے سرے سے نظرانداز کیے قاسم سے مل رہا تھا جیسے برسوں کی شناسائی رہی ہو۔

"ہائے میں نے کتنا یاد کیا، تمہیں بتا نہیں سکتی اب دونوں مل کر یہاں خوب انجوائے کریں گے، میں تمہیں پورا شہر گھماؤں گی۔"

وہ بے حد محبت سے بول رہی تھی۔ جبکہ اس نے تو ان کو بے عزت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ کچن سے ہما چچی کی آواز آرہی تھی، وہ کسی بات پر ملازمہ کو ڈانٹ رہی تھیں۔ اگرچہ کام کاج کے لیے ملازم موجود تھے۔ مگر ہما بیگم اپنی نگرانی میں سارے کام کروانا پسند کرتی تھیں۔ ہما بیگم کے آنے پر وہ احتراماً اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سلام

pklibrary.com

کیا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹھو بیٹھو یہ فارمیلیٹیز نہیں چلنے والیں یہاں۔"

اس سے کہتے ہوئے فوراً ہی حکمت صاحب کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

"آپ نے مالی بابا کو کیوں چھٹی دے دی؟ اتنا کام باقی تھا۔

پودے مرجھا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں نا کہ میں لان کے معاملے میں کس قدر ٹچی ہوں۔"

ان کا لہجہ بے حد تیکھا سا تھا۔ حکمت صاحب یوں بے موقع اپنی کھنچائی پر کھسیانی ہنسی ہنس دیے تھے۔

"ارے بھئی مہمانوں نے آنا تھا تو دھیان ہی نہیں گیا۔ کہا تم تو ان کے ساتھ مصروف ہوگی اور پھر تمہاری عادت ہے سارے کام اپنی سپرویژن میں کرواتی ہو ــــ یہ مہمان، کچن کے بکھیڑے الگ سوچا مناسب سمجھا اسے واپسی کی راہ دکھا دی جائے۔"

حکمت صاحب نے ہلکے پھلکے لہجے میں ہنستے ہوئے وضاحت پیش کی تھی۔ جسے ہما بیگم نے درخور اعتنا نہیں جانا تھا۔

"مہمان کہاں ہیں۔ اب تو یہ یہاں مستقل ہی رہنے آگئی ہے تو کیا اس کی وجہ سے میں اپنی مصروفیت تج دوں گی۔"

وہ ناگواری سے گویا ہوئی تھیں۔

مدحت اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ تو خود بھی اپنی یہاں آمد سے قطعی طور پر لاعلم تھی۔

ہما بیگم یہ کہہ کر وہ لوگ فریش ہو جائیں کھانا لگواتی ہوں۔ کہیں گم ہو چکی تھیں۔ اس کا شرمندہ سا چہرہ دیکھ کر حکمت صاحب کہتے تھے۔

"بیٹا وہ زبان کی تیکھی ضرور ہے مگر دل کی بری نہیں۔ تم محسوس نہ کرنا۔ یہاں سارہ کے ساتھ خوب انجوائے کرو، ان باتوں کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

حکمت چاچا کی بات پر اس نے نم آنکھوں سے قدرے تشکر بھری نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا۔ واقعی اس وقت سراپا محبت۔

"آپ ناحق فکر مند ہو رہے ہیں بابا! مدحت بہت سمجھ دار ہے، سب سمجھتی ہے پھر مدحت خود بھی تو زبان کی کچھ کڑوی ہے۔ ہے نا مدحت۔"

مدحت اسفند کے کھٹے میٹھے طنز کو قطعاً پی کر رہ گئی تھی کیونکہ وہ باقاعدہ مضحکہ اڑاتے ــــ ہنس بھی رہا تھا۔

قاسم اوا کھانے کے بعد فوراً واپس چلے گئے تھے۔ ان کو واپس جانے کی جلدی تھی۔

"آؤ اداس نہ ہو۔ چلو سارا گھر دکھاتی ہوں۔"

سارہ اس کی کلائی تھامے اسے اپنے ساتھ لیے پورے گھر میں گھوم پھر رہی تھی۔ "یہ بابا اور ماما کا کمرہ ہے۔" ایک بے حد وسیع اور پرتعیش کمرے کا دروازہ کھول کر دکھایا تھا۔ اس کے آگے ہی مہمان خانہ تھا اور اس کے لیے الگ الگ باقاعدہ تین کمرے مختص تھے۔

"یہاں خالہ لوگ آتے رہتے ہیں یہ والا کمرہ کوکب کے پاس ہی رہتا ہے۔ دوسرا والا خالہ کے پاس اور جب ان کے ساتھ عمر کو آنا ہو تو وہ پھر اسفند بھائی کے ساتھ ہی روم شیئر کرنا پسند کرتا ہے۔ اس کا اپنا ہی ایک بیان ہے کہ اگر یہاں آکر بھی تنہا ہی کمرے میں سونا ہے تو پھر یہاں آنے کا فائدہ ہی کیا؟"

وہ بے حد محبت سے سب کا ذکر کر رہی تھی۔ مگر عمر کے ذکر پر اس کے چہرے کے جگنو جیسے ایک دم روشن ہو گئے تھے۔ اور وہ بنا کہے ہی سمجھ گئی تھی کہ عمر سے اس کا ایک خاص تعلق ہے۔

"جانتی ہو ہمارے یہاں بہت زیادہ لوگوں کا آنا جانا نہیں ہے۔ بس خالہ جانی اور ان کے بچے ہی آتے ہیں۔ اور بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں تو سالوں بعد ہی آتے ہیں۔"

وہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ ایسے موقع پر کیا کہنا

pklibrary.com

چاہیے۔ مدحت کی سمجھ میں نہ آیا۔
پھر اس نے اسے اس ستم گر کا کمرہ دکھایا۔ جہاں اس کی ایک تصویر فل سائز میں دیوار پر لگی تھی۔ وہ مبہوت اس کی مسکراتی نگاہوں میں جیسے کھو سی گئی تھی۔ اس کی دلکش مسکراہٹ میں ایک غرور تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ.....
"دیکھو تم اگر وڈیرے کی بیٹی ہونے کا زعم رکھتی ہو تو میں بھی ایک منفرد ہستی رکھتا ہوں۔"
وہ یک ٹک اسے دیکھے چلی گئی تھی۔ جب عقب سے اسفند کی آواز پر بری طرح چونک گئی تھی۔
"کیا بات ہے کیا میری تصویر چرانے کا ارادہ ہے؟"
اسفند کا شرارتی لہجہ اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آیا تھا۔
"خوش فہمی ہے آپ کی؟ چراتی ہے میری جوتی۔"
وہ اپنے دلی جذبات چھپا کر فوراً ہی سپاٹ لہجہ میں بولی تھی۔
"اسفند بھیا آپ پھر سے شروع ہو گئے۔ دیکھیں میری کزن کو تنگ نہ کریں۔"
سارہ نے فوراً ہی حمایتی لہجہ اختیار کر لیا تھا۔
"اچھا تو یہ تمہاری کزن ہے تو میری کون ہے؟"
نہ جانے سوال ایسا تھا یا اس کا انداز کہ مدحت کا دل زور سے دھڑک اٹھا تھا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں سی آ گئی تھیں۔
"سارہ! مجھے اب نیند آ رہی ہے۔ مجھے آرام کرنا ہے۔" یہاں سے فرار کا اسے یہی طریقہ سوجھا تھا۔
"اچھا ٹھیک ہے، تم آرام کر لو۔ پھر شام کو ملاقات ہوتی ہے چائے پر۔" سارہ اس کو اپنے کمرے میں لے آئی۔
"سارہ برا مت ماننا۔ اگر ہو سکے تو میں الگ کمرے میں ہی رہنا پسند کروں گی۔ دراصل میں وقت بے وقت جاگنے کی عادی ہوں۔ تم ڈسٹرب ہو گی۔" وہ دل کی بات بالآخر لبوں پر لے ہی آئی تھی۔
"کوئی مسئلہ نہیں ہے یار۔ چلو پھر تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آتی ہوں۔"
سارہ اسے ایک بے حد شان دار سے کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔ سفری سامان بھی یہاں فوراً ہی ملازم رکھ گیا تھا۔ اسے تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ فوراً لیٹ گئی۔
اس کی آنکھ شور و غل سے کھلی تھی۔ یہ شور یقیناً نیچے لاؤنج سے آ رہا تھا۔ برتنوں کی کھنک اور اس کے ساتھ ہی باتوں کی چہکار اور قہقہوں کی جلترنگ نیچے یقیناً گہما گہمی کا عالم تھا۔
فوری طور پر تو۔۔۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر یاد آنے کے بعد ایک دم اٹھ بیٹھی تھی۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔
"آجاؤ۔" اس نے دوپٹہ پھیلا کر اپنے بکھرے بالوں کو پونی سے باندھا تھا۔ سامنے ملازمہ مؤدب انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔
"بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں، آجائیں چائے کے لیے۔"
اس نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔ لمحہ بھر کے لیے تو اس کا جی چاہا کہ صاف کہہ دے کہ چائے یہیں لے آؤ۔ مگر یہ اس کی اپنی حویلی نہ تھی۔ سو خاموشی سے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی تھی۔ اوپر سے نیچے کا منظر صرف دکھائی دے رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔
ہما آنٹی کے پاس اس وقت ایک عمر رسیدہ خاتون بیٹھی تھیں، جو یقیناً ان کی بڑی بہن زہرہ تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر سلام کیا تھا۔ انہوں نے جانچتی نگاہوں سے مدحت کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔
سفید اور میرون کاٹن کے شلوار قمیص میں سادہ سے چہرے کے ساتھ وہ اس وقت انتہائی دلکش لگ رہی تھی۔
وہ اسے دیکھتی ہی رہ گئی تھیں۔ ساتھ بیٹھی ہوئی

کوکب نے بھی ناقدانہ نگاہوں سے اس کو دیکھا تھا۔ اور اپنے اندر امڈتے اضطراب کو دباتے اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ اسفند بھی وہیں موجود سموسوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جبکہ سارہ پکوڑے کھا رہی تھی۔ اس کے علاوہ ملازم نے سینڈوچز اور کباب بھی تیار کیے تھے۔ عمر اور اسفند چائے کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر بھی تبصرہ کر رہے تھے۔

سارہ نے اسے بھی چائے کا کپ تھما کر ساتھ بیٹھنے کے لیے جگہ دی تھی۔ وہ ایک جانب صوفہ پر ٹک گئی تھی۔

"اتنا عرصہ اپنے گھر والوں سے دور رہنا میں تو بالکل نہیں رہ سکتی۔ آپ کیسے رہ لوگی۔"

کوکب نے بات کا آغاز ہی اس کی یہاں موجودگی سے کیا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر تغفر دیکھ رہی تھی۔

"ہاں تو یہاں کون غیر ہے، سب اپنے ہی تو ہیں۔"

سارہ نے اس کی چپ کو دیکھ کر فوراً ہی جواب دیا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اتنے سالوں میں نہ تو اسے دیکھا اور نہ یہاں کوئی آیا۔ میرا جہاں تک خیال ہے یہ اس گھر میں بھی پہلی مرتبہ آئی ہے۔ میں نے تو اسے اتنے سالوں سے دیکھا تک نہیں۔ بہرحال اچھا ہی ہے۔ پینڈو سے ماڈرن ہو جائے گی۔"

آخری جملہ خاصا استہزائیہ انداز میں ادا کیا گیا تھا۔ کوکب کے دل میں اسے دیکھ کر جلن سی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے — حسن کے سامنے کوکب کی ماڈرن ازم پر خاک پڑتی دکھائی دے رہی تھی۔

اتنے دنوں تک وہ اسفند اور سارہ کو مس کرتی رہی تھی اور وہ لوگ جہاں تھے۔ وہاں کی واحد دلچسپی کا مرکز اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے آ چکا تھا۔ کم از کم کوکب، اسفند کے معاملے میں کچھ حساس سی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اسفند پر صرف اور صرف اس کا ہی حق ہے۔ بچپن سے آنا جانا میل جول دوستی تھی۔ اب عین جوانی میں جب اس کو امید بندھ چکی تھی کہ اس کا اور اسفند کا نام آپس میں جوڑ دیا جائے گا۔ تو درمیان میں یہ بلا کود پڑی تھی۔ وہ واقعی غضب کی حسین تھی۔ جس کی خوب صورتی دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

اسفند گاہے بہ گاہے کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جو اس ماحول کا حصہ ہو کر بھی اس ماحول کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔ سنجیدہ چہرہ اور چمکتی ذہانت سے پر نگاہیں، وہ نروٹھے پن سے بیگانگی تھی۔

"یونیورسٹی کھلنے میں تو ابھی چند دن ہیں ایسا کرو اسفند مدحت کو شہر گھما پھرا لاؤ۔" حکمت چچا نے اسفند سے کہا تو وہ فوراً مان گیا تھا۔

"ہاں بالکل اور پھر اس بہانے ہم بھی گھوم پھر لیں گے۔" عمر نے لقمہ دیا تھا۔

اس کے بعد پروگرام بننے لگا تھا کہ کل کہاں اور کس وقت نکلنا ہے۔ وہ بے دلی سے وہاں بیٹھی رہی۔ کوکب اسے بار بار جانچتی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ بالآخر دل کا سوال اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"منگنی ہو گئی تمہاری۔"

کوکب نے آپ سے تم تک کا فاصلہ ایک گھنٹہ میں طے کر لیا تھا۔ یوں بھی وہ اور سارہ اس سے چند ماہ چھوٹی ہی تو تھیں۔

"ان محترمہ کی جتنی اکڑ ہے نا اس کو دیکھ کر سولی چڑھنے کے لیے بھلا کون تیار ہوگا۔"

پاس بیٹھے اسفند نے لقمہ دیا تھا۔ کوکب کے چہرے پر اسفند کے جواب سے جیسے بشاشت سی لوٹ آئی تھی۔ اگر اسفند ہی اس میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔ تو اسے کیا مسئلہ ہو سکتا تھا۔ کوکب زور سے ہنس دی تھی۔ وہ بے حد خفگی سے اچانک اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے میں سونے جا رہی ہوں۔"

اس نے یہ اطلاع صرف سارہ کو پہنچائی تھی۔

"دوبارہ؟" سارہ متعجب تھی۔ کوکب نے مزید گل افشانی کی تھی۔

"دیہاتوں میں سنا ہے کہ لوگ یوں بھی جلدی سو جاتے ہیں۔ کرنا بھی کیا ہوتا ہے ادھر ادھر کی

چغلی۔"

اب مزید چپ رہنا مدحت کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔

"سارہ اپنی کزن کو کہہ دو کہ سارے دیہاتی شہر آگئے ہیں۔ کچھ تو یہیں کے ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں۔ وہ اپنی روایات واقدار کی پاس داری میں لگے ہیں۔"

سارہ دونوں کے درمیان میں سینڈوچ بن گئی تھی۔ جبکہ اسفند اس کا اشارہ بخوبی سمجھ چکا تھا۔ اس لیے اس نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"بیٹھ جاؤ مدحت! کھانا کھائے بنا سونا ہمارے گھر کی روایت میں شامل نہیں ہے۔ رہی بات کوکب کی تو اس نے ایک عمومی بات کی ہے۔ ورنہ اصل میں تو تم ہمارا ہی خون ہو۔ درست کہا نا میں نے کوکب۔"

اسفند کا لہجہ اس قدر سنجیدہ اور آنکھوں میں ایسا دبا دبا سا غصہ تھا کہ کوکب اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ انکار کرنے کی اس میں جرأت نہ رہی تھی۔ اسفند کے غصے کی اصل وجہ سمجھنے سے بھی عاری تھی۔ لیکن اگر وہ مدحت کی نگاہوں میں نمی دیکھ لیتی تو اسے اسفند کی ناراضی کی اصل وجہ بھی معلوم ہو جاتی۔

پھر کھانا بے حد خاموشی سے کھایا گیا تھا۔

دوسرے دن شام کو سب ہی ویو گئے تھے۔ سمندر کی اٹھتی لہریں کتنی پرکشش تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ تھامے کنارے کنارے چل رہی تھیں۔ کوکب کا مرکز نگاہ اسفند تھا۔ یہاں شہر میں یوں باتیں کرنا اور ساتھ میں گھومنے کو شاید معیوب نہ سمجھا جاتا تھا۔ تب ہی اس کا ہاتھ اسفند کے کاندھے پر بھی ٹک سا جاتا تھا۔ یہ سب مناظر مدحت کی نگاہوں سے قطعی اوجھل نہ رہے تھے۔

☆☆☆

آنے والے دن بے حد مصروف گزرے تھے۔ اس کی یونیورسٹی کلاسز کا آغاز زندگی ایک دم ہی بے حد مصروف ہو گئی تھی۔ اس کے اور اسفند کے اختلاف میں کمی آگئی تھی۔ اگرچہ اکثر اسے اسفند ہی یونیورسٹی چھوڑنے جاتا تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا جیسے کسی ایک نکتے پر ان دونوں نے خاموشی سمجھوتہ کر لیا ہو۔ ہر بات میں شعوری اور لاشعوری طور پر ایک دوسرے کی نفی کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی وجہ وہ مصروف زندگی بھی تھی جو اب مدحت نے اپنالی تھی۔

وہ صبح یونیورسٹی جاتی۔ اس کے بعد وہ سیدھا لائبریری میں گم ہو جاتی اور شام تک گھر لوٹتی تھی۔ آتے کے ساتھ ہی کمرے میں بند ہو جاتی تو پھر رات کے کھانے پر ہی سب سے ملاقات ہو پاتی تھی۔ وہ چپ کی بکل مارے بیٹھی رہتی تھی۔ ہر ویک اینڈ پر گھر والے بلاتے رہ جاتے۔ وہ مصروفیت کا بہانہ کر کے ٹال جاتی تھی۔ درحقیقت وہ سب سے خفا تھی۔ بالخصوص بابا سائیں سے اس نے اگر مزید پڑھنے کا ارادہ ظاہر کر بھی دیا تھا تو کیا یہ ضروری تھا کہ اسے یہاں رکنے کے لیے پابند کیا جاتا۔

اتنے عرصے میں اس نے کیا کیا نہ سہا تھا۔ اسفند کی طنزیہ مسکراتی نگاہیں۔ جواب صرف مسکراتی تھیں مگر طنز مفقود تھا۔ شروع میں اس نے ضبط کیا تھا کوکب کی تضحیک آمیز باتیں اور استہزائیہ رویہ۔ ہما بیگم کے چہرے پر مستقل والی ناگواری۔ جو اسے دیکھ کر سوا ہو جاتی تھی۔ ان کے ماتھے پر بل پڑ جاتے تھے۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ اسے رویے سمجھ میں آتے تھے۔

انہی رویوں کو سہتے سہتے اس نے کب سنجیدگی کی چادر اوڑھ لی تھی۔ وہ اکڑو گھمنڈی لڑکی، کب سادگی و عجز کا پیکر بن گئی تھی اسے خود معلوم نہ تھا۔

اب وہ کوکب کی باتوں کو ہنس کر برداشت کرنے کا ہنر سیکھ گئی تھی۔ اکثر تو اس کی آمد پر خود کو کمرے میں محدود کر لیتی تھی۔ اس دن اسے بھوکا ہی سونا پڑتا تھا یہ کہہ کر بھوک ہی نہیں ہے۔ اللہ اللہ کر کے سال ختم ہوا۔ دوسرے سال کے آغاز کے بعد اسے خبر ملی کہ اس کی اماں اس کے لیے بے حد فکر مند ہو کر بیمار پڑ گئی ہیں۔ وہ فوراً واپسی کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

''مجھے ابھی اسی وقت گھر جانا ہے۔''
رو رو کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔
حکمت چاچا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اسفند جو شام کی چائے پی رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر چونک سا گیا تھا۔
''چلو میں چھوڑ آتا ہوں تم تیاری پکڑو۔''
اور وہ جیسے یہی سننے کی منتظر تھی فوراً ہی اپنا سامان لے آئی تھی۔ جس وقت وہ گاڑی میں گھر سے نکل رہے تھے۔ اسی وقت پورچ میں کوکب کی کار داخل ہوئی تھی، کوکب کی آنکھوں میں تحیر اور بے یقینی رقم تھی۔ اسفند اسے روتے دیکھ کر دلاسے دے رہا تھا۔ کوکب جی جان سے سلگ گئی تھی۔
آندھی طوفان کی طرح گھر میں داخل ہوئی ہما بیگم پہلے ہی بیٹے کا یوں پوچھے بنا منہ اٹھا کر چل دینے پر غصہ تھیں۔ اس وقت جیسے دل کی بھڑاس نکالنے کی راہ مل گئی تھی۔
''تم نے دیکھا کتنا خودسر ہو گیا ہے۔ مجھ سے پوچھنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی اور میں نے اس بات پر حکمت صاحب سے بات کی تو وہ الگ منہ بنائے کمرے میں بند ہو گئے ہیں؟''
ہما بیگم کی بات پر کوکب نے گہری سانس لی تھی۔
''ٹھیک کہہ رہی ہیں آنٹی، یہ جو گاؤں کے ــــ لوگ ہوتے ہیں کہنے کو تو سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ مگر درحقیقت مکر و فریب میں لپٹی ہوئی شخصیت رکھتے ہیں۔''
کوکب نے بھی دل ہلکا کیا تھا۔ ہما بیگم بری طرح سے چونک گئی تھیں۔
''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ کھل کر کہو۔'' اب کے وہ سیدھا ہو بیٹھی تھیں۔
''سیدھی سی بات ہے کہ مجھے تو لگتا ہے کہ اب وہ لوگ آپ سے رشتہ داری باندھنے کے خواہش مند ہیں۔ یوں ہی تو کوئی اپنی بیٹی کو دو سال کے لیے نہیں بھیج دیتا نا۔''
کوکب کی بات پر ہما بیگم نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا تھا۔
''تم ٹھیک کہتی ہو۔ برسوں پہلے بھائی کے چلے جانے کا بدلہ، اب وہ لوگ میرے بیٹے کو مجھ سے چھین کر لینا چاہتے ہیں مگر یہ میں ہونے نہیں دوں گی۔ اب وہ لڑکی دوبارہ اس گھر میں قدم نہیں رکھے گی۔''
ہما بیگم نے فیصلہ کن لہجہ میں اعلان کیا تھا اور کوکب نے اپنے فشار خون کو توازن میں دیکھا تھا۔ یعنی اب اسے قرار مل گیا تھا۔

☆☆☆

حویلی جب تک نظروں کے سامنے رہ آ گئی۔ اس کے آنسوؤں کی رفتار کم ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ پھر حویلی کے احاطہ میں کار رکتے ہی وہ آندھی طوفان کی طرح کار سے نکل کر بھاگم بھاگ اماں کے کمرے تک پہنچی تھی۔ درمیان میں بھابھی اور اداہاشم اسے پکارتے رہ گئے تھے۔ اسے تو بس ماں سے ملنے کی جلدی تھی۔ اماں کے کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے غیر محسوس خاموشی کا احساس ہوا تھا۔
''یہ کیا؟ اماں تو یہاں کہیں بھی نہ تھیں؟''
اسفند کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ دیکھ کر رمدحت کو کہیں نہ کہیں گہری گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔
''تم پلیز ریلیکس ہو جاؤ۔ آنٹی بالکل ٹھیک ہیں اور کچن سے جو اشتہا انگیز خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ سب آنٹی کی کرامات ہیں۔ وہ تمہاری آمد کا سن کر اتنی خوش ہیں کہ بس۔''
وہ اپنی ہی رو میں بولتا چلا گیا۔ رمدحت جیسے سکتہ سے ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی تھی۔ آنسو تھم چکے تھے۔ اچانک ہی آگے بڑھ کر اس نے اونچے لمبے قد آور اسفند کے سینے پر مکوں کی بارش برسا دی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسفند کا منہ نوچ لے۔ مگر قد میں واضح فرق تھا۔ دوسرا وہ اتنی صفائی سے اپنا بچاؤ کر رہا تھا۔ جب اس کے مکوں میں کمی واقع ہونے کے بجائے مزید شدت آ گئی تو اسفند نے اس کی دونوں

کلائیاں مضبوط ہاتھوں میں تھام لی تھیں۔
"کیا ملتا ہے مجھے پریشان کر کے۔"

"بس کرو مدحت، بند کرو یہ بچپنا۔" اسفند کی آواز میں غصہ دبا دبا تھا۔ وہ اس کے مضبوط ہاتھوں میں مچل گئی تھی۔ خود کو چھڑانے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔

"مدحت تم ایک مغرور لڑکی ہو۔ اگر تم نے اس غرور کو سر کا تاج بنائے رکھا۔ تو ایک ایک کر کے سارے رشتوں کو کھو دو گی۔ میں نے قاسم سے کہا تھا کہ تمہیں آنٹی کی بیماری کی اطلاع دے۔ وہ روتی ہیں دن رات تمہارے لیے۔ تم نے ان کو کتنا رلایا۔ جبکہ ان کا کوئی بھی قصور نہیں تھا۔ تمہیں ہمارے گھر رہنے کا غصہ ہے نا۔ تو ٹھیک ہے یہاں سے واپسی پر میں خود تمہیں ہاسٹل چھوڑ کر آؤں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا۔ میری اور میرے اہل خانہ کی شکلیں پسند نہیں تو یہ بھی سر آنکھوں پر رہا۔ ہم اب تمہیں دکھائی نہیں دیں گے۔ ایک پورا سال تمہاری ماں تمہاری راہ تکتی رہی۔ اب آ ہی گئی ہو تو ان کو مزید دکھ نہ دو۔ جنہوں نے تمہاری اعلا تعلیم کے خواب کو پورا کرنے کے لیے اپنی مامتا کو پس پشت ڈال دیا۔"

اسفند نے یہ کہہ کر ایک جھٹکے سے اس کے بازو چھوڑ دیے تھے۔ وہ گرتے گرتے بچی تھی۔ یہ کہہ کر وہ رکا نہیں تھا کمرے سے نکل گیا تھا۔

واقعی وہ خود کو یا گھر والوں کو اتنے عرصے سزا دیتی رہی۔ دو مرتبہ ہاشم ادا اسے لینے آئے۔ اس نے سلام کرنے کے بعد خود کو کمرے میں قید کر لیا تھا اور اس کے بعد قاسم آیا تھا۔ مگر اس نے قاسم کو صاف کہلا بھیجا تھا کہ اب وہ تعلیم مکمل کر کے ہی لوٹے گی۔ اس سے پہلے گھر نہیں جائے گی اور اب جبکہ اس کے فائنل پیپرز میں چند ماہ کا وقفہ تھا اور اس کے بعد اس کی تعلیم مکمل ہو جاتی۔ تب بھی اس کی اس ضد میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

فون پر ماں کی آواز سن کر وہ بھی پگھلنے لگتی تھی۔ مگر نہ جانے کیوں اس نے طے کر لیا تھا کہ اب ایک ہی بار گھر لوٹے گی۔ اسے اس بات کا غصہ تھا اس سے بنا پوچھے دو سال کے لیے یہاں بھجوا دیا گیا تھا۔ اس کا بدلہ اس نے خوب لے لیا تھا۔ مگر خود اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ جب اماں نے کمرے میں آ کر اسے کلیجے سے لگایا تھا۔

"نہ دھی رانی، روتے نہیں، تو نہیں آنا چاہتی یہاں تو مت آ۔ جا واپس چلی جا، تو نے اسفند کو بھی خفا کر دیا اس نے تو کہا تھا۔ تائی اماں آج کا کھانا تو ہم سب مل کر کھائیں گے۔ رات کو مدحت یہاں موجود ہو گی اور اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔

وہ ماں کے گلے لگ گئی تھی۔ سارے شکوے آنسوؤں میں بہا ڈالے تھے۔

☆☆☆

مدحت نے نیا شوشا چھوڑا تھا اس کا کہنا تھا کہ اب وہ صرف پیپرز دینے ہی شہر جائے گی وہ بھی سیدھا حویلی سے اور دے کر لوٹ آئے گی۔ سارا انصاب اسے ازبر ہو چکا ہے۔ اور اب دوبارہ شہر جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ان دو ماہ میں وہ خوب دل لگا کر اپنی تیاری مکمل کرے گی۔ اسفند جانتا تھا کہ یہ گریز کیوں ہے۔

رات کے کھانے پر بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ بریانی، قورمہ، شیر خورما، بیسن کے لڈو اور مدحت کے پسندیدہ شامی کباب بھی تھے۔ مدحت اب تک اماں کے کندھے سے لگی بیٹھی تھی۔ جیسے ذرا بھی الگ ہوئی تو جدا ہو جائے گی۔

"لاؤ یہ کھا میں نے خود بنائے ہیں تیرے لیے۔"

وہ ایک ایک چیز اسے اپنے ہاتھوں سے کھلا رہی تھیں۔ اسفند وہیں موجود تھا۔ مگر اس کے چہرے پر تناؤ اور گہری سنجیدگی تھی۔

ایسا لگتا تھا جیسے کہ وہ مارے باندھے مجبوراً

یہاں بیٹھا۔ ورنہ کب کا واپس جا چکا ہوتا۔ اسے واقعی رشتوں کا تقدس اور مان رکھنا آتا تھا۔

صبح تڑکے کسی انجانے خوف اور خدشہ کے پیش نظر وہ جاگی تھی وہ اسے منالینا چاہتی تھی۔ دل میں کہیں اس کی خفگی سے گہرا ملال سا اترتا محسوس ہوتا تھا وہ باہر نکلی تھی۔ چار سو اس کو تلاشتی وہ لان کا سامنے کا حصہ بھی دیکھ آئی راہداری عبور کرتی اس کے کمرے تک ہو آئی تھی۔ دستک ہی دے ڈالے۔ مگر ہمت نہ ہوئی۔ وہ یونہی وہیں کوریڈور میں ٹہلتی رہی جب ہاشم ادا نے اسے پکارا تھا۔

"مدحوا تنی صبح جاگ گئیں۔ کیسی ہو آپ۔"

یہ اس کے اپنے تھے۔ اس کے پیارے جو اس سے ذرا سا بھی خفا نہ تھے۔ وہ مسکرا دی۔ پرجوش اور خوش دل مسکان نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔

"جی ادا میں ٹھیک ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ جاتے وقت اسفند سے سارہ کے لیے کچھ بھجوادوں۔" وہ بات بنا گئی تھی۔ دینے کے لیے تو اس کے پاس بہت سارے ان سلے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ کوئی بھی سندھی پوشاک اٹھا کر تحفتاً بھجوائی جاسکتی تھی۔ اس کی بات پر ادا ہاشم نے ہنکارا بھرا تھا۔

"وہ تو فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی نکل گیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ ناشتا گھر جا کر ہی کرے گا آپ۔"

یہ خبر اس کے دل میں ہلچل مچا گئی تھی۔ تو وہ خفا ہی لوٹ گیا تھا۔

اس نے بظاہر مسکرا کر یوں ظاہر کیا جیسے اس خبر سے چنداں فرق نہ پڑا ہو۔ مگر آنے والے دن اس کے لیے بے حد کٹھن ثابت ہونے والے تھے۔ جب کوئی من میت نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تب دل کو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ وہی دل کے نہاں خانوں میں قابض ہو چکا ہے۔

ایسا ہی بعد میں مدحت کے ساتھ بھی ہوا۔ پوری حویلی جیسے اسے کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ اس کی جامد چپ سے اماں ہولن جاتی تھیں۔ بابا سائیں تو اس کی نٹ کھٹ زندگی سے بھرپور شرارتوں کے لیے جیسے ترس سے گئے تھے۔

سب جانتے تھے کہ وہ شاید خفا ہے اب تک لیکن اس کے دل میں کیا ہے وہ کس بات سے اندر تک ٹوٹ چکی تھی کوئی نہ سمجھ سکا تھا۔

☆☆☆

"مام آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ آپ جانتی ہیں کہ میں اسفند کے لیے کتنا سچی ہوں۔ اس کے باوجود آپ نے ان لوگوں کو گھر بلالیا۔ وہ لڑکا جس کو میں جانتی تک نہیں۔ جس سے میں ملی تک نہیں آپ مجھے اس سے شادی کے لیے کیسے فورس کرسکتی ہیں۔"

کوکب کا انداز حیران کن تھا۔ آنکھوں میں شکوہ تھا اور خفگی بھی۔ زہرہ بیگم متانت بھری مسکان سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کوکب میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تم کیا چاہتی ہو اور کیا نہیں اس سے زیادہ اہم ہے کہ تم خوش رہو گی۔

"اس اسفند کی آنکھوں پر تو اس لڑکی مدحت کی محبت کی پٹی بندھی ہے۔ کیا تم اس کے دل سے ساری عمر مدحت کا نام ہی اکھاڑتی رہو گی۔ سب سے اہم تو یہ کہ کیا وہ تمہیں قبول بھی کرلے گا۔ تم عقل سے کام لو۔ جو لوگ آج آرہے ہیں وہ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔"

ماں کی بات پر کوکب کا جوش دھیما پڑ گیا۔ یہ تو واقعی سچ تھا کہ پچھلے کئی دنوں سے اسفند نظر انداز کر رہا تھا۔ جیسے ہی وہ ملنے کے لیے جاتی وہ کی چین اٹھاتا اور باہر نکل جاتا۔ کبھی تو رات گئے لوٹتا۔ سب سے بڑھ کر اس کی نگاہوں میں اڈتی وہ اجنبیت تھی۔

اسے چپ دیکھ کر وہ دوبارہ بولی تھیں۔

"دیکھو بیٹا میں یوں بھی وٹے سٹے کی قائل نہیں ہوں۔ عمر کی دیوانگی تم جانتی ہو سارہ کے لیے اس کے بعد تمہاری بات بھی طے کردی جاتی۔ اگر اسفند راضی ہوتا۔

اس نے تو گھر کی فضا بھی مکدر کر رکھی ہے کہ وہ مدحت کو اپنانا چاہتا ہے۔ حکمت بھائی اور ہما کے

درمیان اس بات کو لے کر گھر میں تناؤ سا ہے۔ اس سے پہلے ٹھکرا دی جاؤ۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ کوکب کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔"

کوکب بات کی تہہ تک پہنچ چکی تھی۔ تب ہی بولی تھی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے ماما مگر میں ان لوگوں کو خود پرکھوں گی۔ آپ فوراً ہاں مت کر دینا۔"

کوکب نے کہا تو زہرہ بیگم کھل اٹھی تھیں۔

"میری جان تم جب تک چاہو وقت لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اب اپنے بھائی کے حوالے سے خوش و خرم رہو۔ سارہ کے ساتھ مت بگاڑو۔ اور ہما کے ساتھ بھی۔ رہی بات اسفند کی تو جب میں اس رشتے کی خبر وہاں دوں گی کہ میری لاڈلی کوکب اب بیرون ملک جا رہی ہے سب حیران رہ جائیں گے۔"

اور پھر واقعی ماں کی بات سو فیصد سچ بات ہوئی۔ شام کو لڑکا اور اس کے والدین گھر آئے تھے۔ لڑکا اکلوتا تھا۔ ویل میٹرڈ تھا۔ خوبرو اور اعلا تعلیم یافتہ تھا۔ والدین بھی خاندانی اور رکھ رکھاؤ والے تھے۔ کوکب کو وہ اچھے لگے تھے۔

"مام تھینک یو سو مچ! امجد تو بہت ہینڈسم اور ویل میٹرڈ ہے۔"

"دیکھا میں نہ کہتی تھی کہ میری بیٹی کو اچھے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ بس تم اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔ اس امجد کی نگاہوں میں تو تمہارے لیے واضح پسندیدگی تھی۔ اس کے والدین بھی خوش خوش لوٹے ہیں۔ کل تک ضرور مثبت جواب آجائے گا۔ پھر تمہاری اور عمر کی شادی میں ایک ساتھ ہی کر دوں گی۔"

ماں کی بات پر وہ شرما گئی تھی۔ اسے اسفند کی پروا نہ تھی۔ جو اسے مسلسل نظر انداز کیے ہوئے تھا۔

"ہونہہ اسے وہ سو کالڈ ماڈرن لڑکی جو درحقیقت پینڈو ہے وہی سوٹ کرتی ہے۔"

دل میں کہیں نہ کہیں غصہ تو اب بھی تھا۔

☆☆☆

تجھے بھول جانے کی
جہد مسلسل رائیگاں ٹھہری
کیونکہ ہر بار دل جیتا
اور میں ہاری

وہ اسے جتنا بھلانے کی کوشش میں تھی وہ اسے اتنا ہی یاد آتا تھا۔ ہر سو اس کی مہک تھی۔ وہ تو اس کے دل و دماغ پر قابض تھا۔

وہ بند آنکھوں سے بھی اس کا چہرہ دیکھ لیتی تھی۔ مگر انا تھی اسے پلٹ کر پکارنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اگر وہ پلٹی تو شاید پتھر کی ہو جائے گی۔

رگ جاں میں
وہ حشر بپا ہے
تیرا عکس میرے دل کے
نہاں خانوں میں
تیرا اونچا استھان
حسن کے اونچے مسند پر
تو برا جمان ہے
اپنی پوری جاہ و حشمت کے ساتھ
ممکن ہے تیرا نقش پا
جواب ہے میرا نقش پا

اداسی بھرے دنوں میں اسے خبر ملی تھی کہ کوکب اور عمر کی شادی ہے۔ وہ یہ سن کر دم بخود سی رہ گئی۔ اسے ایک دم چکر سا آیا تھا۔ اگر پاس ہی دیوار کو تھام نہ لیتی تو شاید گر جاتی۔

"اوہ تو یہ تھی کہ تمہاری چاہت۔ جو آنکھوں کی ترجمان ہے مگر شاید میں ہی غلط تھی۔ تمہاری چاہت کا تم نے کب اعتراف کیا تھا۔ یہ تو میرے احساسات تھے۔ جو میں نے تم پر بھی لاگو کر ڈالے۔ اوہ۔"

وہ ٹوٹ کر بکھر رہی تھی۔

عمر اور سارہ کے لیے دل خوش تھا مگر جب اسفند کے ساتھ کوکب کا نام بھی سوچتی تو دل پارہ پارہ ہو جاتا تھا۔ اس نے تو شادی کے دعوت نامے کو کھول کر نہ دیکھے تھے۔ سب شادی کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ چار دن بعد کا ہی تو فنکشن تھا اور ادھر سے

مسلسل فون آرہے تھے کہ وہ لوگ مایوں مہندی پر یہاں موجود ہوں۔ وہ تو جیسے چپ کا روزہ رکھے اپنے کمرے میں مقید سارے جہان سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

"مدحت بیٹا! یہ دیکھ میں تیرے لیے کتنے پیارے کپڑے خود شہر سے لائی ہوں۔"

ساجدہ بیگم نے اس کے سامنے رنگ برنگے بے حد خوب صورت کامدار کپڑے پھیلا دیے تھے۔ وہ سارے بے حد نفیس اور دل موہ لینے والے تھے۔

مگر وہ یک ٹک انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ جب دل ہی مرجھا جائے تو رنگوں سے بھی عجب لاتعلقی محسوس ہوتی ہے۔

"اماں میں شادی میں نہیں جا رہی ہوں۔ سب چلے جائیں میرا جی نہیں چاہتا۔ پھر میری پڑھائی بھی تو ہے۔"

اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور سب جانتے تھے کہ وہ ضد کی کتنی پکی ہے۔ باری باری سب ہی نے اسے راضی کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔

تب بابا سائیں نے ہی روک دیا تھا۔

"اب کوئی اسے مجبور نہ کرے۔ میری بچی پہلے ہی مرجھا گئی ہے۔ نجانے وہاں کیسا سلوک ہوا ہے اس کے ساتھ۔ وہ خائف ہے۔ وہ وہاں جانا نہیں چاہتی ہے۔ پہلے بھی اپنی بات منوا کر ہم پچھتا رہے ہیں۔ اب کوئی اسے شادی میں جانے کا دوبارہ نہ کہے۔ سب جائیں۔ وہ نہیں جاتی تو کوئی بات نہیں۔"

ان کی بات اٹل تھی۔

"مگر اس کو اکیلا کیسے چھوڑا جا سکتا ہے۔"

ساجدہ بیگم متذبذب تھیں۔

"اری نیک بخت! کچھ ہوش کر بہو بیگم کا پورا وقت چل رہا ہے۔ ایسے میں وہ یہاں ہی رہے تو اچھا ہے۔ ہم بھی ولیمہ کے بعد ہی آجائیں گے۔"

اب مزید بات کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی تھی۔

ہاشم کا بھی یہی کہنا تھا کہ وہ صرف بارات میں ہی شریک ہوگا۔ اس کے بعد رات کو واپس گھر لوٹ آئے گا۔ مہندی ولیمہ میں نہ جائے گا۔ یوں اب کسی نے بھی دوبارہ مدحت کو نہ چھیڑا تھا۔ اس کے زخم تو اُدھڑ چکے تھے۔ وہ جب بھی آنکھیں بند کرتی تھی اسے کوکب اور اسفند ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے مسکراتے دکھائی دیتے تھے۔

وہ ساحل سمندر کا منظر اس کے اندر کرب اور اذیت بھر دیتا تھا۔ مہندی کی صبح سب لوگ چلے گئے اور وہ بھابھی بھیا گھر رہ گئے تھے۔

ساجدہ بیگم اس کی خبر گیری اور دیکھ ریکھ کا کہہ کر گئی تھیں۔ اس لیے بھابھی بیگم اس کے پاس آجاتی تھیں۔ دوپہر کو بھی سامنے بٹھا کر اسے پالک گوشت کھلایا اور رات بریانی بنوا کر کھلائی۔ وہ نہ نہ ہی کرتی رہ گئی تھی۔ رات آگئی جو ختم ہی نہ ہونے کا نام لے رہی تھی۔ صبح سویرے کہیں اس کی آنکھ لگی تھی۔ دن ڈھلے تک سوتی رہی۔ پھر کھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی تھی۔

منڈیروں پر دھوپ چڑھ چکی تھی۔ سارے ملازم اپنے اپنے کاموں پر لگے تھے۔ فیروزہ بی نے اس سے کچھ کھانے کا پوچھا تھا۔ اس نے فقط چائے پینے کا کہا تھا۔ فیروزہ بی جھٹ پٹ اس کے لیے چائے لائی تھیں۔ ساتھ میں اس کے منع کرنے کے باوجود بسکٹ لائی تھیں کہ خالی پیٹ چائے نہ پیے۔ اس نے بسکٹ کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔ چائے پینے لگی تھی۔

جب اچانک اس کے عین سامنے صوفے پر اسفند آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے کپ چھوٹ کر فرش پر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

"آپ یہاں؟" وہ حیرت زدہ رہ گئی تھی۔

"مجھے تو آنا ہی تھا کیسے نہ آتا۔" وہ بھاری لہجہ میں اسے بھرپور نگاہوں سے دیکھ کر بولا تھا۔

"کیوں ایسا کیا ضروری کام تھا یہاں جو عین اپنی شادی کے دن یہاں آگئے آپ؟"

ہاجرہ ریحان

دنیا اور درویش

ایک دن میں نے بہت غصے اور جلن کی حد تک پہنچ کر خداوند تعالیٰ سے کہا تھا۔

"اے میرے مالک یہ کیسی تپش ہے؟ جسم سلگ رہا ہے، روح تڑخ رہی ہے اور تیری دنیا کے

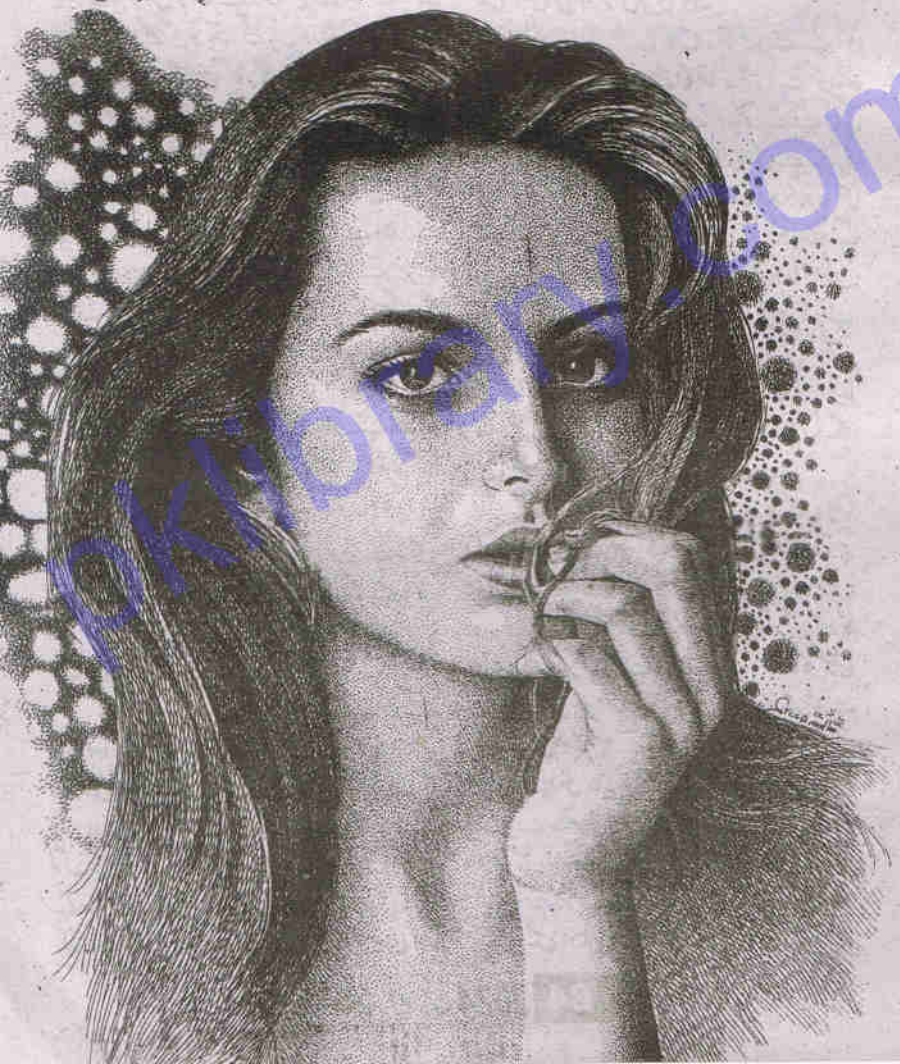

pklibrary.com

لوگ ہیں کہ آ کر مجھ سے کہتے ہیں کہ ان کے لیے دعا کروں؟ تو ہی بتا میرے مالک ایسی ناتوانی میں طاقت کہاں سے لاؤں؟ دل تو چاہتا ہے کہ ایک چھڑی ہوا میں لہراؤں اور جس کی جو بھی مانگ ہو، جھٹ پوری کردوں، مگر میری ایسی اوقات کہاں؟ میں جو بذات خود ایک ناکام، نااہل، نالائق انسان ہوں جو نہ دین کی ہے نہ دنیا کی، بھلا تیرے سامنے میری دعائیں کیا اہمیت رکھ سکتی ہیں؟ یہ شرف تو برگزیدہ اشخاص کو ملتا ہے۔ وہ تیرے سامنے جھولی پھیلاتے اچھے بھی تو کتنا لگتے ہیں اور میں۔

میں تو بہت ہی گناہ گار اور بے کار۔ انسان ہوں۔ اللہ تعالیٰ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ سب مجھ سے دعائیں مانگنے کا کہہ کر میرا مذاق اڑا رہے ہیں یا آئینہ دکھا رہے ہیں؟ ان سب کو کیسے سمجھاؤں کہ جب یہ مجھ سے دعا مانگنے کا کہتے ہیں تو مجھے، اپنے وجود سے اور بھی نفرت ہونے لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے میرے مالک، میں کہیں روپوش ہو جاؤں۔ ایسی جگہ چلی جاؤں کہ نظر آنا بند ہو جاؤں یا پھر ان سب کے سامنے میری اصلیت کھل جائے.....!"

دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے بلاوجہ کے جذباتی پن پر ہنسی آنے لگی۔ ایک شیطانی خیال سا کوندا۔

"ایسا بھی کیا مسئلہ ہے جب بھی کوئی دعا کرنے کا کہے، تم بھی جھٹ سر پر دوپٹہ ڈال کر بڑے مذہبی سے تاثرات چہرے پر طاری کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر بڑبڑا دیا کرو۔ کم از کم جو دعا کی درخواست کر رہا ہے اسے تو اطمینان ہو جائے گا ناں؟"

پھر میں سوچنے لگی کہ آخر یہ سب کب اور کیسے رونما ہوا؟ وہ کون سا دن تھا یا تاریخ تھی جس روز مجھ سے پہلی بار کسی نے دعا کے لیے کہا تھا؟ یاد کرنے پر بھی یاد نہ آیا بس اچانک ہی جیسے میرے اردگرد ایسے لوگ جمع ہونے لگے، جو ٹوٹے دل اور شکستہ شخصیت کے حامل تھے۔ دنیا سے مایوس اپنوں کی بے رخی کا زخم کھائے، جب وہ میرے آگے اپنی محرومیوں اور امیدوں کی پٹاری کھولتے تو مجھے لگتا میں ایک گہرے کنویں میں بیٹھی، اوپر گول دائرے میں نظر آتے آسمان کو تک رہی ہوں۔ جب میری اپنی ہی بصارت اتنے محدود آسمان کی حامل تھی تو بھلا کسی اور کے لیے نئے راستے نئی راہیں کہاں سے نکال سکتی تھی مگر پھر بھی میں خیالوں میں اپنے حصے میں آئے، محدود گول دائرے جیسے آسمان کو تکتی جاتی اور پھر کسی بے اختیار لمحے میں سامنے والے کے لیے دعا مانگ لیتی۔ اتنا تو میں کر سکتی تھی اور کر بھی دیتی تھی۔

اور یہ الگ طرح کا معمہ تھا میرے لیے، کئی دنوں سے یہ بھی سننے کو ملنے لگا تھا کہ جس نے بھی مجھ سے دعا کروائی تھی ان میں سے دو چار کے لیے کی گئی دعا واقعی قبول ہو گئی تھی۔ اب کیا یہ ضروری ہے کہ میری ہی دعا قبول ہوئی ہو؟ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہی دعا کسی اور کے لبوں سے نکل کر بارگاہ الٰہی میں قبولیت کے درجے تک پہنچی ہو اور میرے لبوں سے نکلی دعا آسمان کے کسی نچلے درجے میں ہی اٹک کر رہ گئی ہو؟ سب سے بڑا شکر کا مقام تو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دعا قبول ہونے پر کامیاب انسان کے نام، ایسا کوئی رقعہ نہیں نکلتا جو اسے یہ بھی بتا دے کہ اس کے لیے کی گئی دراصل کس کی دعا قبول ہوئی ہے۔

بالکل اسی طرح جیسے اکثر ہمیں یہ پتا نہیں چلتا کہ آخر ہمارے ہاتھ آئی چیزوں کی مسافت پر موجود وہ دیرینہ، دل لبھاتی اور پسندیدہ منزل دوسرے ہی لمحے ہمارے ہاتھ سے نکل کر کسی اور کا نصیب کیسے بن جاتی ہے؟ کیا یہ صرف قسمت کا کھیل ہے یا اس میں کسی انسان کی بدنیتی، بددعا یا پھر شدت طلب کا بھی لینا دینا ہے؟ اور اگر وہ جو مجھے لگتا تھا کہ میرے لیے ہی بنایا گیا ہے۔ مجھے ہی سونپا جائے گا اور میرے ساتھ ہی بوڑھا ہوگا، کسی اور کے ساتھ خوش و خرم، مکمل اور جامع نظر آ رہا ہے تو اس کے پیچھے ایسا کیا راز ہے جو صرف مجھے ہی سمجھ میں نہیں آ رہا؟ یا پھر ایسا دنیا میں ہوتا ہی ہے، بیچ میں کسی ون کے آئے

بغیر وہ محبت کرنے والے بچھڑ بھی سکتے ہیں۔ یہ کوئی انہونی نہیں۔ بس ہوتا یوں ہے کہ اس معمولی سی بات کے بعد، بغیر جتائے بغیر بتائے، ناکامی کا نہ ختم ہونے والا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اب مجھ میں آ رہا ہے کہ یہ دور دونوں طرف برابری سے چلتا ہے۔

اس وقت جب میں نے نیا نیا ناکام ہونا شروع کیا تھا تو مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اگر آپ زندگی میں مسلسل سے ناکام ہونا شروع کر دیں، تو لوگ آپ کو ناکام کہنا چھوڑ دیتے ہیں بلکہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ آپ دنیا دار نہیں ہیں اور جو دنیا دار نہیں ہوتے وہ اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتے ہیں۔

ہو بھی سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو مگر میرا معاملہ ذرا مختلف ہے، میرے ساتھ یوں ہوا کہ وہ شخص نہیں ملا تو جیسے میرا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا۔ کھاتی پیتی ہوں مصروف لاتعلق اور بے پرواہ دکھائی دینے کے لیے نوکری بھی کر رہی ہوں مگر کئی سال ہوئے میں نے آئینہ نہیں دیکھا۔ کسی بھی تقریب کے لیے خود کو سنوارا نہیں، تعلقات استوار رکھنے کی کوششیں یکسر ترک کر دیں اور اکثر تو یوں بھی ہوا کہ اپنے ساتھ کی گئی کسی کی برائی دیکھ لینے یا سن لینے پر غصہ تو کیا حیران تک نہ ہو پائی، جیسے مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا کہ میرے ساتھ یہی ہونا تھا۔ سمجھا جائے تو اب میں ردعمل دکھانے سے مکمل طور پر قاصر ہو چکی ہوں۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ ایک مشترکہ کزن کی بیٹی کی شادی میں، ایک خوب صورت سا نوجوان جس کو میں بالکل نہیں جانتی تھی میرے شادی ہال میں داخل ہوتے ہی مجھ سے پرتپاک انداز میں، ایسے ملا جیسے برسوں کی شناسائی ہو اور پھر یوں میرے ساتھ سائے کی طرح لگ گیا کہ شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ میں دوسرے بزرگ رشتہ داروں سے علیک سلیک کرتے اس کو بغور دیکھتی بھی جاتی۔ کون ہے یہ؟ کس کا لڑکا ہے؟ کئی سال ہوئے میں نے تو رشتہ داروں سے ایسا کوئی تعلق ہی رکھنا چھوڑ دیا ہے کہ ان کے جوان ہوتے بچے مجھے دیکھتے کے ساتھ ہی ملنے دوڑے آئیں۔ وہ بھی آج کل کے بچے، جن کے پاس اپنے ہی ماں باپ کے لیے وقت نہیں وہ کسی پھوپھی خالہ کو کہاں گھاس ڈالیں گے۔ وہ میرے ساتھ سائے کی طرح کچھ وقت رہا، پھر اپنے چھوٹے بھائی کے بلانے پر دوسری طرف چلا گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس تقریب میں وہ اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ آیا تھا۔

اس کی ماں جو کہ چند دن پہلے ہی پاکستان اپنی بہن کی شادی پر آئی تھی اور اتفاق سے اسے ہمارے کزن کی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ بھی مل گیا۔ میں شروع میں پہچان نہ سکی مگر میز پر بیٹھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ اپنے دونوں نوجوان لڑکوں کے ساتھ تھی، پتا نہیں کیوں مجھے نظر انداز بھی کرنا چاہ رہی تھی اور مجھے اپنی آسودہ زندگی کے بارے میں بتانے پر بھی بضد تھیم تب ہی وہ مجھ سے براہ راست بات کرنے کے بجائے کسی نہ کسی بہانے سے میری میز پر اردگرد بیٹھے دیگر رشتہ دار کے ساتھ بیٹھ کر اپنا حال احوال سنانے لگی۔

یہی کہ وہاں کی زندگی بہت سخت ہے۔ گھر کی صفائی، برتن کپڑے دھونا، کھانا پکانا سب خود ہی کرنا پڑتا ہے جبکہ وہاں جا کر بھی ہمارے مردوں میں ذرا بدلاؤ نہیں آتا وہ ویسے ہی سارا کام عورت کے ذمے کر کے، بس ایک نوکری کرتے ہیں اوپر سے چاہتے ہیں کہ وہاں پیدا ہونے والے بچے خاص طور سے لڑکوں کی تربیت بھی، یہاں کی روایت کے مطابق ہی ہو اور یہ کہ حالانکہ وہاں زندگی سخت، تیز اور بہت بے رحم ہے۔ پھر بھی وہاں ہزار ہا سہولیات بھی ہیں۔ وہ اور اس کا شوہر ایک دوسرے کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں کیونکہ وہاں یہ اصول ہے کہ میاں بیوی کو ہر روز نہیں تو ہفتہ بھر میں تنہائی ضرور دی جانی ہے اور یہ وقت وہ دونوں بہت زیادہ خوش رہ کر گزارتے ہیں۔ میں ناچاہتے ہوئے بھی اس کو سنتی چلی جا رہی تھی ایک وقت تو مجھے لگا جیسے وہ مجھ پر احسان جتا رہی ہو کہ اگر وہ ہمارے بیچ میں نہ آتی تو ابھی اتنا سب کچھ مجھے

برداشت کرنا پڑ رہا ہوتا اور دوسرے ہی لمحے مجھے چڑا بھی رہی ہو کہ دیکھو پینگیں تو تمہارے ساتھ بڑھائیں مگر تنہائی میں وقت میرے ساتھ بتاتا ہے۔

میں انجانے میں ہی، اس کو گھر میں دوڑ دوڑ کر کام کرتے بچوں کو ناشتہ دیتے ان کے بستے ان کو پکڑاتے تصور کرنے لگی اور اس کے ساتھ ہی میرا تصور اس طرف بھی گھوم گیا جو میرے لیے نامحرم تھا۔ آفس جانے کے لیے سلیقے سے تیار، اخبار میز کے ایک طرف پھیلائے نظر اخبار پر رکھتا، مگر دوسرے کونے پر موجود پلیٹ میں تلے ہوئے انڈے کو ڈبل روٹی کے ٹکڑے کے ساتھ کانٹے میں سلیقے سے پرو کر کھاتا ہوا، اپنے اردگرد ہوتے روز کے اس گھریلو ہنگامے سے بے پرواہ اور مطمئن وہ کس قدر جاذب نظر اور پرکشش لگتا ہوگا۔

مگر عجیب بات تھی، مجھے یہ سب تصور کرنے پر بھی اس کی بیوی سے نہ تو حسد ہی محسوس ہوا اور نہ ہی اس کی زندگی پر رشک آیا۔ وہ مجھ سے لاتعلق سی بنی رہنا چاہتی تھی تو میرا بھی فرض تھا کہ ایسا ہی ظاہر کرتی جاتی جیسے میں اس کی بات سن ہی نہیں پا رہی ہوں۔ ٹھیک ہی تو ہے، میں شاید اس کے لیے اس قدر فعال ثابت نہ ہو پاتی، بقول اس کی مرحوم والدہ وہ میرے آگے بھیگی بلی بن جایا کرتا تھا۔ میری چھوٹی سی خواہش کو بھی اپنے لیے حکم سمجھ لیا کرتا تھا۔ اس کی والدہ کو ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ میں ابھی ان کے بیٹے کو اس قدر استعمال کرتی ہوں تو شادی کے بعد تو وہ میرا بالکل ہی بے دام غلام بن کر رہ جائے گا اور شوہر اگر بیوی کے بے دام غلام بن جائیں تو ہمارے معاشرے میں مرد نہیں سمجھے جاتے۔ لہٰذا انہوں نے جان توڑ محنت کے بعد اپنے لڑکے کو نامرد ہونے سے بچالیا تھا۔

اس کی بیوی پہلے تو اس قدر باتونی نہ تھی جیسا کہ اب لگ رہی تھی۔ لوگ کہتے ہیں جو مرد اپنی بیویوں کو خوش رکھتے ہیں وہ ایسی ہی باتونی ہو جاتی ہیں اور اپنے شوہر کی برائی بھی بڑے مان سے کرتی ہیں۔

کھانا شروع ہونے پر وہ اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ دوسری میز پر چلی گئی تھی۔ اتنے میں بڑی پھوپھی ایک ہاتھ میں بڑی سی پلیٹ پر ذرا سی بریانی اور تلی مچھلی کا ننھا سا قتلہ جمائے، دوسرے ہاتھ سے کرسیوں کا سہارا لیتی لڑکھڑاتی آ کر میرے پاس بیٹھ گئیں۔ ”تم بھی جا کر جلدی سے کھانا لے آؤ۔ موئے بیرے تو فوراً سمیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ جتنی زیادہ ڈشیں ہوں گی۔ اتنا ہی کم کھانے کا وقت دیتے ہیں یہ لوگ ساری ملی بھگت ہوتی ہے دونوں انتظامیہ اور میزبان کی اور کیا......!“

بڑی پھوپھی کو شاید یاد نہیں رہا تھا کہ یہ ان کی ہی سگی پوتی کی شادی ہے۔

”اے ذرا ان کی تو سنو امریکہ اب کون سا دور ہے، پل پل کی خبریں ملتی رہتی ہیں یہاں، یہ اور بات کہ ہم ابھی بھی باہر والوں کو خود سے زیادہ خوش نصیب سمجھتے ہیں۔“

بڑی پھوپھی نے اس کی میز کے اردگرد جمگھٹا لگاتی لڑکیوں اور ان کی ماؤں کو دیکھ کر رازداری سے کہا۔

”ہم نے بھی چھ بچے پالے ساتھ میں ساس، سسر اور دو چھوٹے دیور اور ایک نند کو بھی سمجھو پالا...... مگر ہم نے تو کبھی اپنے منہ اس طرح اپنی تعریف نہ کی، وہ بھی اس قدر جھوٹ اللہ معافی!“

بڑی پھوپھی کی بات پر میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ بات تو سچ ہے کہ پورا خاندان بڑی پھوپھی کی سلیقہ مندی، خندہ پیشانی اور سسرالیوں کے لیے قربانیوں سے واقف بھی تھا اور خوب سراہتا بھی تھا۔

”ابھی چند دنوں پہلے ہی تو گیا تھا ریاض (بڑی پھوپھی کا بڑا پوتا) اپنی کمپنی کی کسی میٹنگ کے سلسلے میں امریکہ، تو میں نے ہی کہا تھا کہ جا رہے ہو بیٹا تو اپنے مرحوم باپ کے چچازاد سے بھی مل لینا، مانا سگا چچا نہیں مگر ہے تو رشتہ دار ہی۔ وہ بتانے لگا کہ اتنا چھوٹا سا تو گھر تھا کہ دونوں ہاتھ پھیلا لو تو کمرے کی چار دیواری سے ٹکرانے لگے۔ اس قدر تنگ سا ڈرائنگ روم اور پھر فرنیچر کے نام پر ایسے گندے میلے صوفے رکھے ہوئے تھے، جیسے گھر والے رات میں انہی پر سوتے ہوں اور سوتے ہی ہوں گے دو ہی تو کمرے تھے پورے گھر میں

pklibrary.com

ایک بیڈروم ایک ڈرائنگ روم۔"

بڑی پھوپھی اپنی دانست میں شاید، مجھے خوش کرنے کے لیے ایسی باتیں کر رہی تھیں مگر میرے حالیہ تراشے گئے خوب صورت تصور کو جیسے کسی نے ٹکر مار کر چکنا چور کر دیا تھا۔ میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ بڑی پھوپھی اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئیں۔

"اب کوئی پوچھے کہ اسی طرح رہنا تھا تو یہاں ہی رہ لیتے؟ اللہ بخشے اس کی مرحوم ماں کو ہی بہت شوق تھا کہ امریکہ جائے۔ وہاں ترقی کرے گا، ڈالر کمائے گا، ڈالر تو خاک کمائے، ماں ہی آخر وقت میں مل نہ سکی۔ یہ بھی وہاں جما بیٹھا رہا کہ "چھٹی نہیں مل رہی نہیں آ سکتا۔"

اور سچ پوچھو تو اس چکر میں ڈالنے والی بھی تو مرحومہ ہی تھی۔ یہ تو جانا ہی نہیں چاہتا تھا اچھی خاصی نوکری بھی کرنے لگا تھا زبردستی سب چھڑا کر وہاں بھیجا گیا، اصل میں تو مرحومہ کو جلن کسی اور بات کی تھی۔ کسی اور کی بیٹی کے لیے گڑھا کھودا تو اپنا ہی لڑکا اس میں گر پڑا اور کیا۔ آخر وقت تک میں سمجھاتی رہی کہ اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی۔ تمہارے آگے بھی بیٹیاں ہیں مگر نہیں بھئی، اللہ بچائے ایسی حسد کی آگ سے جو اپنا ہی گھر پھونک ڈالے۔"

میں دھیرے سے مسکرائی کیونکہ مجھے بڑی پھوپھی پر بڑا پیار آ گیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ واقعی ایک واحد بڑی پھوپھی ہی تھیں جنہوں نے ہم دونوں کی بات بنانے کے لیے کیا کیا نہ کیا تھا۔ اس نے تو مجھے چھوڑ کر نہ جانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ادھر میرے والدین بھی اس کی والدہ سے کھلے لفظوں میں میری برائیاں سن کر اس سے ہی ناراض ہو گئے تھے۔ اچھا خاصا ٹھن چکر بن گئے تھے ہم دونوں بہت کٹھن دن تھے وہ، میں اپنے گھر والوں کو مناتی رہتی۔ وہ اپنی ماں کو میری طرف سے دل صاف کرنے کا کہتے نہ تھکتا۔

ہم دونوں اس بات سے بے خبر سے زیادہ نڈر ہو گئے تھے کہ ایسے تماشے رشتہ دار، ساری عمر یاد رکھتے ہیں۔ مگر پھر بھی کوئی کسی رشتہ دار کی برائی میں اس قدر آگے نہیں بڑھ جاتا، جس طرح اس کی والدہ اور بہنیں میری دشمنی پر اتر آئی تھیں۔

پہلے اس کو امریکہ روانہ کیا اس کے بعد تاک میں بیٹھ گئیں جہاں میرا کوئی رشتہ آتا، وہ سب پتا چلا کر ان لوگوں کو متنفر کرنے پہنچ جاتیں۔

ویسے میں جھوٹ کیوں بولوں، یہ تو ان سب نے مجھ پر رحم ہی کیا کہ میں تو خود نہیں چاہتی تھی کہ اپنے میں کسی اور کے گھر جاؤں، حالانکہ یہ بھی جان چکی تھی کہ جدائی ختم ہونے والی نہیں پھر یہ بھی سوچتی کہ کسی کے ساتھ کی خاطر لوگوں کی نظروں میں اس قدر گر جانے کے بعد کیا کسی اور کی نظروں میں اپنے لیے عزت دیکھنا زیب ہی دیتا ہے مجھ کو؟

شروع شروع میں تو ہر رشتہ دار میری برائیاں سن کر محظوظ ہی ہوتا رہا، مگر جب وہ دو سال بعد آ کر یہاں سے ایک غیر خاندان کی لڑکی کو بیاہ کر واپس امریکہ

سدھارا تو جیسے رشتہ داروں میں آہستہ آہستہ میرے لیے الگ طرح کی ہمدردی پیدا ہونے لگی اور پھر یہ ہمدردی جانے کب احترام میں بدل گئی۔ کسی کو میری ثابت قدمی بھا گئی تو کوئی میری خاموشی سے متاثر ہو گیا۔

پھر بڑی پھوپھی کچھ سنبھل کر مجھے غور سے دیکھ کر ایک بار پھر تیز تیز لہجے میں بولنے لگیں۔

"اور بھئی ترقی کیسی؟ وہی جان توڑ محنت جو وہاں کرتے ہو یہاں کر لو تو شاید ملک کے حالات بھی سنور جائیں۔ یہاں تو بڑی اچھی نوکری مل گئی تھی۔ سب چھوڑ چھاڑ ماں کی ضد پر گیا مگر وہاں قدم نہ جما سکا۔ پہلے ٹیکسی چلائی، کسی شرابی کو گھر پہنچانے پر کرایہ کے ذرا سے جھگڑے پر گولی کھائی پھر زیادہ آمدنی کے چکر میں ٹرک چلانے لگے اور سنا کہ چند ماہ پہلے ایک دن ہائی وے پر ٹرک کو لوٹ لیا گیا تو نوکری سے بھی گئے اور اب ٹرک کمپنی کا نقصان پورا کرنے کے لیے بیوی لڑکوں کو بھیجا ہے کہ جا کر ابا سے اپنا حصہ مانگ کر لاؤ۔

اس عمر میں بچارے علیم الدین کو اپنا گھر بیچنا پڑ رہا ہے۔ بقول علیم الدین اس کو آفس سے جو ریٹائرمنٹ پر رقم ملی تھی اس سے یہ مکان کھڑا کیا تھا۔ اس کی تو محنت کی کمائی تھی ناں..... اور یہ کچھ کما کر دینے کے بجائے الٹا مانگنے آ گئے۔ دونوں بہنیں اپنے حصے کے لیے الگ شور مچا رہی ہیں مگر اس نے تو بات ہی ایسی ڈال دی۔ بچارا علیم الدین کیا کرے۔ سنا ہے کہ کمپنی کا نقصان پورا نہ کیا تو ساری عمر جیل میں گزارے گا۔"

پلیٹ پر غائب دماغی سے چلتا چمچ میرے ہاتھ سے گر پڑا اور منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا کہ یہی تو چاہ رہا ہے وہ خود کو تباہ کرنے کے لیے ہر حد پار کر رہے گا۔

بڑی پھوپھی اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئیں۔

"اللہ بچائے ایسے متلون مزاج مرد کے ساتھ نباہ کرنا آسان نہیں۔ ہم نے تو سنا ہے باقاعدہ پینے پلانے بھی لگا ہے، وہاں تو فیشن ہی ہے۔ مگر مہنگی بہت ہوتی ہے تب ہی تو آمدنی سے برکت اٹھ گئی۔ ارے ہر کسی کو راس نہیں آتے یہ کفار کے ملک..... اس قدر دنیا داری میں پڑ گیا جیسے مرنا ہی نہیں..... اچھا خاصا تھا یہاں اور نماز کی پابندی بھی کرتا تھا وہاں جا کر تو اس نے دنیا کی خاطر عاقبت ہی گنوا دی۔ اب یہ دولڑکے ہیں۔ دیکھو شاید یہ دونوں ہی کچھ طریقے سے زندگی گزار لیں۔"

دل چاہا کہ بڑی پھوپھی کو بتاؤں کہ وہ متلون مزاج بالکل نہیں ہے، ابھی تک جانے انجانے میں اپنی بات پر اڑا ہوا ہے کہ میرے بغیر زندگی نہیں..... ویسے تو مجھے سب کچھ سن کر دلی طور پر مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر پتا نہیں کیوں میں خود کو مطمئن محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔

کئی دنوں بعد، اس طرح کے جذبات محسوس کر کے اپنے زندہ ہونے کا احساس خوش آئند بھی تھا مگر ساتھ میں اس کی خانہ خراب زندگی کا تصور کرتے دل بھی دکھ گیا تھا۔ جھوٹ کیوں بولوں مجھے واقعی دکھ محسوس ہو رہا تھا۔ کھانا سمیٹا جا چکا تھا۔ دور دراز رشتہ دار آہستہ آہستہ لوٹ رہے تھے اور میرے لیے بھی رکنا مشکل تھا حالانکہ آج میں باقاعدہ بڑی پھوپھی کی بہت بار کی ڈانٹ اور پیار بھری تلقین کے بعد کسی تقریب میں آئی تھی اور یہی سوچا تھا کہ بڑی پھوپھی کی پوتی کی شادی میں اس کی رخصتی تک رکوں گی۔

بڑی پھوپھی کو میری بے چینی کا اندازہ ہو گیا تھا وہ خود بھی کچھ بدمزہ ہو رہی تھیں، بقول ان کے ان کی بہو نے ان کو بتائے بغیر دعوت نامہ بھیج دیا تھا۔ میں نے اجازت مانگی تو انہوں نے باز پرس کے بغیر فوراً ہی اجازت دے دی۔

"ہاں جاؤ..... پر سوچنا کچھ نہیں بس جو قسمت میں ہوتا ہے، وہ ہی ہمارے حق میں اچھا ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟"

بڑی پھوپھی نے الوداعی کلمات کے بعد گلے لگاتے مجھے دلاسا دیا۔ کئی دنوں بعد میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں مگر یہ موقعہ مناسب نہ تھا۔ میں خراماں خراماں ہال سے جانے کے لیے مڑی تو راستے میں اس کا بڑا بیٹا پھر مجھ سے آملا۔

"آپ جا رہی ہیں اتنی جلدی..... آپ کے

ساتھ تو کچھ وقت بتانا تھا مجھے۔'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولا۔ کوئی اور بچہ مجھ سے ایسی خواہش کا اظہار کرتا تو میں باخوشی اس سے کہتی کہ کسی دن شام کی چائے وہ میرے ساتھ پی سکتا ہے۔ میں نے جواب دینے کے بجائے صرف مسکرا کر بات ٹالنی چاہی۔ پتا نہیں کیوں میری خاموشی یا اس کی بات کو نظرانداز کرنے پر وہ بددل سا ہو کر میرے ساتھ چلتا ہوا ہال میں چاروں طرف نظریں گھمانے لگا۔

''بہت چھوٹا ہوں آپ سے مگر اتنی تو اجازت دیں کہ آپ کو بابا کا پیغام ہی دے سکوں؟''

میرے قدم لڑکھڑا گئے، خود کو سنبھالنے کے لیے میں نے اس کا مضبوط بازو تھاما اور ساتھ ہی منہ سے بے اختیار یا اللہ نکل گیا۔ اب وہ عمر نہیں رہی مگر قسمت سے مقام پھر ایسا آ گیا کہ بے اختیار دل اچھل کر حلق میں آ لگا ہے۔ میں اس کے کچھ اور کہنے سے پہلے بول پڑی۔

''مجھے وہ پیغام نہیں سننا ہے۔''

وہ چلتے چلتے ٹھٹکا جیسے اسے میری بات پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر بچوں کی طرح مچل کر بولا۔

''تو پھر جب بابا پوچھیں گے تو کیا کہوں؟''

''یہی کہنا کہ جب تم نے مجھے پیغام دینا چاہا تو میں نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔''

میرے صاف جواب دینے پر اسی طرح چاروں طرف دیکھتا، جیسے بس یوں ہی میرے ساتھ چلنے لگا ہو وہ تھوڑی دیر بعد پھر گویا ہوا۔

''تو پھر آپ میری ایک التجا ہی سن لیں۔ کم از کم بابا کے لیے دعا تو کر ہی دیجیے گا۔ میں نے سنا ہے آپ کی دعائیں فوراً قبول ہو جاتی ہیں۔ شاید آپ کی دعا بابا کے کام آ جائے؟''

میں شادی ہال کے داخلی دروازے پر سانس لینے کے لیے رکی اور پھر اپنے ڈرائیور کو گاڑی سمیت دروازے پر منتظر پا کر، اس کو کوئی جواب یا اشارہ دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔

☆☆

الف لیلہ
ہزار داستانیں

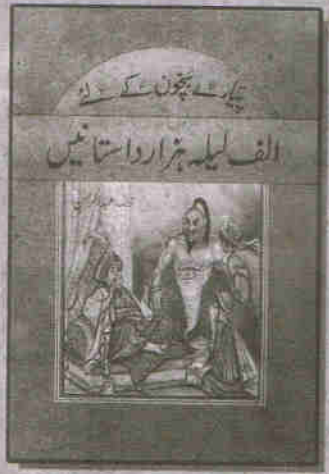

دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنھیں پڑھ کر بچے ہیری پوٹر کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنھیں بڑے بھی پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں

-/300 روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لیے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

نظیر فاطمہ

عید کا تحفہ

"یاسر! پلیز آپ مان جائیں نا، اس عید پر میں امی جان کے پاس چلی جاؤں، دیکھیں نا میری شادی کے بعد پہلی عید ہے اور زندگی میں پہلی دفعہ ایسا ہوگا کہ امی اکیلے عید کریں گی۔"

صوفیہ نے بڑی آس سے یاسر کو دیکھا۔ آج چھبیسواں روزہ تھا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ شادی کے بعد تمہاری پہلی عید ہے تو تمہیں یہاں گھر میں سب کے ساتھ ہونا چاہیے۔" یاسر کا سارا دھیان اپنی تیاری پر تھا۔ وہ دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔

"یہاں تو سب ہیں، امی، ابو، عدیل، آپ اور پھر عید کی شام تک آپا بھی تو آجائیں گی نا۔"

صوفیہ نے ایک اور کوشش کی۔

"یار! تم بحث کیوں کرنے لگتی ہو کہہ دیا ہے نہیں تو نہیں، تم عید یہیں اپنے گھر میں سب کے ساتھ کرو گی۔"

یاسر نے قدرے سختی سے کہا۔ صوفیہ یک دم خاموش ہوگئی۔ شادی کے بعد سے اس نے کبھی یاسر کا ایسا لہجہ نہیں سنا تھا۔ اسے اس کا لہجہ برا لگا تھا مگر وہ کوئی جواب دیے بغیر پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ سر جھٹک کر اپنے بال بنانے لگا۔

☆☆☆

صوفیہ پر بددلی سی چھا گئی تھی۔ اسے رہ رہ کر اپنی امی کی تنہائی کا خیال آرہا تھا۔ صوفیہ کے ابو سات آٹھ ماہ پہلے انتقال کر گئے تھے۔ بھائی دونوں ملک سے باہر تھے۔ اس شہر میں کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہیں تھا جو امی کے پاس آجاتا یا امی ان کی طرف چلی جاتیں۔ ایسے میں صوفیہ کو عید پر امی کا یوں اکیلے رہنا تڑپا رہا تھا۔ اس لیے وہ چاہ رہی تھی کہ عید پر امی کے ہاں چلی جائے۔

"کیا بات ہے صوفیہ! اتنی ست کیوں ہو آج؟" شام کو اسے ڈھیلے ڈھالے انداز میں افطاری کی تیاری کرتے ہوئے دیکھ کر ناصرہ بیگم نے پوچھا۔

"ایسے ہی امی، بس طبیعت کچھ ست ہو رہی ہے۔" صوفیہ کا انداز بجھا سا تھا۔

"تو تم بتا دیتیں بیٹا، آج افطاری میں صرف چنا چاٹ اور فروٹ ہی کر لیتے۔"

"نہیں امی، بس یہ پکوڑے ہی تو بنانے ہیں، چنا چاٹ آپ نے بنا دی ہے۔ فروٹ بھی میں نے کاٹ لیا ہے۔" صوفیہ کام مکمل کر کے ناصرہ بیگم کے پاس آبیٹھی۔

"امی!" ایک بات کہنی تھی آپ سے؟"

"بولو بیٹا! انہوں نے تسبیح مکمل کر کے مٹھی میں دبالی اور اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"میری امی اس عید پر اکیلی ہوں گی تو میں چاہ رہی تھی کہ میں یہ عید اپنی امی کے ساتھ منالوں۔" صوفیہ نے ساس کا چہرہ دیکھا۔

"یاسر سے پوچھا ہے؟"

"جی۔"

"تو وہ کیا کہتا ہے؟"

"انہوں نے منع کر دیا ہے۔"

صوفیہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔ آواز دھیمی اور گیلی سی تھی۔ جیسے بہت سے آنسو حلق میں پھنسے ہوں۔

Saban

"دیکھو بیٹا، یہ تم دنوں میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ اگر اس نے منع کر دیا ہے تو مت جاؤ۔ یاسر کے منع کرنے کے بعد تمہیں مجھ سے بات ہی نہیں کرنا چاہیے تھی۔" ناصرہ بیگم نے پلو جھاڑا۔ صوفیہ آنسو پیتے ہوئے اٹھ گئی۔ ناصرہ بیگم کچھ دیر سوچتی رہیں اور پھر دوبارہ تسبیح پڑھنے لگیں۔

صوفیہ کو ناصرہ بیگم سے اتنے کورے جواب کی امید نہیں تھی۔ لیکن امیدوں کا کیا ہے یہ ہوتی ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ یاسر صوفیہ کا اداس چہرہ دیکھ رہا تھا مگر اس نے نظر انداز کر دیا۔ جانتا تھا کہ تھوڑی ہمدردی دکھا تو اسے جانے کی اجازت دینا پڑتی۔

☆☆☆

آخر کار صوفیہ نے اپنے دل کو سمجھا لیا۔ وہ روز فون پر اپنی امی سے بات کرتی تھی۔ انہیں اپنا بہت خیال رکھنے کی تاکید کرتی تھی۔ ان کی ایک پرانی ملازمہ امی کے ساتھ چوبیس گھنٹے رہتی تھی۔ پھر بھی صوفیہ کو ان کی طرف سے پریشانی لگی تھی۔ وہ اور یاسر اکثر جا کر ان کی خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ ان کے مہینے کا سودا سلف لانے اور بل وغیرہ جمع کرانے کی ذمہ داری یاسر نے خوش اسلوبی سے اٹھا رکھی تھی۔ اسی وجہ سے صوفیہ نے عید، امی کے ساتھ منانے کا منصوبہ بنا لیا تھا کہ یاسر کون سا اسے روکیں گے۔ مگر یہاں یاسر نے اس کی ایک نہ مانی۔

☆☆☆

چاند رات آن پہنچی تھی۔ صوفیہ اپنی ساس کے ساتھ مل کر اگلے روز، بنائے جانے والے میٹھے کی تیاری کر رہی تھی۔ دونوں ہلکی پھلکی بات چیت بھی کر رہی تھیں۔ ابو ٹی وی دیکھ رہے تھے اور عدیل کہیں دوستوں کے ساتھ گیا ہوا تھا۔ ناصرہ بیگم کے موبائل پر یاسر کی کال آئی۔

"صوفیہ! مجھے ایک گلاس پانی دینا۔" کال ختم کر کے ناصرہ بیگم نے صوفیہ کو مخاطب کیا۔ وہ کچن میں پانی لینے چلی گئی۔ پانی لے کر واپس آئی اس کی امی، اس کی ساس کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھیں۔

"امی!" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے۔

"اے لڑکی، پہلے مجھے پانی کا گلاس پکڑا دو۔ پانی میں آنسو نہ ملا دینا۔" ناصرہ بیگم نے ہنس کر کہا تو صوفیہ نے پانی کا گلاس انہیں پکڑایا اور اپنی امی کے گلے جا لگی۔

"آنٹی عید ہمارے ساتھ کریں گی۔" یاسر نے کہا تو صوفیہ نے اسے دیکھا۔

"شکریہ یاسر۔" صوفیہ نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"شکریہ میرا نہیں محترمہ! امی کا ادا کرو جنہوں نے مجھے یہ مشورہ دیا۔" یاسر نے اپنی ماں کو محبت پاش نظروں سے دیکھا۔

"شکریہ امی!" صوفیہ نے ساس کے ہاتھ تھام لیے۔

"کیا شکریہ پگلی، عید تو خاندان والے مل جل کر مناتے ہی اچھے لگتے ہیں اور اب تمہاری امی بھی تو ہمارے خاندان کا حصہ ہیں، تو ہم انہیں عید پر تنہا کیسے چھوڑ دیتے۔" ناصرہ بیگم مسکرائیں۔

☆☆☆

"آپ نے عید کا اتنا بڑا تحفہ دیا ہے مجھے، میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟" سب کاموں سے فارغ ہو کر صوفیہ کمرے میں آئی اور یاسر کے برابر بیٹھ کر اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگی۔

"شکریہ ادا کرنے کا طریقہ میں بتاؤں گا تو تم برا مان جاؤ گی۔" یاسر کے لہجے میں شرارت تھی۔

"آپ اپنے طریقے اپنے پاس رکھیں۔" صوفیہ ہنسی۔

"تو چلو تم اپنے طریقے سے شکریہ ادا کر دو۔" یاسر بسورا۔

"میاں بیوی میں شکریہ نہیں ہوتا۔" صوفیہ نے اس کے کندھے پر سر ٹکایا تو یاسر اس کی چالاکی پر مسکرا دیا۔

☆☆

ماہنامہ کرن

اپریل 2024ء کے شمارے کی ایک جھلک

- عید کے حوالے سے شاہین رشید کا سروے،
- رائٹر "سعدیہ عزیز آفریدی" سے ملاقات،
- "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول،
- "سنگ ریزہ" سنیعہ عمیر کا مکمل ناول،
- "سپاس گزار" میمونہ صدف کے ناولٹ کی آخری قسط،
- "میرے مہرباں" شمائلہ ذالعباد کا ناولٹ،
- "تو میرا رنگ عید" قرۃ العین خرم ہاشمی کا ناولٹ،
- فرح انیس، جویریہ مریم، مریم شہزادا اور صبا واجد کے افسانے اور مستقل سلسلے،

"کرن کتاب"

"بیوٹی ٹپس، مفید ٹوٹکے اور مزیدار کھانوں کی ترکیبوں کے ساتھ"

اپریل 2024ء کا شمارہ شائع ہوگیا

pklibrary.com

سنعیہ عمیر

مکمل ناول

محبت میراث میری

وہ دونوں دوست عمر کے اس حصے میں تھے جب انہوں نے وہ سارے کام کر لیے تھے، جن سے کبھی ان کے والدین روکتے تھے۔ جیسے کہ مغرب کے بعد باہر رہنا۔ ساری رات کرکٹ کھیلنا اور بائیک پر بیٹھ کر اکیلے شہر کا چکر لگا آنا۔ اب وہ اس کام کے لیے نکلے تھے جن کے بارے میں ان کے ماں باپ کو وہم و گمان تک نہیں تھا کہ کبھی ان کی اولاد یہ کام بھی کرے گی اور وہ بھی دن کے اجالے میں۔

"زمین کا آخری سرا بھی دور رہ گیا ہے۔ وہ دیکھو اونچی دیواروں والا مکان آ گیا ہے۔ چل واپس چلیں۔" ارشد نے کانپ کر اپنے دوست کا ہاتھ پکڑا۔

"ہٹ ڈرپوک میں آج گیدڑ دیکھے بنا نہیں جاؤں گا۔" حسام آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا کہ کہیں کسی آہٹ سے گیدڑ محتاط نہ ہو جائے۔

"کچھ خاص نہیں ہوتا کتے جیسا ہوتا ہے۔ اس کے لیے اپنی زندگی خطرے میں مت ڈالو یہ جگہ بہت خطرناک ہے۔" ارشد کی تو جان حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔

حسام گاؤں کے معتبر آدمی کمال شاہ کا بیٹا تھا۔

اس کے دادا کفایت شاہ اپنے وقت میں روحانی پیشوا تھے۔ بچپن سے اس نے گاؤں کو اپنی ملکیت محسوس کیا تھا اور گاؤں والوں کو رعایا۔ پڑھ لکھ گیا تھا۔ شکل ویسے ہی اچھی تھی اور بال اس نے کندھے تک بڑھا رکھے تھے۔ وہ خود کو ہیرو سمجھتا تھا۔ اس روز کھیل کے میدان میں اس کی مخالف ٹیم سے لڑائی ہو گئی۔ کسی نے حسام کو طعنہ دیا کہ تم اس مٹی کے ہو ہی نہیں۔ تم نے تو آج تک گیدڑ بھی نہیں دیکھا۔ لڑائی جھگڑا تو بھرپور ہوا مگر یہ طعنہ حسام کے دل پر لگ گیا۔ اب وہ ارشد کو گھسیٹ کر گاؤں کے بیرونی ویران حصے میں آ نکلا تھا۔ سنا تھا یہاں گیدڑ ہوتے ہیں۔ وہ ارشد کی بزدلی سے واقف تھا۔ پھر بھی اس کو اس لیے لایا تھا کیونکہ اسے گیدڑ کی پہچان تھی۔ وہ ویران حصہ جنگل بن چکا تھا۔ لمبی لمبی گھاس خودرو پودے خشک رنگ ہونے کے باوجود وحشت زدہ لگ رہے تھے۔ کیونکہ چاروں طرف سے ان جھاڑیوں اور پودوں میں گھرا ایک بھوت بنگلا تھا۔ بھوری اینٹوں والا وہ مکان اب قابل دسترس نہیں رہا تھا۔

اس کے چاروں طرف جھاڑیاں اور درخت دیواروں سے لپٹے تھے۔ کبھی اندر جانے کا کوئی راستہ ہوا کرتا تھا جو اب نہیں تھا۔

"سارے راستے بند ہیں۔ اندر اگر کوئی بھوت ہے بھی تو باہر نہیں آ سکے گا۔ بے فکر رہو۔" حسام نے ارشد کو چھیڑا۔

"تمہیں مذاق لگ رہا ہے مگر یہ مذاق نہیں ہے۔ میں ایک دفعہ چار اور لڑکوں کے ساتھ ادھر آ نکلا تھا۔ تب یہ کھنڈر بہت بہتر حالت میں تھا۔ تمہارے جیسا خود کو میں مار خان سمجھنے والا میرا دوست پانی ڈھونڈتا بہت قریب پہنچ گیا۔ زمین لرز اٹھی تھی۔ کانچ ٹوٹنے کی آواز آئی اور ایک سایہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ اس نے بہت مشکل سے بھاگ کر اپنی جان بچائی تھی۔ اگلا پورا ہفتہ وہ بول نہیں سکا تھا۔" ارشد نے سارا قصہ بتایا۔

حسام یہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ یہ واحد قصہ نہیں

pklibrary.com

تھا۔ پچھلے دس سالوں میں کئی بار لوگوں نے یہاں سائے دیکھے تھے۔ ایک نے قسم اٹھائی تھی کہ یہاں ایک چڑیل پائل پہن کر رات کو گاتی تو ہے اور رقص بھی کرتی ہے۔

"اچھا پاس نہیں جاتے یہاں دور سے ہی انتظار کر لیتے ہیں۔ گیدڑ ہوگا تو اسی ویرانے میں ہوگا۔" حسام نے پھر کہا۔

ویسے اسے اب گیدڑ دیکھنے کا ارمان نہیں رہا تھا۔

"یہ جگہ لعنت زدہ ہے جو مر جاتے ہیں ان کی نحوست پیچھے رہ جاتی ہے۔ جانتے ہو نا یہ امکان دو باغیوں کا گھر تھا۔ جنہیں اپنے ہی گھر والوں نے نکال دیا تھا ان کے لیے پورا گاؤں سارا علاقہ بلکہ پوری دنیا ان کی دشمن تھی۔ کسی نے ان کی محبت کو قبول نہیں کیا تھا۔ وہ بدلہ لینے کے لیے کسی نہ کسی شکل میں ابھی یہاں ہوں گے۔" ارشد کو روشن آسمان پر سفید روحیں دکھنے لگی تھیں۔

"وہ باغی نہیں تھے محبت کرنے والے تھے۔" حسام نے صحیح کی۔ وہ بلا کا پرسکون تھا۔

"زندگی میں جو بھی تھے مرنے کے بعد ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔" ارشد کو اب حسام سے بھی خوف آ رہا تھا۔ جیسے اس پر بھی آسیب ہو ورنہ وہ اس بھوتیا جگہ پر پرسکون کیسے رہ سکتا تھا۔

"میرے ہوتے ہوئے وہ بھوت تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔" حسام نے سرد آہ بھری۔

"تمہیں خود پر اتنا یقین کیوں ہے؟" ارشد کے لیے سب سے خوفناک اس وقت حسام تھا۔

"کیونکہ وہ بھوت میرے سگے چچا کا ہے اور وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔" حسام نے آنکھوں سے ہی اس اونچی دیواروں والے مکان کو سلام کیا۔ ارشد کے برعکس اس کا دل چاہتا تھا کہ وہاں سچ مچ کوئی بھوت نمودار ہو جائے۔

☆☆☆

وہ عمر یاروں سے یاری نبھانے کی تھی۔ وہ چھ دوستوں کا ٹولہ جہاں نظر آتا باجماعت نظر آتا تھا۔ پہلے وہ سب داڑھی بڑھا کر چشمہ لگا کر پری زاد بنے پھرتے تھے۔ اب سب نے بال لمبے کر لیے تھے اور خود کو مولا جٹ سمجھ رہے تھے۔ گاؤں کے آدھا درجن

pklibrary.com

لڑکے ایک ہی گیٹ اپ میں، ایک ساتھ پھرتے ہوئے کبھی بدمعاش لگتے کبھی مضحکہ خیز۔ اس روز وہ اپنی موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر شہر کی مشہور کھوئے والی مٹھائی اور فالودہ کھانے آئے تھے۔ کھا پی کر وہ کپڑے جوتوں کے بازار میں چہل قدمی کرنے لگے۔ یہ ان کے گاؤں کا قریبی شہر تھا۔ دور دراز والوں کو تعارف کروانے کے لیے وہ اس ہی شہر کا حوالہ دیتے تھے۔ شہر مشہور تھا۔ مگر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بازار میں بھی خاص رش نہیں تھا۔ وہ مکمل کر گھوم سکتے تھے۔ یہاں زیادہ تر زنانہ چیزوں کی دکانیں تھیں۔ انہوں نے صرف دیکھنا ہی تھا۔ سڑک کے دائیں سے بائیں طرف وہ پانچ لڑکے ایک لکیر کی طرح چل رہے تھے۔ تب انہیں احساس ہوا وہ پانچ رہ گئے ہیں۔ چھٹا ارشد غائب ہے۔ انہوں نے آوازیں دیں تو ایک زنانہ سامان کی دکان سے ارشد کا سر نمودار ہوا۔

"یار گرمی بہت لگتی ہے۔ کالی پونی لے رہا ہوں۔ دن کو بال باندھ لوں گا۔" ارشد نے کچھ جھینپ کر کہا۔ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔

ارشد گورا چٹا ملائم جلد والا تھا۔ لمبے بالوں میں بدمعاش لگنے کے بجائے حسین لگنے لگا تھا۔ وہ تو یاری دوستی کا پریشر تھا ورنہ کبھی بال نہ بڑھاتا۔ پہلے تو اس پر سب ہنسے۔ پھر احساس ہوا کہ وہ غلط بھی نہیں کہہ رہا۔ باقی بھی کھسیانے ہو کر دوسری دکانوں کی سمت ہو گئے۔ حسام اس ہی دکان میں چلا آیا جہاں ارشد تھا۔ "میٹل والا ہیئر بینڈ ہے جیسا رونالڈو پہنتا ہے؟" اس نے دکان دار سے کہا۔

دکان دار اندرونی ڈبے دیکھنے لگا۔ پیچھے سے دو لڑکیاں دکان کے اندر آئیں اور دروازے میں کھڑی راستہ روکے سامان دیکھنے لگیں۔

"یہ شیشوں والا پراندہ دکھائیں۔" نیوی بلو شلوار قمیض والی لڑکی نے دوپٹہ کھول کر سر پر لیا ہوا تھا۔ "ناز، پراندہ چھوڑو یہ ہیئر ایکسٹینشنز دیکھو۔ سیدھی بھی مل رہی ہے اور کرلی بھی۔"

دوسری لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا جس کا نام ناز تھا۔

"ارشد! دیکھ یہاں تو سارا حسن مل رہا ہے۔ نقلی بال، نقلی ناخن، نقلی پلکیں۔ جو قدرتی طور پر بھدا ہے اس کی جگہ یہ سب خرید کر لگا لو۔" حسام نے اب دکان کی دوسری اشیا پر غور کیا۔ اور پیچھے کھڑی لڑکیوں نے نظر موڑ کر حسام کو دیکھا۔

"کبھی سوچا تھا کہ ہم جس حسن کی تعریف کرتے ہیں وہ تین سو روپے درجن ملتا ہے۔

آپ نا ایک دو مصنوعی ناکیں بھی رکھ لیں۔ جس کو چھوٹی بڑی کرنی ہو چڑھا لے۔" وہ کبھی ارشد تو کبھی دکان دار کو کہتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے بول رہا تھا۔

دکان میں اس وقت صرف دو ہی لڑکیاں تھیں اور ان میں سے ناز جو بھی تھی نقلی نہیں تھی۔ اسے لگا حسام نے اس پر طنز کیا ہے۔ اسے یہ طعنہ برداشت نہیں ہوا۔

"آپ نقلی حسن کی تعریف بھی تو نقلی الفاظ سے ہی کرتے ہوں گے۔ اصلی حسن دیکھنا ہے تو کردار میں ڈھونڈیں روپ میں نہیں۔" ناز نے ہلکی سی گردن موڑ کر سنایا۔

اس کی تیکھی ابرو کالی آنکھ اور کھڑی ناک حسام کی سمت تھی۔ "میں کھرا بندہ ہوں۔ کوئی ہیر ایکسٹینشن نہیں ہے۔ اپنے ذاتی لمبے بال ہیں۔" حسام نے لوہے کا ہیر بینڈ بالوں میں لگا کر آئینہ دیکھا۔ اس پر ناز کی ہنسی نکل گئی۔

"اس حلیے کے لیے کون سی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ لک کاملی کی دین ہے۔"

ناز نے حسام سے کہا۔ پھر دکان دار کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"چلیں آپ پراندے کا دام بتائیں۔"

"سچائی کی تو قدر ہی نہیں۔" حسام بڑبڑایا۔

ناز بھی تیکھے مزاج کی تھی۔

"فلمی ہیرو جیسے بال فٹ بال جیسا ہیر بینڈ اور

دوسروں کی بات کرتے ہیں۔ خود ہی ظاہری روپ میں حسن ڈھونڈتے ہیں اور ہمیں سناتے ہیں۔ چلو پنکی!" وہ پہلے ہی غصے میں تھی۔ پھر بازار آتے وقت تو ویسے ہی بھاؤ تاؤ کراتے ہوئے ہتھیار سے لیس ہو کر آتی تھی۔ اس ہی مزاج میں پراندہ کاؤنٹر پر پھینکا اور اپنی پہیلی کا ہاتھ تھامے دکان سے نکل گئی۔

حسام کو شرمندگی ہوئی وہ تو مذاق کر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا اگلی سنجیدہ ہی ہو جائے گی۔

☆☆☆

اس رات خواب میں وہ ان ہی رنگین بازاروں کی سیر کر رہا تھا کہ سویرا ہو گیا۔

"نالائق، غیر ذمہ دار، نا ہنجار۔" صبح کی ابتدا ماں کے لتاڑنے سے ہوئی تھی۔

حسام صحن میں چارپائی پر اوندھا لیٹا تھا۔ ماں کو کمر پر ہتھڑ مارنے کا موقع مل گیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"صبح بخیر۔" اس نے طنزیہ ماں کو کہا۔

"صبح تو تب بخیر ہوتی جب تم نے ماں کے کہنے پر موٹر چلا کر ٹنکی بھری ہوتی۔

ایک کام کہا تھا وہ بھی یاد نہیں رہتا۔" ماں غصے ہو رہی تھی۔

حسام سستی سے صلواتیں سننے لگا۔ ویسے تو ان کے گھر میں ملازم بھی تھے۔ مگر بچے بڑے ہونے کے بعد رات کو نجمہ بیگم اپنے حصے کو تالا لگا دیتی تھیں۔ تا کہ نہ کوئی ملازم آئے نہ ملازمہ۔

"میں بیمار ہو جاؤں تو کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ ٹھیک ہو جاؤں تو پھر ان کی خدمت میں لگ جاتی ہوں۔ ایک ذمہ داری نہیں پوری کرتا یہ لڑکا کیسے کامیاب ہوگا۔" نجمہ کاموں کے ساتھ زبان بھی چلا رہی تھیں۔

"دو انچ بال لمبے کر لو تو سب کو لگتا ہے لڑکا بگڑ گیا۔ نہ جانے یہ کون سی سائنس ہے۔" وہ بڑبڑاتا ہوا باتھ روم چلا گیا۔

ایک گرم رات ماں نے اس کو دودھ فریج میں رکھنے کا کہا تھا۔ اس نے پرواہ نہیں کی۔

صبح وہ ساری دیگچی دہی بن چکی تھی۔ تب سے اس پر لاابالی اور غیر ذمہ داری کا لیبل لگ گیا تھا۔ اس نے کبھی یہ لیبل ہٹانے کے لیے کوئی خاص محنت بھی نہیں کی تھی۔ اب بھی ناشتہ کیا اور کالج چلا گیا۔ شام کو جیسے ہی واپسی پر کتابیں تھامے بائیک پر بیٹھے گھر میں داخل ہوا تو نجمہ کی آواز آئی۔

"تیرا بیڑا غرق جائے۔ امی جی کی تو دوائیاں ختم ہیں۔ ہفتہ پہلے حسام کو کہا تھا کہ بلدیو سنگھ جی کے گھر سے دوائی لے آئے۔ وہ اتنی دور سے دوائی لائے ہیں۔ میں ملازم کو بھیجتی اچھی لگتی ہوں۔ آنے دو ذرا اس کو۔" امی کھانے کی میز پر جیسے اسلحے سے لیس ہو کر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

حسام نے گھبرا کر وہیں سے اپنی موٹر سائیکل گھمالی۔

☆☆☆

وہ پنجاب کے جس علاقے میں رہتے تھے وہاں سو سال پہلے تک سکھ بھی کثیر تعداد میں رہتے تھے۔ اس کے دادا پڑدادا ان کے ساتھ کام کرتے۔ ان کی دکانوں سے سودا بھی آتا۔ تہوار پر مل بانٹ کر کھانا بھی کھاتے۔ اب بھی اس علاقے میں سکھوں کی عبادت گاہیں تھیں۔ گو ان کی تعداد چند ہزار ہی رہ گئی تھی۔ مگر معاشرے میں ان کا اہم مقام تھا۔

حسام کے دادا بتاتے تھے کہ وہ بیساکھی کے تہوار پر ایک بار اپنے سکھ دوست من راج کو ملنے گئے۔ وہ چند افراد دسترخوان پر بیٹھے تھے۔ دادا جی کفایت شاہ صاحب عمر میں اس وقت حسام سے بھی کم ہوں گے۔ ان کا دوست ان کے والد اور رشتہ دار بھی موجود تھے۔ دادا تو ان کے پکوانوں کے گرویدہ تھے۔ انگلیاں چاٹ چاٹ کر کھانے لگے۔ اتنے میں دو اور مہمان آگئے۔

"بھلیے لوکی کھسھیاں نہ لائیں۔ دو لوگ ہور آگئے۔" (معصوم لوگ، کھسر انہ اتارنا دو لوگ اور آگئے ہیں۔) من راج کے دا جی نے آواز لگائی۔

pklibrary.com

سب آرام سے کھاتے رہے۔ کفایت کو بہت عجیب لگا۔ کچھ دیر بعد پھر ایک اور ملنے والا آیا تو دعا سلام کے بعد داجی نے پھر منہ کچن کی طرف کر کے آواز لگائی۔

"بھلیے لوکی گھگھرا نہ لائیں ایک مہمان ہور آ گیا۔"

(معصوم لوگ گھگھرا نہ اتارو، ایک آدمی اور آ گیا ہے۔)

کفایت شاہ جب جانے لگے تو آہستہ سے من راج سے پوچھ ہی ڈالا کہ یہ کیا ماجرہ ہے۔

من راج بہت ہنسا۔

"گھگرا وہ والا نہیں جو شلوار کی جگہ پہنا جاتا ہے۔ گھگرا تو کھانا پکانے کا لباس ہوتا ہے۔ جیسے انگریز ایپرن پہنتے ہیں، ویسے ہماری عورتیں اپنے کپڑے بچانے کے لیے کپڑوں کے اوپر جو فراک نما گھیر دار چیز پہنتی ہیں اس کو گھگھرا کہتے ہیں۔" من راج نے ہنس کر اس کی غلط فہمی دور کی تھی۔

کفایت شاہ جب یہ قصے سناتے تھے تب تو وہ گھگھرا نما چیز معاشرے سے غائب ہی ہو چکی تھی۔ تب تو گھگھرا وہی رہ گیا تھا جو شلوار کی جگہ پہنا جاتا تھا۔

کفایت شاہ عرصہ ہوا انتقال کر چکے تھے۔ حسام بلدیو سنگھ جی کے گھر جاتے ہوئے یاد کر رہا تھا۔

☆☆☆

بچپن میں دونوں گھروں میں بہت پیار تھا۔ آنا جانا لگا رہتا۔ بلدیو سنگھ کے دو بیٹے حسام کے ہم عمر تھے۔ دو بیٹیاں بھی تھیں جن کو بچپن میں وہ بل بتوڑی اور کرنانی چڑیل کہہ کر چڑایا کرتا تھا۔ اس کے والد کمال شاہ اور بلدیو سنگھ کی اب بھی دوستی تھی۔ وہ باقاعدہ ملا کرتے تھے۔ مگر اب گھروں میں آنا جانا کافی سالوں سے ختم ہو چکا تھا۔ وہاں کے پنجابی مسلمانوں کا جیسا رہن سہن ہے ویسا ہی وہاں کے پنجابی سکھوں کا انداز ہے۔ پشتون سکھ بھی جو ہجرت کر کے ان علاقوں میں آئے ہیں اب ان جیسے ہی ہو گئے ہیں۔ ویسے ہی گفتگو وہی انداز۔ بس پگڑی کا فرق تھا۔

کچھ عرصہ ہوا تھا حسام کی دادی کو پھیپھڑوں کی تکلیف ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے ایک بہت اچھی دوائی دی تھی۔

حسام وہی دوائیاں لینے آیا تھا۔

"ارے میرا شیر حسام کیسا ہے؟" ٹونی نے دروازہ کھولتے ہی اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی اب چوڑے کندھوں والا گبرو جوان ہو گیا تھا۔

"بالکل ٹھیک۔ تم نے بڑے ڈولے شولے بنا لیے ہیں۔ سوشل میڈیا پر تو یہ نظر ہی نہیں آتے۔" حسام نے گلے سے جدا ہوتے ہی ٹونی کا بازو پکڑا۔

"باتیں کرنا نہیں بھولا چل اندر چل۔" ٹونی حسام کو اندر لے گیا۔

بلدیو سنگھ جی کے آرام کا وقت تھا۔ وہ بھی نکل کر آئے اور حسام کے ساتھ بیٹھ گئے۔

پھر ویسا ہی والہانہ انداز۔ وہی خاطر تواضع، گپیں مذاق ہوا جیسا ان سے مل کر ہمیشہ ہوتا تھا۔ حسام کو تو اس خاندان سے اپنا تعلق بھول ہی گیا تھا۔ اب منٹوں میں سب یاد آنے لگا۔

"اماں جی کو میری طرف سے بہت پوچھنا۔ رب صحت دے۔" واپسی پر بلدیو سنگھ جی دروازے تک اسے چھوڑنے آئے تھے۔ تب ہی ان کے گھر کے سامنے ایک گاڑی رکی۔

"لو جی بلراج بھی آ گیا۔" ٹونی نے اپنے بڑے بھائی کی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

حسام تو بلراج کے ساتھ والی سیٹ دیکھ رہا تھا۔ وہاں نازک سی لڑکی موجود تھی۔ اس لڑکی نے بھی حسام کو دیکھا اور گھبرا گئی۔ بلراج گاڑی سے اتر کر ادب اور احترام سے ملنے لگا۔ اب تک وہ لڑکی بھی گاڑی سے نکل چکی تھی۔ اس نے شلوار قمیض کے اوپر سویٹر پہن رکھا تھا۔ دوپٹہ گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ بالوں کی فرنچ چٹیا اور ماتھے پر ننھی سی بندی تھی۔ یہ وہی ناز تھی جو اسے بازار میں ملی تھی۔ ناز نے بھی اسے

پہچان لیا تھا۔ اس لیے سر جھکا کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ اندر سے اس نے اپنا ہار مونیم نکالا جو بریف کیس جیسے بکسے میں بند ہو جاتا تھا۔

"ہرناز یہ حسام شاہ ہے کمال انکل کا بیٹا۔" بلدیو نے بیٹی سے کہا۔

"سلام۔" ہرناز نظر جھکائے آہستہ سے کہتی اندر چلی گئی۔

"بہت شکریہ آپ کا میں چلتا ہوں۔" حسام نے کہا۔

☆☆☆

وہ ہرناز کور تھی۔ ٹونی کی چھوٹی بہن۔ جسے وہ بچپن میں کرنانی چڑیل کہتا تھا کیونکہ اس کے لمبے پتلے لمبے ناک کی ایک تیکھی سی چونچ ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب تو وہ چونچ بھی نہیں تھی۔ مغرور ناک چہرے کو بھی مغرور بنا رہی تھی۔ پہلے موٹی چوڑی بھنویں تھیں۔ اب کمان جیسی ابرو کے نیچے بڑی بڑی آنکھیں۔ وہ حسین تھی اور لگ بھی رہی تھی۔ اصل مسئلہ اس کا یہی تھا کہ وہ اسے بہت حسین لگ رہی تھی۔ ایک جھلک دیکھی تھی اور اب چاند میں تاروں میں اسے ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ بچپن کا ہر ساتھ بیتا لمحہ اس نے دوبارہ یاد کر لیا تھا۔ اب ان ہی لمحوں سے نئے احساسات کی کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں۔ جب اسے ہرناز یاد آتی وہ ٹونی کو میسج کر کے حال احوال پوچھ لیتا۔

چند دنوں میں وہ ٹونی کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگا تھا۔ اس روز کھیل کے بعد ٹونی نے کہا کہ اب وہ کرکٹ کھیلنے نہیں آئے گا۔

"پرسوں سے میلہ شروع ہو رہا ہے۔ ساری دنیا سے دوست رشتہ دار آئیں گے۔ پھر میں نے دکان کا سامان لینے انڈیا جانا ہے۔ کچھ عرصے تک تو اس سب کا وقت نہیں نکلے گا۔" ٹونی نے تفصیل سے بتایا۔

"میلہ ہے اور ہمیں کوئی لفٹ نہیں۔" حسام نے غنیمت جانا۔

"میری طرف سے دل و جان حاضر ہیں۔ مگر سکیورٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ کسی غیر متعلقہ بندے کو اندر لے جانے نہیں دیتے۔" ٹونی نے سچائی بتائی۔

"میلے کے کھانے کا سوچ کر میرے منہ میں ابھی سے پانی آ رہا ہے۔ تم لوگوں کا اسٹریٹ فوڈ بہت تگڑا ہوتا ہے۔" یہ بات حسام نے دل سے کہی تھی۔

"تو لڑکی ہوتا تو اپنے گھر کی عورتوں کے ساتھ تمہیں بھی گھسا دیتا۔ مگر مرد کو دیکھ کر سب پہچان جاتے ہیں کہ کسی اور برادری کا ہے۔" ٹونی تو ضرورت سے زیادہ مہربان اور ملنسار تھا۔

"تو لڑکی ہی سمجھو اتنے لمبے بال اس ہی دن کے لیے تو رکھے ہیں۔" ایک دوست نے مذاق سے کہا۔

حسام کی ضرورت سے زیادہ دلچسپی اور ٹونی کی یاروں کے یار والی طبیعت کا نتیجہ، یہ نکلا کہ ٹونی نے حسام کو میلہ دکھانے کا بندوبست کر لیا۔

☆☆☆

سکھ کمیونٹی کا باہمی گٹھ جوڑ بہت مضبوط ہے۔ وہ ساتھ عبادت کرتے ہیں اٹھتے بیٹھتے ہیں اور زیادہ تر شادیاں اپنی ہی کمیونٹی میں ہوتی ہیں۔ ہر گردوارے میں لنگر ہوتا ہے۔ جہاں دو وقت کا کھانا اور ناشتہ مفت ملتا ہے۔ وہ میلہ ویسے تو عبادت کا میلہ تھا۔ مگر گردوارے کے باہر قطار سے لنگر کے اسٹال لگے تھے۔ جہاں کئی طرح کا کھانا اور چائے مفت مل رہا رہی تھی۔ ہرناز تقریب کی مناسبت سے سیاہ ستاروں والا دوپٹہ اوڑھ کر آئی تھی۔ اس نے بال کھول رکھے تھے۔ پہلے ہی اسٹال پر وہ اپنی بہن کے ساتھ پازیب لینے لگی۔ حسام کی موجودگی سے بے پرواہ وہ اپنی دلچسپی کے کاموں میں مصروف تھی۔ مگر حسام کو صرف وہی نظر آ رہی تھی۔ یہ بہت بے ادبی کی بات تھی مگر وہ خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ اصل میلہ تو اگلے روز شروع ہونا تھا۔ آج کا دن تو تیاریوں کے لیے تھا۔ اور دور دراز سے شرکت کے لیے آئے لوگوں کو خوش آمدید کہنے کا دن تھا۔ دن ڈھلنے کے قریب سندھ سے ہزار

بارہ سولوگوں کی بسیں پہنچیں۔

ٹونی اس طرف مصروف ہو گیا۔ حسام موقع جان کر ہرناز کے ذرا پیچھے چلنے لگا۔

"سوری میری وجہ سے اس دن تمہارا پرانڈہ رہ گیا تھا۔" حسام نے کہا۔

ہرناز نے مڑ کر دیکھا اور پلکوں کو ہلا کر ٹھیک ہے کا اشارہ کیا اور بہن کا بازو پکڑ کر چلنے لگی۔

"ویسے تمہیں پرانڈے کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے لمبے بال ہیں تمہارے۔ بال کھول کر زیادہ اچھی لگتی ہو۔" حسام نے آخر وہ کہہ ہی دیا جو وہ بہت دیر سے سوچ رہا تھا۔

ہرناز پلٹ گئی۔

"میں تو تمہیں کرنانی چڑیل لگا کرتی تھی بھول گئے۔" وہ نخرے سے کہہ رہی تھی۔

"سب یاد ہے۔ جو بھولا تھا وہ بھی یاد آ گیا ہے۔" حسام نے جلدی سے کہہ دیا کہیں وقت نہ گزر جائے۔

ہرناز نا سمجھی میں آگے چل دی۔ حسام کے لیے اس کے پیچھے جانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مگر مشکل میں تو وہ ویسے بھی تھا۔ اس لیے ایک اسٹال پر گھوم کر پھر دوسری طرف سے اس کے پاس آ گیا۔

"اب دیکھنے میں کرنانی چڑیل نہیں لگتی۔ مگر لڑتی اب بھی ویسے ہی ہو۔ اس دن دکان میں بھی تو جھگڑنے لگی تھی۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ انجان لڑکی کو اتنا غصہ کیوں آ گیا۔" حسام ہنسا۔ ہرناز مزید سنجیدہ ہو گئی۔

"میں اسی لیے لڑی تھی کہ میں انجان نہیں تھی۔ میں نے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔" ہرناز نے سادگی سے کہا حسام کا دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ معاملہ بہت جلدی بہت سنجیدہ ہو رہا تھا۔

ہرناز بھی کنفیوژ ہو گئی تھی۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا تھا؟" اس نے ایسے پوچھا جیسے گلہ کر رہی ہو۔

حسام شرمندہ ہو گیا۔ مگر نظر نہیں جھکائی۔ اس شکوے میں راحت بھی تھی اور جلن بھی۔ پہلی بار اس نے بات میں پہل کی تھی اور حسام جواب دینے لائق نہیں رہا تھا۔

ہرناز اسے دیکھ کر جواب جان گئی تھی۔

"میں سمجھی تھی تم نے مجھے ہی ستانے کے لیے نقلی ناک والی بات کی ہے۔ میں اس لیے غصہ ہو گئی تھی کہ اتنے عرصے بعد ملے اور تم نے ملتے ہی یہ سب کہا۔

مگر تم نے تو پہچانا ہی نہیں۔"

اس کی شکل سے نظر آ رہا تھا کہ اس کا دل ٹوٹا ہے۔ یہ تو حسام بھی جانتا تھا کہ دل تب ہی ٹوٹتا ہے جب لگایا جاتا ہے۔

"تم نے مجھے یاد رکھا میں اس کا کیا مطلب نکالوں؟" اس بار وہ بالکل سنجیدہ ہو گیا تھا۔

ہرناز کے چہرے پر بھی سرخ رنگ ابھرا۔ لاج شرم اور محبت کا نہیں۔ آگ کا سرخ رنگ اور وہ آگ سے نہیں کھیلنا چاہتی تھی۔

"اس کا مطلب ہے کہ مجھے ابھی بھی کارٹون پسند ہیں۔" وہ بھرپور قہقہہ لگا کر ہنسی اور آگے چل دی۔

"میں مذاق نہیں کر رہا۔" حسام نے زور دیا۔ چند قیمتی پل ملے تھے جنہیں وہ ضائع کرنے سے ڈر رہا تھا۔

"اسے مذاق ہی رہنے دو۔ اس معاملے میں سنجیدگی کی گنجائش نہیں۔ جب تک مذاق ہے ہم یہ لمحے جی رہے ہیں سنجیدہ ہوئے تو مر جائیں گے۔"

اس نے معصومیت سے اتنی گہری بات کہہ دی حسام حیران رہ گیا۔ یعنی وہ بھی وہی سوچتی اور محسوس کرتی رہی تھی جو وہ کرتا تھا۔

"یعنی میں مذاق میں محبت کا اقرار کروں اور تم مذاق میں مان جاؤ۔" حسام نے تصدیق چاہی۔

"لو میں کیوں ماننے لگی۔ کچی لڑکیوں جیسا چہرہ ہے تمہارا۔ گبرو جوان تو داڑھی والا ہوتا ہے۔" ہرناز نے ادا سے کہا۔

"یعنی تمہارے معیار پر اترنے کے لیے داڑھی رکھ لوں؟ منظور۔ بالوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟" اس نے بھی مصنوعی جی حضوری کرتے ہوئے کہا۔

"وہ تمہاری مرضی۔" ہرناز نے لاپرواہی سے ہاتھ ہلایا۔

اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا۔ ہر طرف رش تھا۔ مگر ان دونوں کی طرف فی الوقت کوئی متوجہ نہیں تھا۔

"اور کہاں کہاں میری مرضی چلنے کا امکان ہے؟" وہ کسی غلام کی طرح اپنے آقا سے پوچھ رہا تھا۔

"کھانا تو میری پسند کا ہوگا۔" ہرناز نے اکڑ کر کہا۔

"خود پکاؤ گی یا مجھ سے پکواؤ گی؟" حسام نے مصنوعی لاچاری سے پوچھا۔

ہرناز ہونٹ پر انگلی رکھ کر ہنسی۔

"میں پکاؤں گی۔ دارجی کہتے ہیں میرے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ تم جس معاملے میں اچھے ہو وہ ذمہ داری تم لے لو۔ جاؤ یہ اختیار دیا کیا یاد کرو گے۔" اسے مزہ آرہا تھا۔

"میں کھانا کھانے میں بہت اچھا ہوں۔ شادی کے بعد کھانا کھانے کی تمام ذمہ داری میری۔" مذاق سے کہتے ہوئے اس کے منہ سے ایک سنجیدہ بات نکل گئی تھی۔ ہرناز کے چہرے پر پھر سے لالی آئی شعلوں جیسی دہکتی لالی۔ پھر اس نے خود کو سنبھال کر دوبارہ کوئی مزاحیہ بات تلاش کی۔

"شادی تو میں تم سے نہیں کرنے والی دیکھو نا میری امی کا تکیہ کلام ہے "ہائے اور بابا" اور میرے دارجی بہت پیار سے ان کو پکارتے ہیں "بھلیے لوکی" مجھے دونوں کی عادت بہت اچھی لگتی ہے۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"بھلیے لوکی اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟" حسام نے پوچھا۔

"دیکھا اسی لیے ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ تمہیں تو بھلیے لوکی کا مطلب ہی نہیں معلوم۔ مجھے کیسے پکارو گے؟" ہرناز خفا ہوئی۔

"تم سکھا دینا۔" حسام اس کی ساری ادائیں دل میں اتار رہا تھا۔

"اور مجھے کیا کیا سیکھنا پڑے گا؟" وہ اسٹال سے چوڑیاں اٹھا کر کلائی میں پہن رہی تھی۔ حسام بھی چیزیں دیکھ رہا تھا دیکھنے والے یہی سمجھتے کہ وہ خریداری کر رہے ہیں۔

"تمہیں اپنی مسکراہٹ قائم رکھنے کا گر سیکھنا پڑے گا۔ تمہاری مسکراہٹ بہت اچھی ہے۔" اس نے لگاوٹ سے کہا۔ ہرناز کے ہاتھ سے چوڑی ٹوٹ کر کلائی پر لگ گئی۔

"دھیان سے یہ کیا ہو گیا؟" قریب اس کی بہن تھی وہ آگئی۔ پھر امی بھی آگئیں۔ حسام کھسک کر بہت دور ہو گیا۔ اس کے بعد ہرناز نے اس سے ایک ہی بات کی تھی۔ 'خدا حافظ' اس نے بلا کی سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا تاکہ حسام بھی سمجھ جائے الوداع کہنا ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔

☆☆☆

وہاں عورتوں کی شادی ایک ہی بار ہوتی تھی۔ حسام کی عائشہ پھپھو بے اولاد بیوہ ہو گئی تھیں۔ کسی نے دوبارہ ان کی شادی کا نہیں سوچا۔ جو بچوں والیاں ہوتی تھیں وہ بیوی یا طلاق کے بعد مرد بن کر اولاد پالنے لگتیں۔ کوئی بھوکا سونے نہیں دیتا تھا مگر گھر بسانے کا نہ وہ خود کہتیں نہ کوئی سوچتا۔ حسام کی عائشہ پھپھو اللہ کے قریب ہو گئی تھیں۔ حسام جس پیر فقیر کو دیکھ کر سونے لگتا وہ اس ہی پیر تجہد کے لیے جاگتیں۔

وہ کئی دنوں سے حسام میں آیا بدلاؤ بغور دیکھ رہی تھیں۔

"آج کل تمہاری نیند کیوں اڑ گئی ہے؟" انہوں نے اسے جاگتا دیکھ کر پوچھا۔

"اس لیے کیوں کہ جاگتی آنکھوں میں خواب جو آگئے ہیں۔" اس نے بے خیالی سے کہا۔

عائشہ نے خوف سے دل تھام لیا۔

"ارے ڈریں نہیں میں تو ویسے ہی کہہ رہا

تھا۔" حسام کو ان کا ردعمل ضرورت سے زیادہ ڈرامائی محسوس ہوا۔

"جوان بھائی کھونے والی عورت جب تک زندہ رہتی ہے ایسے ہی ڈرتی ہے۔ تمہارا تو نام بھی اس کے نام جیسا ہے اور صورت بھی۔" عائشہ نے اپنے بھائی کو یاد کیا۔ جو نشان محبت بنتے ہوئے نشان عبرت بن چکا تھا۔

"خیام چچا؟ مجھے بس تھوڑا تھوڑا یاد ہے۔" حسام نے ذہن پر زور ڈالا۔

"دیوانہ تھا وہ اس کو بھول جاؤ۔" عائشہ نے کہا۔

حسام بھی خاموش ہو گیا۔

☆☆☆

حسام کی محبت بچپن میں آنگن میں کھیلنے سے شروع ہوئی تھی۔ احساس دیر سے ہوا تھا۔ مگر ابتدا تو تب ہی ہو گئی تھی۔ جب وہ ہرناز کو تنگ کرتا تھا اور ہرناز روٹھ کر جانے لگتی تھی تو وہ فوراً اس کا پسندیدہ کھیل شروع کر دیتا تاکہ وہ خوش ہو جائے اور رک جائے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں اسے آہستہ بال کرواتا تھا۔ ڈساوہ تب ہی گیا تھا۔

لیکن محبت کا ڈنگ اب محسوس ہو رہا تھا۔ اور محبت کا زہر جسم میں پھیل چکا تھا۔

حسام بڑے بازار جا کر وہی پراندہ لے آیا جو اس روز ہرناز نے چھوڑ دیا تھا۔ پھر اس نے اس دن کا انتظار کیا جب ٹونی اور بلراج نے انڈیا جانا تھا۔ جب وہ چلے گئے تو گھر میں صرف بلدیو جی رہ گئے تھے۔ وہ کام پر گئے اور حسام خاموشی سے دیوار ٹاپ کر تحفہ دینے آ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ ہرناز سے ملا تو دوسرے بھی اسے دیکھ ہی لیں گے۔ اس نے ملاقات کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے پراندہ ہرناز کے ہارمونیم میں رکھ دیا۔ وہ واپس جانے والا تھا۔ جب ہرناز کی چھوٹی بہن نے دیکھ لیا اور شور مچا دیا۔

لمحوں میں طوفان آ گیا تھا۔ حسام بھاگ تو گیا مگر بات پھیل گئی۔ بلدیو جی کو معلوم ہو گیا۔ میلے میں بھی وہ ہرناز کے پیچھے تھا۔ اس کے باپ کمال شاہ کو شکایت گئی۔

"ہم تو ایسے معاملوں میں سیدھا جان سے مارتے ہیں۔ وہ یہ تو میرے بیٹے گھر میں نہیں تھے اور میں نے آپ کا لحاظ کر لیا۔ ورنہ لڑکا آئندہ مجھے نظر بھی آیا تو اس کے ساتھ جو ہو گا میں اس کا ذمہ دار نہیں۔" بلدیو جی آگ بگولا تھے۔

کمال شاہ نے عاجزانہ پگڑی بلدیو سنگھ کے قدموں میں رکھی۔ منت سماجت، واسطے دے کر بہت مشکل سے اس کی جان بخشوائی۔ دونوں گھروں کی ساری دوستی اس ایک حرکت سے جانی دشمنی میں بدل گئی تھی۔ حسام گھر پہنچا تو باپ نے ڈنڈے سے پیٹ ڈالا۔ ماں نے قسمیں دیں کہ اس لڑکی کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔ یہ تو سراسر خودکشی ہے۔ سرگوشیوں میں دادی خیام چچا کو یاد کرنے لگیں۔

"کہتے ہیں اس دیوانے کی روح اب بھی اس اونچی دیواروں والے مکان میں بھٹکتی ہے۔ کوئی سہارا دے کر لے جائے، میں پکاروں تو شاید صورت دکھا جائے۔" دادی کے اپنے زخم ادھڑ گئے تھے۔

رات کو جب سب سو گئے تو عائشہ پھپھو مرہم لے کر پہنچیں۔ حسام برے حال میں بستر پر لیٹا تھا۔ باہر کی حالت خراب تھی مگر اندر کی حالت اس سے بھی بری۔

"اس دیوانے کا نام تو میں بھی نہیں لیتی۔ تم نے لیا تو دیکھو کیا ہو گیا۔ تمہیں بھی دیوانگی کا جوگ لگ گیا۔ وہ دیوانہ تھا اور اس کی میراث بھی دیوانگی ہے۔" عائشہ پھپھو اس کے زخم صاف کر رہی تھیں۔

"ان کی میراث تو محبت بھی ہے نا۔ میں دیوانہ نہیں ہوا۔ مجھے محبت ہو گئی ہے۔" اس نے پھپھو سے دل کا حال کہا۔

"ایک ہی بات ہے اندھے کنویں سی محبت دیوانگی ہی ہوتی ہے۔" عائشہ نے یاد کروایا۔

"پھوپھو، خیام چچا کو کیا ہوا تھا؟" اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

عائشہ کو لگا وہ اب چپ رہیں تو حسام کو بھی کھو دیں گی۔ اسے باز رکھنے کے لیے خیام کی کہانی سنانی ضروری تھی۔

☆☆☆

فروری کی صبح نے پورے علاقے پر دھند ڈال رکھی تھی۔ درخت اور پودے شبنم میں ٹھٹھر رہے تھے۔ چڑیاں بھی ابھی خاموش تھیں کہ کچھ سویرا اور ہو تو چہچہائیں۔ لاری اڈے پر بس رکی اور خیام نیچے اترا۔ نصیب والا گاؤں میں یہ اس کی پہلی بار آمد تھی۔

"چچا، ایک چائے دینا۔" خیام نے وہاں کے واحد کھوکھے والے سے کہا اور چائے بسکٹ کھایا۔ اس نے سارا سفر سو کر گزارا تھا۔ اب چائے پی کر دوبارہ تازہ دم ہو گیا تو اس نے پیدل ہی آگے چلنے کا ارادہ کیا۔

"میں کوئی شہر کا بابو صاحب تھوڑی ہوں۔ جو چلنے سے تھک جاؤں۔ میں بھی ایک پنڈ کا پینڈو ہوں۔" اس نے فخر سے اپنا تعارف فضاؤں کے گوش گزار کیا۔ پھر اپنا مختصر سا بیگ کندھے پر ڈالا اور گاؤں کی طرف چل دیا۔ خیام شاہ اپنے دوست کی شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ اپنی پچیس سالہ زندگی میں وہ صرف پڑھنے کے لیے شہر گیا تھا۔ باقی ساری زندگی اس نے اپنے گاؤں رحیم پورہ میں گزاری تھی۔ رحیم پورہ کے بالکل ساتھ ہی ایک مشہور شہر تھا۔ جس نے ان کا گاؤں بھی شہر کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ پھر اس کے والد صاحب پیر کفایت شاہ جب سے روحانی پیشوا بنے تھے تب سے وہ گاؤں میں بغیر نمایاں ہوئے گھوم پھر نہیں سکتا تھا۔ اس کے اور قدرت کے بیچ سلام کرنے والے، کرسی پیش کرنے والے کتنے ہی لوگ آ جاتے تھے۔ لیکن یہاں اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔

وہ پگڈنڈی پر بڑھتا جا رہا تھا اور کہرا چھٹتا جا رہا تھا۔ چڑیوں کو گھونسلوں سے نکل کر چہچہاتے دیکھا تو اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بھی گرمیوں میں نالے میں غوطے لگا کر بڑا ہوا تھا۔ شہر کی پڑھائی نے اسے یہ باور کروا دیا تھا کہ وہ اندر سے دیسی ہے اور رہے گا اور رہنا چاہے گا۔ وہ اپنی ہی مٹی میں رہے گا اور وہی سب کرے گا جو اس کے باپ دادا نے کیا۔ کلف لگی شلوار قمیض اونچا کلاہ اس زندگی پر شہر کی ہزار سہولتیں قربان۔

اس نے اپنا بیگ زمین پر رکھا اور کمر اکڑائی۔ راستہ اس کی سوچ سے لمبا تھا۔ اسے اتنے لمبے پیدل سفر کی عادت نہیں تھی۔ اس نے تھوڑی دیر ستانا تھا تو یہ بھی اسے اپنے نرالے انداز میں کرنے کی ٹھانی اور سکھ چین کے درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر اس نے ایک مضبوط ٹہنی سے ٹیک لگائی اور ایک ٹانگ ڈالی توڑی۔ پھر اس کی چھال دانتوں سے اتارنے لگا۔ اس کے ابا نماز کے بعد روز صبح یوں ہی تازہ مسواک کرتے تھے۔ درخت کے اوپر سے اس نے تاحد نظر پھیلا سبزہ دیکھا۔

نصیب والا کے ارد گرد بھی دوسرے گاؤں ہی تھے۔ اس لیے اس کی سادگی برقرار تھی۔

وہ من موجی وہیں درخت پر ٹکا مسواک کر رہا تھا جب کہیں سے، ایک لڑکی کے گانے کی آواز آئی اور سیدھا دل میں اتر گئی۔

"بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی، کیسے میں بھر لاؤں مدھوا سے مٹکی۔"

ٹھنڈا لہجہ دھیمے سر جیسے ساٹھ کی دہائی کا کوئی فلمی گانا۔ خیام ٹھٹھک گیا۔ جیسے کوئی آفاقی آواز سن لی ہو۔

"پنیاں بھرن کو میں جو گئی تھی،
دوڑ جھپٹ موری مٹکی پھٹکی
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی۔"

خیام نے سحر زدہ ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کون تھی جس کی آواز میں اتنا سوز اتنا ترنم تھا۔

"خسرو نظام کے بل بل جائیے،
لاج رکھو مورے گھونگھٹ کی۔
بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی۔"

خیام کے ذہن میں تو نقشہ ابھرنے لگا۔ ایک نازک سی لڑکی مٹی کی مٹکی کمر پر ٹکائے اپنے رنگین آنچل کو سر پر رکھے کنویں پر جا رہی ہو۔ اس نے اس کے دودھیا پاؤں اور پیر کے گلابی ناخن تک سوچ ڈالے تھے۔ اس گانے کی بازگشت فضا میں تحلیل ہو گئی تو خیام کو ہوش آیا گانا بند ہو گیا تھا اور گانے والی انجان ہی رہی تھی۔ وہ فوراً درخت سے نیچے اترا بیگ اٹھایا اور اس سمت دوڑا جہاں سے اسے آواز آنے کا گمان تھا۔ سکھ چین کی مسواک اب بھی اس کے الٹے ہاتھ میں دبی تھی۔ کھیت سے گزرتا وہ اس کچی زمین پر آیا جہاں چند قبریں تھیں۔ اس نے رفتار کم کر دی۔ ادب سے سر جھکا کر وہ ایک طرف سے ہو کر آگے بڑھا۔ آگے بڑھتے ہی وہ پھر دوڑنے لگا۔

"بہت تھن ہے ڈگر پنگھٹ کی۔"

آواز ایک بار پھر آئی۔ اس بار آواز قریب ہی تھی۔ خیام نے اونچی خودرو گھاس میں سنہری چٹیا دیکھی۔ لڑکی نے بہت اہتمام سے ریشمی بالوں میں سنہری پراندہ گوندھ رکھا تھا۔ گلناری رنگ کی شلوار قمیض ہاتھوں میں درانتی لیے وہ چارہ کاٹ رہی تھی۔ ساتھ گنگنا رہی تھی۔ خیام کو خواب لگا۔ کیونکہ حقیقت اتنی حسین نہیں ہوتی۔ ایسے روزمرہ کے کاموں کے ساتھ بھی ایسی مدھر آواز۔ لڑکی نے دوبارہ پورا کلام پڑھا۔ تھوڑے فاصلے پر کھڑا خیام اس کی پیٹھ دیکھتے ہوئے سنتا گیا۔ کلام ختم ہونے سے پہلے ہی خیام کا ہاتھ ڈھیلا پڑا اور دھپ سے اس کا بیگ زمین پر گر گیا۔ لڑکی فوراً درانتی اٹھا کر مڑی جیسے حملہ آور کا کام تمام کرنا مقصود ہو۔ پل بھر میں وہ شبنم سے شعلہ ہوئی تھی پھر سامنے دم بخود کھڑے بے ضرر نوجوان کو دیکھا تو اس نے بھی ہاتھ نیچے کر لیا۔ خیام نے بھی اسے دیکھا۔ جیسا سوچا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ نہ بول سکا۔ لڑکی نے کٹا ہوا چارا قریب پڑے کپڑے میں باندھا۔ خیام دیکھتا رہا۔ سر سے گرا آنچل دوبارہ سر پر ڈال کر لڑکی نے گٹھری اٹھائی اور چل دی۔ خیام پر تو جیسے جادو ہو گیا تھا۔ جب تک وہ نظر آتی رہی خیام دیکھتا رہا۔

☆☆☆

مہندی کی دعوت بہت شان دار تھی۔ مرغ مسلم بھنا گوشت تازہ تازہ روٹی نان مگر خیام کے لیے سب کچھ ماند پڑ گیا تھا۔ پہلے تو وہ یہاں کی ہوا کے بھی صدقے واری جا رہا تھا، اب یاروں کی محفل بھی دل مائل کرنے میں ناکام تھی۔

"یہ چکھو میرے گاؤں کی سوغات ہے۔ خاص چیٹھے کا حلوا۔" جلیس نے کہا۔

باقی کھانے میں مصروف تھے اور خیام خاموش تھا اس لیے جلیس خود ہی دوبارہ بولا۔

"یہ عورتوں کی محفل کا شور ختم ہو تو ہم بھی اپنی محفل جمائیں۔" جلیس دولہا تھا اور باپ کی غیر موجودگی میں میزبان بھی وہی تھا۔ عورتیں بچے پنڈال میں رونق لگا رہے تھے۔ وہ لوگ باہر مردانے میں تھے جہاں کسی کو ڈھول کی پرواہ تھی نہ ڈھولک کی۔ سب کھانے میں مصروف تھے۔

"چوہدری صاحب مبارکاں۔" اتنے میں ایک چھوٹے قد کا آدمی سامنے سے آیا اور سیدھا جلیس کی طرف بڑھا۔ صاف ستھرا لباس موٹی چادر کندھوں پر ڈالے وہ خوش لباس انسان تھا۔ مگر انداز کس قدر اوچھا۔ خیام نے غیر آرام دہ ہو کر دیکھا۔

"آؤ شفقت چاچا کیسے ہو۔" جلیس نے مودبانہ انداز میں کہا۔ مگر کرسی سے نہیں اٹھا یعنی آنے والا خاص معتبر نہیں تھا۔

"بھئی حویلی کی تو شان بڑھ گئی۔ کتنی اونچی جگہ آپ کا رشتہ ہوا ہے۔ پیسے کی کمی تو پہلے بھی نہیں تھی۔ اب یہاں یونی ورسٹی پاس مالکن آ جائے گی تو سمجھو پکھ کو کوہ نور مل گیا۔" شفقت کہتے ہوئے ایک پیڑھی کھینچ لایا اور جلیس کے گھٹنوں میں بیٹھ گیا۔ خیام کو اس آدمی سے بے وجہ کوفت ہونے لگی تھی۔

"سب میری بیوہ ماں کی دعائیں ہیں۔"

جلیس ساتھ مرغ کی بوٹی توڑ کر کھانے میں مصروف تھا۔ "بڑے چوہدری زندہ ہوتے تو ان سے کہتا۔ مگر

اب تو آپ ہی حویلی کے کرتا دھرتا ہیں۔ میں آپ کے ہونے والے سسر کو مبارک باد دینے گیا تھا۔ بڑے نفیس آدمی ہیں۔ خیر مبارک کہنے کے ساتھ ہی میرے ہاتھ پر تیس ہزار رکھ دیے۔" شفقت نے بظاہر تعریف کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کا مقصد بھری محفل میں لڑکی کے باپ کا شملہ اونچا کرنا نہیں تھا بلکہ جلیس کی بے عزتی کرنا تھی کہ لڑکی والوں نے اس سے بڑھ کر رقم دی تھی۔

جلیس اپنی ہی شادی میں اپنی بے عزتی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی شفقت کو کافی رقم دے چکا تھا۔ پھر بھی اسی وقت ملازم کو بلا کر اپنے باپ کی نشانی ایک سونے کی مردانہ انگوٹھی شفقت کو تھمائی۔ شفقت دعائیں دیتا رہا۔ خیام اٹھا اور دور جا کر نل سے ہاتھ دھونے لگا۔ اسے سمجھ میں آ گیا تھا کہ شفقت ایک مراثی ہے۔

بدھائیاں لینے کا یہ طریقہ مراثیوں کا معمول تھا۔ اس کے اپنے گاؤں میں اس کے والد کا رعب تھا۔ اس لیے ایسے رواج وہاں اب نہیں ہوتے تھے۔ خیام نے شکر کیا۔

"موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے
تو تو صاحب میرا محبوب الٰہی
موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ دے۔"

تل کے پاس زنانہ پنڈال کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ڈھولک بند ہو گئی تھی۔

اب بغیر ساز کے ایک لڑکی گا رہی تھی اور سازوں کی کمی محسوس بھی نہیں ہو رہی تھی۔ خیام کو لگا تھا اور وہ پہچان گیا تھا کہ یہ صبح والی لڑکی ہے۔

"ہماری چنر پہ پیا کی پگڑیاں
وہ تو دونوں بستی رنگ دے
تو تو صاحب میرا....."

آواز زنانہ پنڈال سے آ رہی تھی۔ خیام جانتا تھا یوں بیگمات کی محفل کا پردہ توڑنا کتنا بڑا جرم ہے۔ لوگ اس بات پر مرنے مارنے کو آ جاتے ہیں۔ مگر اس سے رہا نہیں گیا۔

اس کے بے تاب قدم پنڈال کی طرف بڑھنے لگے۔

"جو کچھ مانگے رنگ کی رنگائی
مورا جوبن گروی رکھ لے
تو تو صاحب میرا....."

اس نے پنڈال کی درز سے جھانکا۔ زمین پر دائرہ بنائے لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں وہ بھی تھی سفید اجلا شلوار قمیض سرخ ہونٹ اور شیشوں والا پراندہ۔ وہ آنکھیں بند کیے نہ جانے کس کو تصور میں لائے اتنے سوز سے گا رہی تھی کہ باقی ساری عورتیں چپ ہو کر سن رہی تھیں۔

"آن پڑی دربار تیرے
موری لاج شرم سب رکھ لے۔"
موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے۔"

یہ سریلا پکا گلا کسی اناڑی کا نہیں ہو سکتا تھا۔

"یہ عندلیب ہے۔ جو اس کا گانا سن لیتا ہے اس کے حسن کو بھول جاتا ہے۔" جلیس نے بتایا۔ وہ خیام کو اچانک وہاں سے جاتا دیکھ اس کے پیچھے آیا تھا۔

"عندلیب یعنی بلبل۔" خیام مسکرایا۔

"ماں باپ اچھے لوگ تھے اب دونوں ہی نہیں رہے۔ اب چچا کے پاس رہتی ہے۔ مردانے میں اس کا چچا شفقت مراثی اب بھی بیٹھا ہے۔" جلیس نے کہا خیام کو جھٹکا لگا۔

"عندلیب اس شفقت مراثی کی بھتیجی ہے؟" اسے یقین تھا اسے سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔

"ہاں۔ بچپن سے ریاض کرتی آئی ہے۔ تب ہی تو سروں پر اتنی پکڑ ہے۔" جلیس اس کی تعریف کر رہا تھا یا برائی خیام کی سمجھ سے بالا تھا۔

☆☆☆

مراثی بادشاہوں کے دربار کے جینی الوجسٹ ہوتے تھے۔ ان کی یادداشت کبھی دھوکہ نہیں دیتی تھی۔ اس لیے وہ مجرہ دکھانے کا کام کرتے تھے۔ اس دور میں ناچ گانا بھی امیر ہی افورڈ کر سکتے تھے۔

ان کے گھر کی بچیاں بغیر بے حیائی کا ناچ اور ایک آرٹ فارم کی طرح گانا بجانا سیکھتی تھیں۔ مردوں کا خاصہ تھا کہ داستان گو تھے اور ایک سانس میں کسی بھی خاندان کا پورا بجرہ سنا دیتے تھے۔

پنجابی مسلمان انہیں عزت سے میر عالم کہتے تھے اور سکھ انہیں دادا کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کی تکریم کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی جوڑے کا رشتہ پکا کر دیتے تو خاندان والے آنکھیں بند کر کے وہاں بارات لے جاتے۔ کہا جاتا ہے انہوں نے امیر خسرو کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔

عندلیب کو جب اپنے بابا سے یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے امیر خسرو کا کلام پڑھنا شروع کر دیا وہ اور اس کے بابا اپنے آباؤ اجداد جیسے تھے۔ ویسے ہی ذہین اور باصلاحیت۔ مگر اب بادشاہوں کا دور کہاں تھا۔ قدر دان نہ ہوں تو فن کھوٹا سکہ ہو جاتا ہے۔

ان کے خاندان کے کچھ بزرگوں پر الزام تھا کہ انہوں نے، انگریزوں سے پیسے لے کر مجرا کا شجرہ نسب تبدیل کیا تھا۔ عہدے پہلے ختم ہو گئے تھے بعد میں معاشرے نے ان کو برا سمجھنا شروع کر دیا۔ آرٹ فارم کو کوٹھ قرار دیا جانے لگا۔ کسی جاننے والے کے گھر شادی ہونی یا بچہ پیدا ہوتا تو عندلیب کے قبیلے کی عورتیں ڈھولکی لے کر جاتیں۔ رونق لگاتیں۔ پھر اس رونق کے صلے میں انعام وصول کرتیں۔ دیکھتے دیکھتے یہ شعبہ اور ان سے منسوب لوگ معاشرے میں مذاق بنا دیے گئے۔ عندلیب کے ابا کہتے تھے کہ ہم نازک قوم ہیں۔ ذہنی مشقت کر سکتے ہیں، جسمانی محنت ہمیں زیب نہیں دیتی۔ اس لیے ساری عمر انہوں نے خود فنکاروں والا کام کیا۔ ان کے ساتھی جو تھیٹر ٹی۔وی میں چلے گئے تھے۔ وہ نامور ہو گئے۔ جو شرمندہ ہونے لگے انہوں نے پرچون کی دکان کھول لی۔ حجام کا کام سنبھال لیا۔ شفقت مراثی اپنے بھائی کی طرح فنکار نہیں تھا۔ اس کا بیٹا شاکر تو جیسے ان کا خون ہی نہیں تھا۔ نہ تایا کی طرح فنکار۔ نہ باپ کی طرح خوش آمدی۔ نہ ہی ماں کی طرح بزلہ سنج۔

برادری تو بٹ گئی تھی عندلیب کا باپ زندہ ہوتا تو خاندان بھی الگ ہو جاتا۔ مگر عندلیب کی صورت میں شفقت کے ہاتھ روزگار کا طریقہ بھی لگ چکا تھا اور ریٹائرمنٹ پلان بھی۔ عندلیب اپنے نام جیسی بلبل تھی۔ سونے کی بلبل۔

باپ کی یاد میں عندلیب اب بھی قلم تراش کر اپنے گاؤں کے لوگوں کا شجرہ محفوظ کرتی تھی۔ مگر اب یہ عمل صفحے کالے کرنے سے زیادہ اہم نہ تھا۔ ہر ایک کو آج کی فکر تھی یا آنے والے کل کی۔ ماضی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ ان کی میراث بھی اب ماضی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"یہ صبح صبح کاغذ کالے کرنے کیوں بیٹھ گئی۔ غرارے کر لینے تھے۔ چہرے پر ملائی لگا لیتی تھی۔ چوہدرائن نے خاص کہا ہے کہ چھوٹے چوہدری کا سہرا عندلیب ہی پڑھے گی۔" چاچی نے کہا۔ جو حویلی سے آئی مٹھائی سمیٹ سمیٹ کر تھک گئی تھی۔

رقم الگ ملی تھی۔ شفقت مانگ کر لیتا تھا عندلیب کو سب بنا کہے دیا جاتا تھا۔ عندلیب نے قلم رکھا اور سیاہی کی ڈبیا بند کر دی۔

"چاچی، سہرا پڑھنے میں گانے اتنا زور نہیں لگتا۔ میں تو ویسے بھی روز ریاض کرتی ہوں۔" عندلیب بھی اپنے کام کی اہمیت جانتی تھی اور کبھی انکار نہیں کرتی تھی۔

"اس بار صرف سہرا نہیں پڑھنا چوہدرائن کی فرمائش ہے کہ تم دولہے کی بارات میں باگ پکڑ کر گھوڑی کے آگے شگنوں کا گانا گاؤ اور گھوڑی کو دہلیز پار کرواؤ۔" شفقت نے کہا۔

عندلیب کا رنگ اڑ گیا۔

"مردوں کی محفل میں گایا؟" زمانہ جتنا بھی بدل گیا ہو یہ لکیر کبھی پار نہیں ہوئی تھی۔

وہ ہمیشہ گائی تھی مگر عورتوں کی محفل میں۔

"یہ تو دیکھو کتنا بڑا اعزاز ہے۔ یہ رسم تو بہنیں کرتی ہیں۔" شفقت بھی صحن میں بیٹھا اپنی واسکٹ کی جیب میں رومال لگا رہا تھا۔ وہیں سے آواز لگائی۔

عندلیب جھٹ پردہ کھسکا کر باہر آگئی۔

"کیا بات کر رہے ہیں چچا، میں... میں مردوں میں گانا کیسے گا سکتی ہوں؟" عندلیب کی پختہ آواز میں سادہ الفاظ بھی وزنی ہو جاتے تھے۔ پھر ادھر تو اس نے بات بھی زور دے کر کہی تھی۔ اس لیے سوال بھی حکم لگ رہا تھا۔

"چھوٹا چوہدری تجھے اپنی بہن مان رہا ہے۔ ہماری تو پگ اونچی ہو گئی ہے۔" شفقت نے ہاتھ نچا کر کہا۔

چاچی اپنے کام میں لگی تائیدی سر ہلا رہی تھیں اور ان کا بیٹا شاکر، چارپائی پہ بیٹھا ایک کے بعد ایک مٹھائی کھا رہا تھا۔ شاکر صرف چچا زاد نہیں تھا بلکہ عندلیب کا منگیتر بھی تھا۔ ان کی شادیاں برادری میں اندر ہی کی جاتی تھیں تا کہ فن باہر نہ جائے۔

مگر اب وہ رسوم پرانی ہو چکی تھیں۔ پھر بھی چچا نے شاکر اور عندلیب کی بات طے کر دی تھی۔ وہ بھی جانتا تھا کہ عندلیب کا فن وہ سونے کی کان ہے جو کبھی خالی نہیں ہو گی۔

"نہیں چچا! چوہدری نے مجھے بہن نہیں مانا۔ اپنی بہن کو وہ مردوں کی محفل میں گانے کو ہرگز نہ کہتا۔" عندلیب کی آنکھوں کے پیالے نمکین پانی سے بھرنے لگے۔

شفقت اب واسکٹ کی برصاف کر رہا تھا۔ اس نے عندلیب کا نخرہ سنا تو غصے سے برصاف کرنے والا برش زمین پر دے مارا۔

"کہا تھا بھائی جان کو، لڑکی کو نہ پڑھائیں لکھائیں۔ مگر وہ کہاں سنتے تھے۔ اب یہ بھول گئی ہے کہ ہماری روایتیں کیا ہیں۔ بات تو ایسے کر رہی ہے جیسے کوئی غلط محفل ہو۔

شادی بیاہ کا معاملہ ہے۔ دو سو مرد ہوں گے تو چار سو عورتیں بھی ہوں گی۔ بات اگلوں کی خوشی کی ہے۔ چوہدرائن کی ننھی سی خواہش پوری کرنے میں تیری عزت کم نہیں ہو جائے گی۔" چاچی نے بھی منہ بنایا۔

"ہم نے اپنی عزت کی قیمت لگانا شروع کر دی اس لیے عزت گھٹ گئی۔" عندلیب نے دکھ سے کہا۔

شاکر طوطے کی طرح مٹھائی کھاتا رہا۔

"میں خود چوہدرائن سے بات کر لوں گی۔ وہ مان جائیں گی۔" اس نے حل تجویز کیا۔

"خبردار جو چوہدرائن سے کچھ کہا۔ وہ مانے گی تو روکھا سوکھا مانے گی۔ پاگل ہے جو انعام ٹھکرانے چلی ہے۔ تمہیں خزانے کی چابی مل رہی ہے۔ اس لیے تم آج گاؤ گی اور بس۔" شفقت نے حکم سنایا۔

عندلیب بے یار و مددگار کھڑی تھی۔ وہ جو سوچتے تھے کہ اس کی آواز میں سوز کہاں سے آتا ہے۔ اس وقت اس کی سمت دیکھ لیتے تو سب جان جاتے۔

☆☆☆

وہ ساری رات کانوں میں اس کی آواز محسوس کرتا رہا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے تھی پہلی بار اس نے اسے بالکل خاموش دیکھا تھا۔ بارات جانے کو باہر نکلی تھی۔ گھنٹے سے بجنے والے بینڈ کو کسی نے اشارہ کیا اور وہ بند ہو گیا۔ تب زنانے سے عندلیب نکلی۔ اس نے ہلکا سبز قمیض شلوار اور سیاہ پراندہ باندھا ہوا تھا۔ ساتھ دو ملازمائیں تھیں۔

باقی خواتین کھڑکیوں سے دیکھ رہی تھیں۔ خیام کو اس کے مزاج کا اندازہ لگانا ہوتا تو اس کے پراندوں سے لگاتا۔ چارہ کاٹتے ہوئے وہ سنہرے سورج کی طرح جوبن پر تھی۔

مہندی پر رات کے چاند جیسی جگمگ اور اب سیاہ۔ اس سمیت ہر مرد کی نگاہ عندلیب پر تھی۔ خیام نے نگاہ جھکالی۔ عندلیب نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

pklibrary.com

سامنے شفقت سوٹی لیے کھڑا تھا۔ اسے چلنے میں دقت نہیں تھی یہ سوٹی تو عندلیب کو ڈرانے کے لیے تھی۔ عندلیب بھی کیا کرتی اب اسی گھر میں رہنا تھا۔ چچا کی نہ مانتی تو کہاں جاتی۔ اس نے گھوڑے کی گردن سہلائی۔

"آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ری۔" عندلیب نے گانا شروع کیا۔

بڑی کھڑکی میں کھڑی چوہدرائن مزید اکڑ گئی۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی پر یہی چاہتی تھیں۔ ایسی رونق ہو جو کسی کو نہ بھولے۔

"میرے محبوب کے گھر رنگ ہے ری
جگ اجیارو، جگت اجیارو
میں تو ایسا رنگ اور نہیں دیکھی ری۔" عندلیب کا سر ماحول رنگنے لگا۔

اتنے میں دولہا کے ایک شہری دوست نے پانچ سو کا نیلا نوٹ جیب سے نکال کر اس پر پھینکا۔ عندلیب آنکھیں بند کیے گا رہی تھی نوٹ کچھ دور گرا اس نے دیکھا نہیں۔

"میں تو جب دیکھوں میرے سنگ ہے ری
آج رنگ ہے اے ماں رنگ ہے ری۔"

دوسروں کو بھی لگا کہ وہ کیوں پیچھے رہیں۔ صاحب استطاعت رشتہ داروں نے بھی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر نوٹ اچھالے۔ شفقت کی رال ٹپکنے لگی۔ معلوم ہوتا تو پہلے دو چار بچوں کو ساتھ لے آتا جو نوٹ اکٹھے کر لیتے۔ اب واسکٹ پہن کر۔ سوٹی لے کر وہ نوٹ اکٹھے کرتا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اتنے میں ایک کرارہ نوٹ اڑتے ہوئے عندلیب کے دوپٹے پر ٹک گیا۔ عندلیب نے آنکھیں کھولیں۔ الفاظ اس کے گلے میں اٹک گئے۔ اس نے نوٹوں کی ڈھیری کو دیکھا۔ پھر چچا کو پھر شاکر کو پھر تماشائیوں کو۔ یہی نوٹ وہ اس کو بعد میں ہاتھوں میں پکڑا دیتے تو وہ اجرت سمجھ کر شکریہ کہہ کر لیتی۔ مگر یہ کیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھر سے نمکین ہو گئیں۔ ہاتھ سے گھوڑے کی لگام چھوٹ گئی۔ خیام سمیت ہر شخص سمجھ رہا تھا کہ وہ غیر آرام دہ ہے۔ اسے یہ نوٹ اچھالنا پسند نہیں آیا۔

"رک کیوں گئی گاؤ۔" شفقت نے لاٹھی زمین پر مار کر کہا۔

عندلیب کے الفاظ اور سر دونوں کھو گئے تھے۔ خاموش محفل میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ کھڑکی میں کھڑی چوہدرائن کو عندلیب کا خاموش ہونا شفقت سے بھی زیادہ برا لگا تھا۔

انہوں نے گردن موڑ کر اس کی چاچی کو مخاطب کیا۔

"کیوں شاداں، تمہاری بھتیجی اب میرے بیٹے کی بارات پر رو کر نحوست پھیلائے گی؟"

چوہدرائن کی کڑک آواز پر شاداں باہر کو نکلی۔

"اوقات سے زیادہ مل رہا ہے۔ بس جھک کر اٹھانا ہے اس لیے عندلیب کو برا لگ رہا ہے۔ نواب زادی نہ ہو تو۔" ایک اور عورت نے تبصرہ کیا۔

شاداں نے باہر جا کر عندلیب کا ہاتھ مروڑا اور سمجھاتے ہوئے زبردستی باگ پکڑانے کی کوشش کی۔

"گاؤ نہیں تو خیر نہیں۔" لوگ دیکھ نہ رہے ہوتے تو وہ ایک دو جڑ دیتی۔

گھوڑا بھی بدک کر ہلا سہرے میں چھپا دولہا بھی اچھلا۔ شفقت لاٹھی لے کر آگے بڑھا تھا کہ عندلیب پر زور ڈالے مگر اسی وقت تماشائیوں میں سے خیام آگے آ گیا۔

"بس" خیام نے شفقت سے کہا۔

پھر جیب سے وہ موٹی نوٹوں کی دستی نکالی جو اس نے سلامی میں دوست کو دینے کے لیے رکھی تھی۔

"یہ لو اور دور ہٹ جاؤ۔" اس نے شفقت سے کہا۔

شفقت نے ڈرتے ڈرتے نوٹ پکڑے۔ یہ رقم اس سے کئی گنا تھی جو چوہدرائن سے متوقع تھی۔ عندلیب نے نگاہ اٹھا کر خیام کو دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ خیام نے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور ایک شعر پڑھا۔ وہ ساتھ ساتھ گھوڑے کو لیے آگے

چلنے لگا۔ رکی ہوئی بارات میں جان آئی۔ باقی بھی چلنے لگے۔ ابھی تو بارات جانی تھی یہ تو ابتدائی محفل تھی۔ خیام مزید شعر پڑھتا رہا۔ ایک جگری دوست کی طرح وہ اپنے یار کی گھوڑی کو دہلیز پار کروا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ عندلیب وہیں کھڑی رہ گئی۔

خیام کے بعد ایک دوسرا دوست آ گیا بارات حویلی سے نکل کر سامنے بڑے میدان میں آ گئی۔ عورتیں بھی باہر نکل آئیں۔ میدان میں دعائے خیر ہوئی۔ جلیس پھر گھوڑی سے اتر کر گاڑی میں بیٹھا اور دوسرے بھی سوار ہوئے۔ بارات چل گئی۔ راستے کی مٹی بیٹھی تو شفقت نے عندلیب کو صلواتیں سناتے ہوئے زمین پر بکھری وارنیا سمیٹنا شروع کر دیں۔ عندلیب یک ٹک ویران راستہ دیکھ رہی تھی۔ وہ کہاں چلا گیا تھا اس کے دل کا سوز اس بار کسی اور وجہ سے تھا۔

☆☆☆

وہی جانتا ہے اس نے پورا فنکشن کیسے گزارا۔ باقی سب مراثیوں کے اس خاندان کو بھول بھال چکے تھے۔ وہ جیسے ہی واپس آیا پوچھتا ہوا عندلیب کے گھر گیا۔

شاکر نے دروازہ کھولا اور حیران رہ گیا۔ بہت مشکل سے کہا گیا کہ عندلیب گھر پر نہیں ہے۔ خیام کے قدم اسی سمت بڑھ گئے جہاں اس نے پہلی بار اس کو دیکھا تھا۔ آج وہ گا نہیں رہی تھی اس لیے ڈھونڈنا دشوار تھا۔ پھر بھی وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ سادہ سے لباس میں وہ خاموش بیٹھی پرندا بن رہی تھی۔ اب اسے دیکھ کر چونک گئی۔

"عندلیب! میں خیام ہوں۔ مجھ سے شادی کرو گی؟" خیام نے سیاہ چمکیلی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

عندلیب نے شرط رکھی تھی کہ اس کی شادی ڈنکے کی چوٹ پر ہو۔ خیام نے شفقت کو رقم دی اور مہینہ مقرر کیا۔ جلیس کی حویلی میں ولیمے کے اگلے جمعہ ہی ایک اور بارات دھوم دھام سے نکلی تھی پورے گاؤں کے سامنے خیام نے عندلیب کو اپنایا تھا۔

پھر ویسے ہی دھوم دھام سے باراتیوں کا قافلہ رحیم پور میں داخل ہوا اور کفایت علی شاہ کی حویلی تک گیا۔ پورے گاؤں نے خیام شاہ کی دلہن کو آتے دیکھا۔

☆☆☆

کفایت شاہ کی حویلی میں تو کہرام مچ گیا۔ خیام شاہ ایک گانے والی مراثن کو بیاہ لایا تھا۔

"گانا اس کا پیشہ ہے، ہم زمین جوت کر محنت کرتے ہیں وہ گا کر کرتی ہے۔ اس میں برائی نہیں ہے۔" خیام سب کو سمجھا رہا تھا۔

مگر کوئی سمجھنے کو راضی نہ تھا۔ ابھی خیام تیسرا بیٹا تھا۔ بڑا بھائی کمال باپ کا جانشین تھا۔ دوسرا بیٹا فیضان کاروباری معاملوں میں طاق تھا۔ خیام کچھ پردوں میں زندگی گزار لیتا تو بھی خاص فرق نہ پڑتا۔ مگر یہ تو سب کی عزت پر بٹا لگ گیا تھا۔

"جس کو تم بیاہ کر لائے ہو اس پر سو پردے بھی ڈالیں تو کم ہیں۔ پیر کفایت علی شاہ کا بیٹا مراثن بیاہ لایا ہے۔" ماں نے تو ماتم شروع کر دیا تھا۔

عندلیب اور خیام خاموشی سے اپنے کمرے میں محدود ہو کر زندگی گزارنے لگے۔

طوفان تھم گئے مگر ماحول کی گرد کبھی دور نہ ہوئی۔

☆☆☆

بڑی اولاد کو انسان دنیا کے لیے پالتا ہے۔ اصول و ضوابط سکھاتا ہے اس پر محنت کرتا ہے اور اس کی لگامیں کھینچ کر رکھتا ہے کیونکہ کل کو اس نے بڑا بن کر دکھانا ہوتا ہے۔ دوسری اولاد پر انسان تھوڑی لگامیں ڈھیلی رکھتا ہے، اس کی صلاحیتوں کو پہچان کر ان کو نکھارتا ہے۔ اور سب سے چھوٹی اولاد آنکھ کا تارا ہوتی ہے۔ اسے سب کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

اس کے اترنگی انداز کو دیکھ کر باپ وہ زندگی جیتا ہے جو اس نے کبھی اپنے لیے چاہی تھی اور جی نہیں پایا تھا۔ سختی سے پاک پرورش میں خوشیاں

نچھاور کرتے ہوئے وہ چاہتا ہے کہ اس کی وہ چھوٹی اولاد اس کا نام ایسے روشن کرے کہ اس کا دل خوش ہو جائے۔ مگر خیام نے کفایت علی شاہ کے دل کو دھکا لگا دیا تھا۔ کوئی تو لاج شرم رکھی ہوتی ایک گاؤں کی غریب گانے والی کی بجائے اگر شہر کی مائیک پکڑ کر کنسرٹ کرنے والی بھی لے آتا چلو تب بھی کچھ سمجھ آتی تھی۔

کفایت علی شاہ اب بھی خیام کے لیے سب سے لڑ رہے تھے۔ مگر اب وہ لڑتے لڑتے بیمار پڑ گئے۔ ان کی وجہ سے خیام اور عندلیب کے منہ پر کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ وہ دونوں اپنے الگ کمرے میں رہتے تھے انہیں کھانا پہنچ جاتا تھا۔ پھر وہ وہاں گائیں ناچیں کسی کو اس نوگو ایریا سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔

مگر کفایت علی شاہ دوبارہ تندرست نہیں ہوئے کچھ سال بیماری چلی اور اس کے بعد ان کی جان لے کر ہی گئی۔ خیام اور عندلیب پر ایک اور الزام آ گیا کہ ان کی وجہ سے خاندان کا سربراہ بلکہ پورے گاؤں کا روحانی پیشوا چل بسا۔ بقول ان کے اب گاؤں پر کفایت علی شاہ کی دعا کی چادر نہیں تھی بلکہ عندلیب کے ناچ گانے کی نحوست تھی۔

☆☆☆

خیام اور عندلیب کا کمرہ پہلی منزل پر پیچھے کی طرف تھا۔ کھڑکی بھی پیچھے لان میں کھلتی تھی اور وہیں ایک برآمدہ تھا۔ جس سے زینہ اوپر جاتا تھا۔ سامنے کے گھر میں ہوتی ہر ہلچل سے بے فکر عندلیب اپنی اس چھوٹی سی جنت میں خوش بھی جلد ہی اس کے سر لوٹ آئے تھے۔

"میں تو پیا سے نینا لڑا آئی رے
گھر نا ری گنواری کہے سو کرے
میں تو پیا سے نینا لڑا آئی رے۔"

گیلا تولیہ منڈیر پر ڈال کر عندلیب اپنے بال بناتے ہوئے گا رہی تھی۔ خیام گھر پر نہیں تھا۔ وہ گھنٹوں ماں کے پاس بیٹھتا تھا۔ کام پر بھی جاتا تھا۔ پھر اتنا ہی وقت عندلیب کو بھی دیتا تھا۔ عندلیب اپنے جنت نظیر کمرے میں اپنے مشاغل میں مصروف رہتی تھی۔

"سوہنی صورتیا
موہنی مورتیا
میں تو ہریدے کے پیچھے سا آئی رے۔"

اس کے بال بس گیلے ہو کر ہی آزاد ہوتے تھے۔ ورنہ وہ انہیں رنگین پراندوں میں گوندھے رکھتی تھی۔ اس کی پیٹھ نچلے لان کی طرف تھی۔ خود وہ کھڑکی کے رنگین شیشے میں اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ وہ گنگنا رہی تھی جب اس کی کمر پر ایک گیند آ کر لگی۔ وہ چونک کر مڑی۔

"سوری چاچی! میری بال آئی ہے۔" گیارہ سال کا حسام آدھے زینے پر آ چکا تھا۔ خاندانی چوڑا چہرہ خیام جیسی ذہین آنکھیں۔ وہ اس کا ہی بچپن لگ رہا تھا۔ سسرال میں پہلی بار اتنے نارمل انداز میں اس سے بات کی گئی تھی۔ عندلیب نے اٹھ کر گیند پکڑی اور آگے بڑھائی۔

"یہ لو مگر پہلے بتاؤ چاچی کے بھتیجے کا نام کیا ہے؟" عندلیب کی فطری مسکراہٹ لبوں پر آ جمی۔

"حسام شاہ ولد کمال شاہ۔" حسام نے سینہ چوڑا کر کے تعارف کروایا۔ عندلیب نے اس کے بال پیار سے سہلائے شجرہ نصب کی طرح تعارف کروانے والا یہ بچہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ یہ حویلی کی نئی نسل تھی۔ جب یہ بڑی ہوگی تو عندلیب کو جائز عزت مل ہی جائے گی۔ وہ حسام کی آنکھوں میں دیکھ کر سوچ رہی تھی۔

"چڑیل چنڈال دور ہٹو۔ حسام، تم نیچے آؤ۔ نا جانے کیسا سچ خون ہے بچے پر بھی نظر ہے۔" نجمہ بھابھی نیچے سے گزر رہی تھیں۔ جب حسام کو عندلیب کے پاس دیکھا۔

عندلیب نہ جاہل تھی نہ بدکردار مگر حویلی میں اسے یہی دو القاب ملتے تھے۔ عندلیب جم سی ہوگئی۔ حسام ڈر کر نیچے چلا گیا۔ اس دن عندلیب نے حساب لگایا اس کی شادی کو چوتھا سال تھا۔ وہ منہ دکھاوے

کے لیے کبھی، کسی خاندانی تقریب میں بلا بھی لی جاتی تو کوئی اس سے بات نہ کرتا۔ مہمان خواتین اسے گھورتی رہتیں۔ مگر اس سے بات کر کے دشمنوں میں شامل ہونے سے باز رہتیں۔

عندلیب کے پاس دو راستے تھے۔ وہ ساری عمر دے کر خود کو منوانے کی کوشش کرتی یا خاموشی سے اپنا راستہ، الگ کر کے خیام کے ساتھ اپنی زندگی جیتی۔ اس نے دوسرا راستہ اپنایا۔

☆☆☆

کفایت شاہ کا ایک مکان گاؤں کے کنارے پر تھا۔ قریب ہی بنجر زمین اور ہائی وے تھی۔

بہت عرصے اس مکان میں جانور باندھے جاتے رہے۔ پھر وہ بھی دوسرے ڈیروں پر چلے گئے تو مکان حریدو ویران ہو گیا۔ رحیم پورہ کے ساتھ ہی سکھوں کی کچھ کیوٹیز تھیں۔ گردوارے بھی تھے۔ یہ مکان مسلمان آبادی سے دور اور سکھوں کے علاقے سے قریب تھا۔ اب خیام نے باپ کی اجازت سے اس حویلی کو آباد کر لیا تھا۔

بجلی کٹ چکی تھی زنگ آلود نل سے پانی مشکلوں سے آتا۔ مکان کی عام نکاسی وغیرہ سب ٹھیک کروانی پڑی تھی۔ پھر بھی مکان ابھی تک کھنڈر ہی تھا۔ اس نے سوچا تھا آہستہ آہستہ کرواتے رہیں گے۔ یہاں عندلیب اور خیام نے محبت کے نام پر ایک نئی دنیا کی بنیاد رکھی تھی۔ عندلیب کو اس بے سرو سامان ٹھکانے سے ہی محبت ہو گئی تھی۔ عندلیب پورے مکان میں بلبل کی طرح چہچہاتی پھرتی تھی اور خیام فرمائش کر کر کے اس سے گیت سنتا تھا۔

☆☆☆

"میں بات کر آیا ہوں جلد ہی بندہ آئے گا اور بجلی کا نیا میٹر لگا جائے گا۔" خیام کھلے صحن میں مسہری پر لیٹا تھا۔ عندلیب نے پاس موم بتی لا کر رکھی۔

"اب تو سورج کے ساتھ جینے کی عادت ہو گئی ہے۔" عندلیب پاس بیٹھ گئی۔

"لیکن مجھے تو چاند کے ساتھ جینا پسند ہے۔" خیام شرارت سے اس کے پراندے کے بل کھولنے لگا۔

"پھر بجلی کے بلب کو بیچ میں مت لاؤ۔ یہ چاند ناراض ہو جائے گا۔" عندلیب نے مڑ کر مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

"بجلی آئے گی ٹی۔وی فریج اور بہت کچھ آ جائے گا۔" خیام نے سمجھایا۔

اس مکان میں ان کو دوسرا مہینہ تھا۔ یہاں پر جیسے دنیا ماضی میں چلی جاتی تھی۔

پرانے وقتوں کی طرح کم سہولتوں اور زیادہ وقت کے ساتھ وہ ایک دوسرے میں مگن رہتے تھے۔

"ان اونچی دیواروں کو دیکھ کر لگتا ہے۔ باہر کوئی دنیا ہے ہی نہیں۔ ہم دونوں دنیا شروع ہونے سے پہلے یہاں تنہا ہیں۔ ہمارے اس بسیرے میں کوئی باہر والا آئے گا تو اس کو خراب کر دے گا۔" عندلیب ڈرتی تھی۔

خیام نے زوردار قہقہہ لگایا اور اس کے خدشوں کو غلط ثابت کرنے لگا۔ مگر عندلیب سچی تھی خیام کی ماں دل سے دعا کرتی تھی کہ بیٹا، بے اولاد رہ جائے مگر اس گانے والی سے اولاد نہ ہو۔ اونچی دیواروں والے مکان کے باہر کی دنیا دشمن تھی اور اندر کی دنیا جنت۔

"میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہی ہو اولاد نہ ہونے میں خدا کی مصلحت ہوگی۔" خیام نے تسلی دی۔

"میں گم نام نہیں ہونا چاہتی۔" عندلیب نے کہا۔

"ہماری محبت ہی ہماری میراث ہے۔ یہ ہمیں گمنام نہیں ہونے دے گی۔ بلکہ داستان بنا دے گی۔ وہ داستان جو ہمیشہ یاد کی جائے گی۔" خیام نے تسلی دی۔

☆☆☆

عندلیب صحیح کہتی تھی اس مکان کے باہر کی دنیا ان کے لیے نہیں تھی۔ خیام کا سیر پر جانے کا دل ہوا۔

لوگ ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ بھی لوگوں سے دور دریا کے ایک ویران کونے میں گئے تھے۔ اس دن دریا میں بھی طغیانی تھی۔ وہ دریا کنارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ایک دم سے من موجی خیام کا تیر نے کا دل ہوا۔

"نہیں خیام، آج لہریں بہت تیز ہیں۔" عندلیب نے روکا۔

"میں ماہر تیراک ہوں کچھ نہیں ہوگا۔" خیام نے چست پینٹ اور قمیض پہن رکھی تھی۔

"تم کیوں بھول جاتے ہو ہمارے ساتھ دوسروں کی بددعائیں ہیں۔" عندلیب نے کہا۔

"تم بھی بھول جاتی ہو تمہاری آواز کتنی اچھی ہے۔ وہ گانا سناؤ جو تم نے پہلی بار گایا تھا۔" خیام نے کہا اور دریا میں کود گیا۔

عندلیب بے بسی سے دیکھتی رہی۔

"پنگھٹ والا تھا۔" خیام نے دریا سے سر نکال کر یاد کروایا۔

عندلیب کو اس کی خیریت کی تسلی ہوئی تو مسکرا دی۔

"بہت کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی۔" عندلیب گانے لگی۔ آج وہ آنکھیں کھول کر گا رہی تھی تاکہ خیام نظر آتا رہے۔ گانا ختم ہونے سے پہلے ہی خیام نظر آنا بند ہو گیا۔ وہ ڈر کر رک گئی۔ خیام نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔

"اور دوسری بار تم مہندی کے فنکشن میں جو گا رہی تھیں۔" خیام ایک دم سے پھر نمودار ہوا۔

"موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ لے۔" عندلیب زمین کی گھاس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گانے لگی۔

"اب آپ کی باری، آپ وہ کلام سنائیں جو آپ نے بارات کے جانے سے پہلے سنایا تھا۔" عندلیب نے پہلی بار فرمائش کی تھی۔

آگے سے کوئی جواب نہیں آیا۔

"خیام.... خیام...." عندلیب نے پکارا۔

پھر شور مچا دیا وہ بہت ویرانے میں تھے۔ کچھ دیر بعد لوگ اکٹھے ہوئے غوطے لگائے۔

عندلیب جانتی تھی ان ہونی ہو گئی ہے۔ وہ اس کی آواز پر نہیں آیا تو انہونی ہی ہو گئی ہوگی۔ حویلی اطلاع گئی، ماہر لوگ آئے لیکن کفایت شاہ کے تیسرے سپوت کی لاش ہی مل سکی۔ زندگی نے خیام کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ اپنی قسم دے کر عندلیب کا کوئی وارث مقرر کر جاتا۔ وہ جو اس کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر آئی تھی بالکل تنہا رہ گئی۔

☆☆☆

"میں کہتی تھی نا یہ ڈائن ہے میرے بیٹے پر جادو کیا پھر اس کو کھا گئی۔" ماں نے کہا۔

"بدکردار لڑکی شہزادے جیسے مرد کو کیا بنا دیا۔" کسی اور نے کہا۔

ایک بزرگ عورت نے تو جذباتی ہو کر اس کی چوٹی نوچ ڈالی۔ بچے جنازے سے زیادہ اس سے خوف زدہ تھے۔ ان عزت داروں کی حویلی میں عزت کے دعوے داروں نے، اس کی عزت تار تار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

☆☆☆

"سب سکھیوں میں چادر میری میلی
دیکھیں ہنس ہنساری"

خیام کو گزرے ہوئے گیارہ مہینے گزر گئے تھے۔ ان مہینوں میں اس نے اتنی ذلت سہی تھی کہ زندگی سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

"اب کے بہار چادر میری رنگ دے
پیا رکھ لے لاج ہماری۔"

اس روز اس کو خیام کی اتنی یاد آئی کہ حویلی سے باہر نکل گئی۔ خیام کے جانے کے بعد وہ پہلی بار گا رہی تھی۔

"صدقہ بابا گنج شکر کا رکھ لے راج ہماری۔"

بہت دور جا کر اس نے سر سے چادر اتاری اور چلتی رہی۔

pklibrary.com

"قطب فرید مل آئے براتی، خسرو راج دلاری۔" کلائیوں کی چوڑیاں اتری نہیں تھیں۔ اس لیے تو گیارہ مہینے سے پہن رکھی تھیں۔ اب اس نے وہ توڑ توڑ کر پھینکنی شروع کر دیں۔

"کوئی ساس کوئی نند سے جھگڑے، ہم کو آس تمہاری۔" سامنے وہ دریا نظر آنے لگا جہاں خیام نے آخری سانس لی تھی۔ عندلیب نے دوڑ لگا دی۔

اگلے روز دریا کے کنارے پڑی اس کی چپل اور چنری سے معلوم ہوا تھا کہ عندلیب اپنے محبوب سے جا ملی ہے۔ اونچی دیواروں والے مکان میں بجلی کا میٹر لگنے سے پہلے ہی اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس دریا کے آس پاس رہنے والے لوگ کہتے ہیں کہ اس روز کے بعد سے، دریا کی لہروں میں امیر خسرو کی رباعی کی آواز آتی ہے۔

وہ زمین جو خیام اور عندلیب کی محبت سنبھال نہیں سکی تھی، اب حسام اور ہرناز کی محبت کے لیے بھی تھوڑی پڑ گئی تھی۔

☆☆☆

ٹونی کو معلوم ہوا تو اس نے غصے میں خوب توڑ پھوڑ کی۔ باپ نے روک رکھا تھا ورنہ یہ توڑ پھوڑ حسام کے گھر ہوتی۔

"تم تو جانتی ہوگی کہ وہ مجھے بے وقوف بنا رہا تھا۔ مجھ سے دوستی کر کے اس نے میری بہن تک راستہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ تم جانتی تھی کہ نہیں؟" اس نے بہن سے جواب مانگا۔

"تم دونوں کی دوستی بچپن کی تھی۔ میں بیچ میں کہاں سے آئی۔" ہرناز یہی ظاہر کر رہی تھی کہ حسام کے جذبے یک طرفہ ہیں۔ اسی میں ان دونوں کی بھلائی تھی۔

"بیچ میں آنا بھی مت، بے وقوف نہ بننا پورا خاندان پوری برادری چھوڑ کر زندہ بچ بھی گئی تو زندہ نہیں رہو گی۔ یہ کھیل تماشہ نہیں ہے۔ لاشیں گر جائیں گی۔" وہ غاصب کی طرح نہیں مہربان بھائی کی طرح سمجھا رہا تھا اور ہرناز سمجھ رہی تھی۔

"حسام کے باپ نے اس کی ہڈیاں توڑ دی ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے۔ وہ بزدل ہیں جو صرف ہڈیاں توڑی ہیں۔ مجھے موقع ملا ہوتا تو۔" ٹونی نے ہاتھ پر مکھی مار کر بات تصورات پر چھوڑ دی۔

یہ میل انہونی تھا۔ دل جتنا بھی دکھے دل کو منانے کے علاوہ ہرناز کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔

☆☆☆

ہر محبت بے لگام نہیں ہوتی، کئی محبتیں بند باندھ کر روکی جا سکتی ہیں۔ پھر عرصے تک وہ ایک آس کی طرح دمک کر بجھ ہی جاتی ہیں۔ چاہے ساتھ دل بھی بجھ جائے۔ وہ بھی بند باندھ لیتی تو بچ جاتی۔ تین دن انگاروں پر لوٹنے کے بعد ہرناز سے رہا نہیں گیا۔

وہ بچوں کو ہارمونیم سے سکھاتی تھی۔ وہیں اسکول میں موقع پا کر اس نے حسام کو فون کر لیا۔

"زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔"

اس کو نہ جانے کیوں اس کی فکر تھی جس کی ہلکی سی لغزش سے وہ بدنام ہو سکتی تھی۔

"میں اندر تک گھائل تھا تمہاری آواز سن لی اب سو بار ایسی مار برداشت کر لوں گا۔"

حسام کے زخم پھول بن گئے تھے۔

"اگلی بار مار نہیں پڑے گی سیدھا جان لی جائے گی۔" ہرناز نے ڈرایا۔

"تم پر قربان ہونے کے لیے ہی تو پیدا ہوا ہوں۔" وہ پھر سے جی اٹھا تھا۔

ہرناز نے ڈر کر فون بند کر دیا تھا۔ کچھ دن کی دوری کے بعد حسام نے اپنی ایک کزن کی مدد سے فون کیا تھا۔

"میں مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکتی۔" اس بار وہ رو پڑی تھی۔

"مجھ سے محبت کرنا چھوڑ سکتی ہو؟" وہ بچ میں دیوانہ ہو گیا تھا۔

"یہاں بھی میں مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ جھوٹ بھی نہیں بول پاتی تھی۔

"چاہو تو تمہارے لیے جان دے دیتی ہوں۔ میری سانسوں کے ساتھ یہ الجھن بھی ختم ہو جائے گی۔" وہ بھی دیوانی تھی۔

"تم سے جان جدا کر کے میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میرا ساتھ دو گی؟ نکاح کر لیتے ہیں؟ پھر اگر مارے بھی جائیں گے تو دکھ نہیں ہوگا۔ چند لمحوں کے لیے ہی اگر تم میری ہو میں تو میں خوشی جان دے دوں گا۔ اس احساس کے ساتھ کے کبھی تم میری تھیں۔" وہ انتہا پر تھا۔

"کیا میرا اور تمہارا نکاح ممکن ہے؟" ہرناز تکنیکی پہلو پوچھ رہی تھی۔

"ایک ہی صورت میں ممکن ہے۔" اس نے حل بتایا۔ ہرناز خاموش ہو گئی۔

وہ خاموش ہوئی تھی مگر ان کے بیچ محبت خاموش نہیں ہوئی تھی۔ ان کی زندگی ہفتہ بعد چوری چھپے کی گئی اس فون کال کے گرد گھومنے لگی تھی۔ جو دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کو کر ہی لیتا تھا۔

☆☆☆

"اپنے ساتھ ہرناز کے بھی کینیڈا جانے کے کاغذ بنوالو۔" بلدیو نے بیٹے کو آرڈر دیا۔

حسام والے واقعے کو کچھ وقت گزر چکا تھا۔ اب تک سب حسام کی پسندیدگی یک طرفہ سمجھ رہے تھے۔ پھر بھی یہ قدم ضروری محسوس ہو رہا تھا۔

"ہرناز کی شادی کر دیں۔ ادھر کمیونٹی میں بھی اس کے کئی اچھے جوڑ ہیں۔" بلدیو کو اس میں بھلائی نظر آ رہی تھی۔

"ان اچھے جوڑوں کے گھر دیواریں ہی ہوں گی۔ ٹاپ کر آنے والے کا دھڑکا لگا رہے گا۔ باہر یہ فکر نہیں ہوگی۔" بلدیو نے عقل مندی سے کہا۔

سب مان گئے گھر والے اسے کینیڈا بھیجنے پر اور وہ حسام کی خاطر سب کو چھوڑنے پر۔ حسام کی محبت سانسوں سے قیمتی ہو گئی تھی۔ وہ بھی یہی سوچتی تھی کے چاہے ماری جائے مگر حسام کی ہو کر مرے گی۔

☆☆☆

"سب چھوٹ جائے فرق نہیں پڑتا بس تمہارا ساتھ نہ چھوٹے۔" ہرناز نے بھی کہا تھا۔ اس روز وہ گھر پر اکیلی تھی تو گھر کا فون بجا۔ ہرناز نے حسام کو سختی سے کہہ رکھا تھا کہ کبھی کچھ بھی ہو جائے۔ وہ گھر پر خود سے فون نہ کرے ورنہ پکڑا جائے گا۔

حسام نے پھر بھی فون کر لیا تھا۔

"میں تمہارے گھر کے باہر کھڑا ہوں اب بھی اپنے ارادے پر قائم ہو تو آ جاؤ۔" اس نے سیدھی بات کی تھی۔

ہرناز کے ہاتھ سے فون چھوٹ گیا۔ اس نے دوڑ کر کھڑکی سے جھانکا۔ وہ جانتا تھا کہ دیکھا بھی گیا تو مارا جائے گا پھر بھی عین اس کے گھر کے سامنے کھڑا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ ہرناز کو لگا وہ اسی پل مر جائے گی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جلدی نہ کرتی تو حسام دیکھا جاتا۔ اتنا بڑا فیصلہ یوں دباؤ میں ہونا نہیں چاہیے۔

اس نے گھر سے نکلنے کا نہیں سوچا تھا۔ اور یہ تو ایسا خیال تھا جو ہزار بار آتا پھر جھٹکا جاتا۔ پھر کہیں دل مانتا۔ مگر اب ان مرحلوں کا وقت نہیں تھا۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے حسام بندوق لے کر اسے زبردستی اٹھانے آیا ہو۔ البتہ بندوق حسام نے اپنی کنپٹی پر رکھی تھی۔ وہ اپنی الماری تک آئی تو سانسیں اکھڑنے لگیں۔ اپنا ہی گھر قید خانہ لگ رہا تھا اور باہر کی دنیا گھنا جنگل۔ گھر میں اتفاق سے کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنا پرس پکڑا اور دہلیز پار کر گئی۔

☆☆☆

"ہماری بہن کو زبردستی گھر سے اغوا کیا گیا ہے۔" بلدیو اور اس کے لڑکے تھانے پہنچ گئے تھے۔

"رات سے پہلے لڑکی ہمارے پاس ہونی چاہیے۔" انہوں نے ایس-ایچ-او کو سارا معاملہ بتایا۔

"آپ کیوں آئے ہمیں بلا لیا ہوتا۔" ایس-ایچ-او نے کہا اور سارا عملہ متحرک ہو گیا۔

یہ بات بڑھتی تو بڑی بدنامی تھی۔ دو امن پسند

برادریوں میں خطرناک تصادم ہو جانا تھا۔ لو جہاد زبردستی کی شادی اغوا بہت سے الزام لگ جاتے۔ باقی دنیا تھوتھو کرتی کہ سرکار اقلیتوں کو تحفظ نہ دے سکے۔ حسام اسے اپنے گھر لے آیا۔ محبت کی قاتل وہ دیواریں پہلے ہی ایک شکار کر چکی تھیں۔ اب کے معاملہ صرف ناپسندیدگی کا نہیں تھا۔ اب تو جان خطرے میں تھی۔

"تمہارے دار جی ایم۔این۔اے کے پاس پہنچ گئے ہیں کہ ہماری لڑکی بازیاب کروا کر دیں۔ بہت محبت کرتے ہیں تم سے، انہیں ایسے دکھ نہیں دینا چاہیے تھا۔ تم واپس چلی جاؤ۔" نجمہ اس پر ہی زور دے رہی تھی کہ غلطی سدھار لے۔

لڑکی رات سے پہلے گھر پہنچ جاتی تو معاملہ دب جاتا۔ انٹرنیشنل میڈیا کے ہاتھ خبر لگ جاتی تو خوب جگ ہنسائی تھی۔ وہاں دکھایا جاتا کہ زبردستی مذہب قبول کروایا گیا ہے۔ ملک میں اقلیتیں محفوظ نہیں۔ اصلی معاملہ جو بھی تھا وہ کسی نے نہیں دیکھنا تھا۔ پڑوسی ملک نے اغوا کے نام پر فلم بنا دینی تھی اور وہی سچ مان لیا جاتا۔

"اس کے بھائی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔" دوسرے حسام کو ڈرا رہے تھے۔

"بھائیوں سے بچ گیا تو یہ میڈیا یا سیاست دان پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ جانتا ہوں تم اس سے بیاہ کرنے کے لیے لائے ہو۔ مگر یہ کیسی زندگی ہوگی کبھی سوچا ہے؟" کمال شاہ نے بیٹے سے کہا۔

"ماں باپ گھر بار سب چھڑوا دیا۔ ابتدا میں ہی اتنی قربانیاں مانگ لیں۔ رہ لو گی ساری عمر ماں کی صورت دیکھے بنا؟ صرف ایک حسام کی خاطر؟" بڑی بوڑھیاں اس کو سمجھانے میں لگی تھیں۔

"محبت کرتے ہو اور اس کے لیے دکھ بھری زندگی چن لی۔ ہر رشتے کا بدل بن کر رہنا تمہارے لیے ناممکن ہے۔ جلد تم بھی پچھتانے لگو گے اور وہ بھی۔" حسام کی برین واشنگ کرنے کے لیے بھی کئی لوگ تھے۔

"مرد کا کیا ہے آج ایک سے محبت کل دوسری سے۔ ساری عمر جان بچاتے پھرو گے تو خاک جیو گے۔" وہ عورتیں پل میں ہرناز کی سگی بن کر اس کو سمجھانے لگی تھیں۔

"بس پھر فیصلہ ہو گیا ہے بلکہ میرا حکم ہے۔ میں ایس۔ایچ۔او کو فون کر رہا ہوں۔ یہاں آ کر لڑکی کا بیان لے گا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا۔ لڑکی کہے گی کہ وہ اپنی مرضی سے آئی تھی۔ مگر اب شرمندہ ہے۔ گھر واپس جانا چاہتی ہے۔ اور تم بھی یاد رکھو نکاح ہوا ہے نہ ہی ابھی مذہب تبدیل ہوا ہے۔ اس کی بہتری اس میں ہے کہ اس کو بھول جاؤ۔"

کمال شاہ نے فیصلہ سنایا۔

ہر طرف سے مشکلیں تھیں۔ مگر جدا ہونے سے بڑی آفت دونوں کے لیے کوئی نہیں تھی۔ دونوں کو الگ رکھا گیا تھا۔ اور ہدایات دہرائی جا رہی تھیں۔ ایس۔ایچ۔او کی گاڑی باہر رکی۔ پہرہ دینے والوں کا دھیان ہٹا۔ عائشہ نے موقع دیکھ کر دونوں کو خاموشی سے بھگا دیا۔

☆☆☆

"کب تک بھاگیں گے؟ وہ جھاڑیوں میں چھپا موٹر سائیکل دیکھ کر ڈھونڈ لیں گے۔" ہرناز ہانپ رہی تھی۔

وہ دونوں موبائل چھوڑ کر نکلے تھے تاکہ ٹریس نہ ہو سکیں۔ معاملہ اتنا سنگین ہو چکا تھا کہ پناہ دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ دونوں طرف مذہبی جنونی متحرک ہو گئے تھے۔

اور ان دونوں کے نام پر مارنے کاٹنے کو تیار تھے۔

"کچھ عرصہ چھپ کر گزار لیتے ہیں۔ معاملہ ٹھنڈا ہوگا تو سب مان جائیں گے۔" حسام نے سمجھایا۔

"مگر کہاں چھپیں گے؟ ابھی تو ہر طرف اتنی روشنی ہے۔" ہرناز نے مشرق سے ابھرتی کرنوں کو دیکھا۔

یہ وہ دن تھا جب روشنی اندھیرے سے زیادہ خوفناک تھی۔

"چلو اس مکان میں چھپ جاتے ہیں۔" حسام نے جھاڑیوں سے ڈھکا اونچی دیواروں والا مکان دیکھ کر کہا۔

"وہاں؟ وہاں تو بھوت ہوتے ہیں۔" ہرناز بھی اسی علاقے کی تھی۔ اس نے بھی سب سن رکھا تھا۔

"موت تو ہر طرف ہے۔" حسام بھی مایوس ہو چکا تھا۔

"یہ وقت بھی گزر جائے گا۔" ہرناز نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمہارے لیے کچھ لیا تھا ابھی لے لو دوبارہ وقت ملے نہ ملے۔" یہ کہہ کر حسام نے جیب سے ایک زیور کا ڈبہ اور اس میں موجود کڑا نکالا۔ اس باریک سے سیاہ کڑے پر سنہری حروف میں آیت الکرسی کندہ ہوئی تھی۔

"یہ تمہیں بھوتوں مشکلوں سب سے بچائے گا۔" حسام مسکرایا ساتھ آیت الکرسی پڑھ کر ایک دائرے کی صورت ہرناز پر پھونکی۔

"مجھے اب اپنے لیے خوف نہیں آتا تمہارے لیے آتا ہے۔" ہرناز نے سادگی سے کہا اور مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

حسام بھی کچھ پرسکون ہوا۔ جھاڑیوں سے زخمی ہوتے ڈرتے سنبھلتے وہ کسی طرح اندر چلے گئے۔ اونچی دیواروں والے اس کھنڈر نما مکان میں۔

☆☆☆

مکان سچ میں کھنڈر تھا۔ پلستر ناپید تھا۔ دیواریں ننگی۔ فرش اکھڑا ہوا تھا۔ مگر ایسا برا نہیں تھا۔ جیسا اس بیس سال سے بند مکان کو ہونا چاہیے۔ کھڑکیاں ٹوٹنے سے وہ ہوادار ہو گیا تھا۔

وہاں بدبو نہیں تھی۔ جس کمرے میں وہ تھے وہاں ایک صوفہ سیٹ اور ایک برتنوں کی الماری تھی۔ صوفے کے کشن پھاڑ کر فوم تک نکالا ہوا تھا۔ برتنوں کی الماری سے سالوں پہلے ہی کوئی برتن چوری کر کے لے گیا تھا۔ شروع میں وہاں کوئی نشئی رہا کرتا تھا۔ بھوت بھی پہلے اس نے ہی وہاں دیکھا تھا۔ اس لیے لوگوں نے یقین نہیں کیا۔ پھر ہوش مندوں نے بھی یہی بات بتائی تو وہاں سب نے ہی جانا چھوڑ دیا۔ وہ دونوں بھی اب اسی امید پر بیٹھے تھے کہ وہاں کوئی نہ آئے۔ وہ خیام اور عندلیب کی طرح اپنا الگ بسیرا کر لیں۔

"میں گھر بنواؤں گا تو ایسا ہی ایک کمرہ تمہارے لیے ضرور بنواؤں گا۔" حسام نے دل کو خوش کرنے کے لیے کہا۔

"اور میں اس کمرے میں روز تمہارے ساتھ چائے پیوں گی۔" ناز بھی مسکرائی۔

"اس گھر کے بیڈ روم میں اپنے علاوہ کوئی نہیں آنا چاہیے۔ بڑا سا ٹی وی ساؤنڈ سسٹم۔

دوسری طرف فریج ہو۔ اپنی چھوٹی سی دنیا۔ خاص طور پر کام والیوں کی انٹری اس کمرے میں بین ہوگی۔" حسام دیوار سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھا تھا۔ ناز اس سے مخالف دیوار کے ساتھ تھی۔

"کوئی بات نہیں صفائی میں خود کر دوں گی۔"

وہ دونوں پھر خاموشی سے بیٹھے آنے والے وقت سے امیدیں باندھنے لگے۔

"بچوں کے کمرے کا ایک دروازہ اپنے کمرے کے اندر سے ہونا چاہیے تاکہ رات میں اٹھ کر دیکھ سکیں۔" وہ سوچوں میں بہت آگے نکل گئی تھی۔ اب اس بات پر حسام نے بہت محبت سے اس کی سمت دیکھا۔ ہرناز شرما گئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے ہمارے خاندانوں کے بیچ سب صحیح ہو جائے گا؟" ناز نے حسرت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہو سکتا ہے اگر وہ ہمیں صرف دو انسان سمجھیں۔ اور اپنی اپنی برادری کا نمائندہ سمجھنا چھوڑ دیں۔ پھر شاید وہ ہمیں معاف بھی کر دیں۔" حسام نے امید دلائی۔

اتنے میں پیچھے کہیں دھم کی آواز آئی جوان خالی

درودیوار میں دل دہلا گئی۔

حسام نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ناز کو خاموش رہنے کے لیے کہا اور خود آہستہ سے باہر نکل کر دیکھنے لگا۔ گو یہ گھر اس کے خاندان کی ملکیت تھا مگر وہ یہاں بچپن میں بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ پیچھے لمبی گھاس سے ڈھکا ایک کنواں تھا اور کنویں کی اوٹ میں کوئی تھا۔ حسام نے ایک ٹوٹی کھڑکی سے احتیاط سے جھانکا۔ وہ ننگی دیواریں اس کا وجود ڈھکنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

اسی وقت کنویں کے پیچھے سے ایک گیدڑ نمودار ہوا۔ اس نے حسام کو دیکھا اور ڈر کر بھاگ گیا۔ حسام دو چار قدم تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تاکہ اسے بغور دیکھ سکے۔ گیدڑ غائب ہو گیا تھا۔ وہ کنویں کے پاس پہنچا اندر بالٹی ڈول رہی تھی اور پانی صاف تھا جو کہ بہت حیرت کی بات تھی۔ گاؤں بھر میں اب کوئی کنواں نہیں بچا تھا۔ اس سے بھی عجیب بات تھی کہ کنوئیں کی دیوار پر ایک شاپر میں پھل پڑے تھے۔ وہ پھل لے کر اندر آ گیا۔

"یہ پھل ادھر کیسے آ گئے؟" ناز کو پکڑے جانے کا خوف زیادہ تھا۔

"کوئی گزرتا ہوا چھوڑ گیا ہوگا۔" حسام کو بھوک لگی تھی۔

"یہاں سے کوئی نہیں گزرتا۔" ناز نے یاد کروایا۔

"ہو سکتا ہے کوئی کو امنہ میں دبا کر لے آیا ہو۔ یہ کوے بہت تیز ہوتے ہیں۔ تم کھاؤ تو سہی۔" اس نے پھل پیش کیے اور ناز ڈرتے ڈرتے کھانے لگی۔

☆☆☆

"کمال شاہ ضرور جھوٹ بول رہا ہے کہ وہ بھاگ گئے ہیں۔ وہ وہیں ہوں گے۔ وہ انہیں بچا رہے ہیں۔"

بلراج کے پاس دو بندوقیں تھیں۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں اجاڑ بیابان میں سفر کرتا رہتا تھا۔ اس بار اس نے اپنی بندوقوں میں ناز اور حسام کے نام کی گولیاں بھر لی تھیں۔

"ایس-ایچ-او ان کے گھر گیا تھا۔ پورے گھر کی تلاشی لی ہے وہ وہاں پر نہیں ہیں۔

پورے علاقے کی پولیس لگی ہوئی ہے بلکہ انٹیلی جنس بھی آ گئی ہے۔ دونوں مل جائیں گے۔" بلدیو تو کندھے جھکائے بیٹھا تھا۔

اولاد سے پیار ماں باپ کو کیا کچھ نہیں دکھاتا۔ کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ ان کی کمیونٹی میں بات تیزی سے پھیل رہی تھی۔

"اس نے ایس-ایچ-او کے سامنے جا کر کہہ دیا کہ واپس نہیں آنا چاہتی تو؟" ٹونی نے کہا۔

"واپس لانا ہی کیوں ہے؟ تاکہ مار کر نام اونچا کر سکو؟ برادری والے اس کی کھال ادھیڑ دیں گے تاکہ کوئی اور لڑکی یہ حرکت نہ کرے۔" باپ نے کہا۔

"بہن ہے تمہاری معاف کر دو میں اسے سمجھاؤں گی وہ میری بات مان لے گی۔" ماں بھی ان دہکتے الاؤ جیسے مردوں کو ٹھنڈا کرنے میں لگی تھی۔

"گھر سے بھاگ گئی ہے، اس کا اور کیا انجام ہونا چاہیے۔" بلراج پھر دھاڑا۔

"صرف چند گھنٹے ہوئے ہیں اگر وہ معافی مانگ لے اور پچھتائے تو اس کو معاف کر دینا چاہیے۔" ماں نے پھر سمجھایا۔

"چند گھنٹے ہوں یا چند پل گناہ گار تو وہ ہے۔" بلراج کے سر پر خون سوار تھا۔

"ماں کی خاطر بھی اس گناہ گار کو معاف نہیں کرے گا؟" ماں اب جھولی پھیلا کر رو رہی تھی۔

"میں اسے کل کے سورج چڑھنے جتنی مہلت دے سکتا ہوں۔ کل کا سورج چڑھ گیا اور وہ واپس نہ آئی تو پھر تم مجھے بیٹا سمجھ کر رعایت دے دینا اور اپنی بیٹی کا قتل معاف کر دینا۔" بلراج نے کہا اور ماں کو روتا چھوڑ گیا۔

☆☆☆

"اندھیرا ہونے والا ہے۔" ناز نے گہرے پڑتے آسمان کو دیکھا اور غیر ارادی طور پر حسام کے

نزدیک ہوگئی۔ اس نے میلے سے لی پازیب پہن رکھی تھی۔ جو مدھم سی چھنک رہی تھی۔

"رات گزار لیتے ہیں پھر تہجد والے وقت پر نکلیں گے۔" حسام نے تسلی دی۔ اس بھوت بنگلے میں گہرے ہوتے سائے اس کی بھی جان نکال رہے تھے۔

"کمر دکھ گئی ہے۔" ناز نے اٹھ کر کمر پر ہاتھ رکھا۔

"میں دیکھتا ہوں۔ سونے کے لیے کوئی جگہ ہوگی۔ دادی نے کوئی سامان نہیں اٹھایا تھا سب یہیں چھوڑ دیا تھا۔ یہ تو چور لٹیرے آگئے اور ایسی حالت کر دی۔" حسام کہتے ہوئے مختلف کمرے کھولنے لگا۔

اندر عجیب بھول بھلیاں تھی۔ تقریباً ہر کمرے کے دو دروازے تھے۔ دوسرا دروازہ کہیں اور کھل جاتا۔ اپنے حساب سے یہ گھر بہت ماڈرن تھا۔ تب کے روایتی گھروں کی طرح بیچوں بیچ صحن نہیں تھا۔ بیٹھک نما بڑا کمرا تھا۔ ایک طرف کمروں کی قطار اور دوسری طرف اسٹور، نماز کا کمرہ اور کھانے کا کمرہ۔ اب تو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے سارا نقشہ آپس میں گڈمڈ ہو گیا تھا۔

"یہاں فرش پر ایک گدا پڑا ہے۔ بہت صاف ستھرا ہے۔ اپنی چادر بچھا کر تم لیٹ سکتی ہو۔" حسام نے کہا۔

ناز اس کے پیچھے اس کمرے میں آئی جو اندر کو ڈھکا چھپا تھا۔ وہاں آنے کے لیے ان کو کافی بوسیدہ فرنیچر پھلانگ کر آنا پڑا تھا۔ اس کمرے میں کوئی دوسرا دروازہ نہیں تھا۔ بس ایک کھڑکی تھی جو کسی اور کمرے میں کھلتی ہوگی اب تو وہاں بھی اینٹوں کا ملبا پڑا تھا۔

"یہ تو اتنی اچھی حالت میں ہے جیسے ابھی کوئی یہاں سوتا ہو۔" ناز نے خوش گوار حیرت سے کہا۔ پھر خود ہی اپنے جملے کی بازگشت سنی اور ڈر گئی۔ اس نے لپک کر حسام کا بازو پکڑ لیا۔

"مجھے نہیں لگتا بھوت سوتے ہیں۔" حسام نے تسلی دینے کے لیے اسے چند پل کے لیے بازوؤں کے حصار میں لیا۔

"بھوت رات کو نکلتے ہیں تو دن کو کہاں جاتے ہوں گے؟" ناز نے پوچھا۔

اسے ماں باپ کا گھر، دھتکارتا سسرال۔ کورٹ پولیس مذہب اس وقت سب بھول گیا تھا۔ بس اردگرد ان دیکھے بھوت نظر آرہے تھے۔

"کیا معلوم درختوں پر چڑھ جاتے ہوں یا زمین میں گھس جاتے ہوں۔" حسام نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب آرام کرلو۔ صبح میرا دوست شہر لے جائے گا۔ تم کلمہ پڑھ لینا۔ ساتھ ہی ہم نکاح کرلیں گے۔ پھر ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکتا۔" حسام نے بہت امید سے کہا اور گدا کھولا۔

"یہ دیکھو تمہارا پراندہ۔ ادھر پڑا ہے" حسام نے اس کو سمجھاتے ہوئے گدے سے ایک چمک دار پراندہ نکالا۔

"یہ میرا تو نہیں ہے۔" ناز نے نکلتی جان کے ساتھ کہا۔ وہ گرنے کو تھی حسام کی بھی آنکھیں پھیل گئیں۔

"چلو یہاں سے۔" حسام نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

مگر دونوں میں ہلنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔ اتنے میں اس کمرے کے ایک کونے پر بچھا قالین ہوا میں اٹھنے لگا۔ ساتھ ہی چرچر کی آواز آرہی تھی جیسے زمین پھٹ رہی ہو۔

قالین اوندھا ہو گیا اور زمین پھٹ گئی۔ اندر سے ایک سیاہ وجود نکلا۔ دونوں میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ چیختے وہ تو ہاتھ تھامے سرپٹ بھاگے۔ آگے ڈھیروں ڈھیر کباڑ فرنیچر تھا۔ وہ ٹکراتے ٹھوکر کھاتے گر رہے تھے۔ شکر ہے بھوت ان کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ حسام گر کر اٹھا اور دوبارہ بھاگنے لگا۔ تب اندر والے کمرے سے اونچی آواز میں آیت الکرسی پڑھنے کی آواز آنے لگی۔ وہ بھوت بھی تو خود آیت الکرسی کیوں پڑھ رہی تھی۔ حسام رک گیا۔ ناز نے بھی اپنی

کلائی کا کڑا دیکھا۔ جس پر آیت الکرسی کندہ تھی۔

دونوں رک گئے۔

"کون ہو؟" حسام نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"عندلیب مراثن بیوہ خیام شاہ۔ بھوت نہیں ہوں۔ میں زندہ ہوں۔" اس وجود نے کالی چادر سر سے سرکائی تو حسام نے بھی پہچان لیا۔

☆☆☆

اس نے آج سالوں بعد زیادہ روٹیوں کا آٹا گوندھا تھا۔ ننھا سا پیڑا بیلتے ہوئے وہ بتانے لگی۔

"سب مجھے ناپسند کرتے تھے۔ مجھے قبول تھا۔ مگر اس رات کو کوئی میرے کمرے کے باہر آ گیا اور مدھم دستک دینے لگا۔ میں نے کون پوچھا۔ آگے سے جواب نہیں آیا۔

بس دستک جاری تھی۔ کوئی آدھی رات کو سارے گھر کے سو جانے کے بعد میرے کمرے میں آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ عورتوں کی حس اس بارے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ کسی کی نیت پہچان لیتی ہے۔ میں بھی دستک کے معنی سمجھ گئی تھی۔"

عندلیب نے توے سے پھلکا اتارا۔ حسام اور ناز کی باتیں وہ سن چکی تھی۔ اب اپنی سنا رہی تھی۔

"آپ نے دروازہ کھول کر منع کر دینا تھا۔" ناز نے کہا۔

"میں دروازہ کھول کر منع کر دیتی اور وہ جو بھی تھا اس روز منع ہو بھی جاتا۔ مگر رات کے اندھیرے میں اس کی صورت دیکھ لیتی تو دن کے اجالے میں کیسے شرافت سے اسے چلتا دیکھتی۔ وہ جو بھی تھا اسی گھر کا مرد تھا۔" عندلیب نے بتایا۔

حسام کا ذہن ہزار سوچیں سوچ رہا تھا۔

"اس لیے آپ وہاں سے نکل آئیں؟ مگر یہاں اس ویرانے میں۔ یوں سب سے چھپ کر تنہا۔" حسام کا دل پھٹ رہا تھا۔

"نکلی تو میں دریا میں کودنے کے لیے تھی، مگر مجھ سے اپنی جان لی نہیں گئی۔ ایسا لگا خدا کی امانت میں خیانت کر رہی ہوں۔ یہاں تنہا ہوں مگر آزاد ہوں۔ کوئی نہیں کہتا کہ جس زبان سے گاتی ہو اس زبان سے نماز کیوں پڑھتی ہو۔ آواز فروش کو جسم فروش سمجھنے کی بھی یہاں کوئی غلطی نہیں کرتا۔ میں خوش ہوں۔ دیکھو کیسے اپنی چھوٹی سی دنیا بسا رکھی ہے۔"

وہ اس وقت مکان کے اس تہ خانے میں تھے جس کے بارے میں، گھر میں رہنے والوں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کا ایک راستہ گھر کے اس کمرے کی زمین میں تھا۔

عندلیب نے گوندے سے زمین والے دروازے پر قالین چپکا رکھا تھا۔ دوسرا راستہ سیڑھیوں سے باہر جاتا تھا۔ جنگلے وہ راستہ گھر کے پچھلے حصے میں کھلتا تھا۔ اب وہاں جنگل اگ آیا تھا۔ باہر جتنی تباہی تھی اس تہ خانے میں اتنی ہی زندگی تھی۔ چمڑے کے کور میں کاپیاں تھیں۔ جن میں عندلیب باپ کو یاد کر کے اب بھی شجرہ لکھتی تھی۔ کتابیں تھیں۔ دیا بھی جلا ہوا تھا اور سب سے رنگین حصہ شیشوں اور دھاگوں کا ڈھیر تھا۔ جن سے وہ پراندے بنا کر بیچتی تھی۔

"آپ خیام چچا کی بیوہ ہیں۔ ان کی جائیداد اور وراثت سب میں آپ کا حصہ ہے۔ میں آپ کو دلواؤں گا۔ آپ شہر چلی جائیں۔" حسام شرمندہ ہو رہا تھا۔

"یہ گھر میں نے لے لیا ہے اپنی من مرضی سے رہتی ہوں۔ مجھ اکیلی کا خرچہ ہی کیا ہے۔ پھر بھی شوق کے لیے پراندے بنا لیتی ہوں۔ منہ لپیٹ کر جب دل کرتا ہے بازار ہو آتی ہوں۔ یہاں خیام کی یادیں ہیں۔ سکون ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ شہر میں بھی انسان بستے ہیں فرشتے نہیں۔ میں دوبارہ غیر محفوظ نہیں ہونا چاہتی۔" وہ صرف کہہ نہیں رہی تھی اس کی صورت سے اس کا سکون دکھتا تھا۔

"آپ نے ان حالات میں بارہ سال گزار دیے؟" ناز کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کیا بارہ سال ہو گئے؟ خدا نے میری سانسیں ضرور کسی اہم دن کے لیے بچا کر رکھی ہوں گی۔" وہ سادگی سے مسکرائی۔

pklibrary.com

"آپ تو اللہ والی ہو گئی ہیں۔" حسام کو ان کے سکون پر تعجب تھا۔

"زندگی جینے لگو تو احساس ہوتا ہے۔ بس چند چیزیں ہی درکار ہیں۔ باقی تو بکھیڑے پالے ہوئے ہیں۔ لیکن آج دکھ ہو رہا ہے کہ باہر کی دنیا نہیں بدلی۔" عندلیب نے کھانا دونوں کے سامنے رکھ دیا۔ خود وہ پہلے ہی کھا چکی تھی۔ اس ایک کمرے میں اس کی ضرورت کا سارا سامان تھا اور اس نے بہت احتیاط سے اس کمرے کی طرف آنے والے دونوں راستے چھپا رکھے تھے۔ کسی کو بھنک نہیں پڑی تھی کہ وہاں ایک تہ خانہ بھی تھا۔ بھنک پڑنے سے پہلے ہی وہ دوسروں کو ڈرا کر بھگا دیتی تھی۔

"ہم نکاح کر لیں گے یہ مسلمان ہو جائے گی۔ پھر حالات بدل جائیں گے۔" حسام نے وضاحت دی۔

"تم لوگ چاہو تو ادھر ہی رہ جاؤ۔" عندلیب نے کھلے دل سے اجازت دی۔

"نہیں میں صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤں گا۔ میں اپنے ایک دوست کو کہہ کر آیا تھا کہ شہر والی سڑک پر ملے۔"

"پھر آرام کر لو۔" اس نے ماں کی طرح کہا۔

خود وہ تھوڑی دیر اوپر گئی اور واپس آ کر نماز پڑھنے لگی۔ پھر قرآن کی تلاوت کی۔

ناز گدے پر لیٹی اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ کتنا سکون تھا وہاں۔ وہ عورت تھی کہ ایک معجزہ۔ ناز نے پازیب اتار کر سرہانے رکھی اور انہماک سے عندلیب کو دیکھتی رہی۔

☆☆☆

منہ اندھیرے، وہ شہر والی سڑک کے لیے نکلے۔ دور سے ہی حسام کو اپنے دوست کی گاڑی نظر آ گئی تھی۔ اسی دوست کا شہر میں گھر بھی تھا۔ حسام سوچ رہا تھا پہلے وہاں پہنچ جائیں پھر کسی وکیل سے رابطہ کرے گا۔ وہ دوڑ کر اس کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"بہت شکریہ یار، میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ اب چلو جلدی یہاں سے نکلو۔"

شکر تم آ گئے۔" حسام نے سکھ کا سانس لیا۔

دوست خاموش تھا۔

"بھول جانا پلیز۔" دوست نے کہا۔ حسام نے غور نہیں کیا۔

"کیا ہوا یار چلو۔" اس نے پھر سامنے والی سیٹ پر بیٹھے دوست سے کہا۔

"معاف کر دینا یار میں مجبور تھا۔" اس کے دوست نے سر جھکا لیا۔ حسام نے چونک کر دیکھا پولیس کی ڈھیر ساری گاڑیاں ان کے چاروں طرف آ گئی تھیں۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے سے کم وقت میں، اگلا سورج طلوع ہونے سے بھی پہلے وہ واپس آ گئی تھی۔ آگ کا دریا پار کر کے جھلس کر تباہ ہو کر۔ ناز کو واپس آ کر اندازہ ہوا تھا کہ یہ معاملہ کتنا بڑھ گیا تھا۔ دو کمیونٹیز دو مذہب آمنے سامنے آ گئے تھے۔ اسے اس کے ایک کزن نے دھمکی دی تھی کہ وہ واپس نہ آئی تو حسام کو مار دے گا اور وہ یہ کر سکتا تھا۔ ایک صورت یہ تھی کہ وہ عمر بھر بھاگتے رہتے دوسری صورت یہ تھی کہ وہ خود کو قربان کر دے۔

اسے پولیس اور اس کے گھر والوں نے یقین دلایا تھا کہ ابھی وہ واپس چلی گئی تو ایف۔آئی۔آر نہیں کٹے گی۔ سب پہلے جیسا ہو جائے گا۔ وہ واپس اس لیے بھی آئی تھی کیونکہ اسے حسام سے اتنی محبت تھی کہ وہ اپنی محبت کی جگہ اس کی زندگی چاہتی تھی۔ حسام تڑپتا رہا کیونکہ اب یہ لاابالی محبت نہیں رہی تھی۔ ناز کو گلے لگاتے ہی اس کی ماں کو دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

"سب تھو تھو کر رہے ہیں کہ چوم چاٹ کر واپس رکھ لیا۔" بلراج سچ کہہ رہا تھا۔

کمیونٹی کے نوجوان لڑکوں کا باقاعدہ گروپ بنا ہوا تھا کہ اس کو چھوڑیں گے نہیں۔ یہ تو ماں کی حالت

اتنی خراب تھی کے سب کو ہتھیار نیام میں ڈالنے پڑے تھے۔

"وہ خود واپس آ گئی ہے۔ اس نے اپنی غلطی مان لی ہے۔ کہاں کہاں درخواست نہیں دی اس کی بازیابی کی۔ اب سب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں کہ ہم کیسا سلوک کرتے ہیں۔"

بلدیو نے مصلحت سمجھاتے ہوئے کہا۔

مگر سچ تو یہ تھا کہ وہ ایک باپ تھا۔ جو اپنی اولاد سے بہت پیار کرتا تھا۔ کچھ باپوں کے دل بہت نرم ہوتے ہیں۔ اولاد کو معاف کر دیتے ہیں۔ بدنامی کے باوجود اسے گلے لگاتے ہیں۔ آخری حد تک جا کر اپنی اولاد کو گھر واپس لاتے ہیں اور تحفظ دیتے ہیں۔

بلدیو بھی وہی باپ تھا۔ ناز دن رات بیمار ماں کی خدمت میں لگی تھی۔ ان کا کینیڈا جانے کا عمل بھی اسی لیے سست پڑ گیا تھا۔ باپ کا سر جھکا تھا اور اس کا اپنا دل کٹا ہوا تھا۔

اسے گھر سے نکلنے پر شرمندگی تھی نہ واپس آنے پر فخر۔ وہ ایسا پودا تھی جس نے جڑ چھوڑ دی تھی۔ اب اسے اپنی ہی مٹی پرائی لگ رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ وہ کمرے میں بستر پر لیٹی جانتی تھی کہ زندگی کبھی پہلے جیسی نہیں ہوگی۔ وہ نرم گدے پر لیٹ کر انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ وہ انگارے جو اس کے اپنے وجود سے پھوٹ رہے تھے۔ وہ تڑپ کر بیڈ سے اتری اور فرش پر جا بیٹھی۔ جسم تکلیف میں ہو تو دل کا درد کم محسوس ہوتا ہے۔ پھر اس نے تڑپتے ہوئے دعا مانگنا چاہی۔ تو اس کے اندر باہر سناٹا چھا گیا۔ گہرا سناٹا۔ وہ کس سے دعا مانگتی؟ مذہب بدلنے کے گواہ نہیں تھے۔ مگر مذہب تو وہ تب ہی چھوڑ گئی تھی جب گھر سے نکلی تھی۔ تب اس اندھیرے کمرے میں کوئی روشنی نہیں تھی۔ بس ہلکی سی چاندنی تھی جو پردوں کے کونے سے اندر آ رہی تھی۔ ناز اٹھی اس نے تکیے کے نیچے سے وہ کڑا نکالا جو حسام نے اسے دیا تھا۔

باریک سے کڑے میں سنہری عبارت چاندنی میں چمکی۔ ناز اٹک اٹک کر وہ الفاظ پڑھنے لگی۔ پھر جب بھی حسام یاد آتا۔ خوف محسوس ہوتا تو وہ چھپ کر وہ عبارت پڑھتی۔ اور سچ پوچھو تو ایسا کوئی لمحہ نہیں ہوتا تھا جب اسے حسام یاد نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

گھر والوں نے زبردستی حسام کو دوسرے شہر بھیج دیا تھا۔ پولیس بھی اس پر نظر رکھے ہوئے تھی کہ وہ واپس نہ آئے۔ اس نے جلد بازی نہ کی ہوتی تو صورت حال اور ہوتی۔ اب خود ہی اپنے اور ناز کے بیچ سیسہ پلائی کی دیواریں کھڑی کر لی تھیں۔ سب اسے بتاتے تھے کہ مذہب تبدیل ہو گیا ہوتا یا نکاح کر لیا ہوتا تو وہ دونوں مارے جاتے۔ اب زندگی اسی میں ہے کہ دور ہو جاؤ۔ حسام کے پاس گھر والوں کی سپورٹ نہیں تھی۔ وہ اپنے بل بوتے پر رقم اکٹھی کرنے لگا تا کہ وکیل کر کے کوئی حل نکالے۔

ساتھ مرنا آسان تھا۔ مگر اسے تو ساتھ جینے کی خواہش تھی۔

☆☆☆

وہ چمچے سے تھوڑی تھوڑی یخنی ماں کو پلا رہی تھی۔ وہ اپنی بیمار ماں کے کمرے میں اس کے ساتھ سوتی تھی اور اس کا باپ کمرے کے باہر ساری رات جاگتا تھا کہیں بیٹی پھر سے کوئی قدم نہ اٹھا لے یا باہر والے جو اس کے خون کے پیاسے ہیں گھر کے اندر نہ آ جائیں۔ وہ دونوں کے درمیان ڈھال بنا بیٹھا تھا۔ ناز کو کہیں چین نہیں تھا اپنا ہی گھر اپنے ہی رشتے کاٹنے لگے تھے۔ وہ جیسے وہ لڑکی رہی ہی نہیں تھی۔ جو یہاں کبھی ہنستی مسکراتی تھی۔ وہ ہر ناز کور سے صرف ناز ہو گئی تھی۔ وہ باپ کا جھکا سر دیکھ کر شرمندہ ہوتی اور حسام کو یاد کر کے جل بن مچھلی کی طرح تڑپتی تھی۔

اس رات اپنی ماں کو دوائی دے کر سلانے کے بعد وہ فرش پر آڑی ترچھی لیٹی رو رہی تھی۔ نظروں میں گر کر جیا نہیں جاتا اور وہ سب کی نظروں میں گر

چکی تھی۔ حسام کی بھی۔ وہ تو اس سے نفرت کرتا ہوگا۔ اس کے دھوکے کو یاد کر کے کوستا ہوگا۔

اس نے تڑپ کر ماتھا زمین سے ٹکایا اور پیر سمیٹ لیے۔ مٹی کے انسان کو مٹی کا تعلق بہت سکون آور لگتا ہے۔ وہ بھی خود میں لپٹی اس حالت میں پرسکون محسوس کر رہی تھی۔

پھر کافی دیر بعد اسے احساس ہوا۔ وہ حالت سجدہ میں تھی۔ وہ سب دعائیں کس سے مانگ رہی تھی؟ اس وقت وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔

اسی وقت سجدے میں گرے ہوئے اسے احساس ہوا تھا اسے اپنے کڑے پر لکھی آیت الکرسی کی عبارت زبانی یاد ہوگئی ہے۔ اس وقت اس نے وہ عبارت بنا دیکھے پڑھی۔

اس رات بہت عرصے کے بعد وہ سو سکی تھی۔

☆☆☆

"یہ تو ہمارے منہ پر طمانچہ ہے جو دونوں نے مارا ہے۔ دونوں بے غیرت خاندان اپنی اولاد کو بچا رہے ہیں۔ مذاق کس کا بنا ہے؟ ہمارے علاقے کا اور ہمارا۔ جہاں سالوں سے ہم دونوں مذہب امن سے رہ رہے تھے۔" جنگل کی طرف ویران راستے پر ان سات لڑکوں کی خفیہ میٹنگ ہو رہی تھی۔

پہلے حسام اور ناز کے اقدام پر دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ مگر جب دونوں اپنے گھر واپس آگئے تو ان کا سارا غصہ ان دونوں کی سمت ہو گیا تھا۔

دونوں اب اپنی برادری کے لیے کلنک تھے۔

"لڑکی واپس آگئی تو تم نے قبول کیوں کر لیا؟" مسلمان لڑکے نے طعنہ مارا۔ وہ بھی حسام کا جگری دوست ہوا کرتا تھا۔

"اور تم لوگوں نے بھی لڑکے کو بھاگنے کیوں دیا؟ دوسرے کی لڑکی کو ورغلا کر شہر بھاگ نکلا۔ بزدل۔" سکھ لڑکے نے بھی جواب مانگا۔ جو رشتے میں ناز کا کزن تھا۔

"سچ یہ ہے کہ دونوں نے ہم سب کی ناک کٹائی ہے۔ باقی دنیا تو ہمارے گاؤں پر ہی باتیں بنا رہی ہے کہ لڑکا لڑکی قابو میں نہیں تھے۔" ایک اور نے کہا۔

"آج یہاں کی ایک لڑکی وہاں گئی ہے۔ کل وہاں کی ایک لڑکی یہاں آئے گی۔ ہماری تو زندگی درہم برہم ہو جائے گی۔ دونوں کو ایسا سبق سکھاؤ کہ کوئی دوسرا یہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔" ایک عقل مند نے کہا۔

یہ پرجوش لڑکے انتہائی اقدام سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

سب باہر سے ویسا ہی تھا مگر اندر تیزی سے بدل رہا تھا۔ جو بھی کچھ اس نے اسلام کے بارے میں سن رکھا تھا وہ اب خود بخود یاد آ رہا تھا۔ بہت سے احکام سارے واقعات اس کے ذہن میں آتے تو اسے لگتا سب اس کے لیے ہی نازل ہوئے ہیں۔

سب سیدھا دل پر اثر کر رہا تھا۔ اندھیری راتوں میں وہ اللہ کو پکارتی تھی تو اب وہ جانتی تھی کہ وہ خدا کون ہے۔ اسے سمجھ آگئی تھی کہ عندلیب کو اس بے سروسامانی کی حالت میں بارہ سال سے کیا چیز پرسکون رکھے ہوئے ہے۔ وہ انسان کی نہیں اللہ کی محبت تھی۔

وہ بھی اس محبت میں سر تا پا تک مبتلا ہو رہی تھی۔ اب وہ چھپ کر حسام کو رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ لیکن وہ چھپ کر مذہب کا مطالعہ کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

اب تو کوئی شک نہیں تھا کہ وہ نماز پڑھ رہی ہے۔ بلدیو کو لڑکے کی محبت سمجھ آگئی تھی۔ مگر مذہب کی محبت حیران کر گئی۔ ناز پوری طرح واقف تھی کہ باپ پیچھے کھڑا دیکھ رہا ہے مگر وہ رکی نہیں اور نماز پڑھتی رہی۔ پھر اس نے سلام پھیرا اور باپ کی طرف دیکھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے سر جھکا لیا اور نیچے بچھا صاف کپڑا سمیٹنے لگی۔

"ہرناز؟" باپ نے اسے پکارا۔

وہ باپ کے سامنے آگئی۔

"میں آپ کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔" اس نے ادب سے نگاہ جھکالی۔

"یہ سب صرف ایک لڑکے کے لیے؟" باپ کو غصہ آنے لگا۔

"نہیں یہ سب میرے اپنے لیے ہے۔ میں نے اپنا راستہ چن لیا ہے۔" وہ باپ کے سامنے اقرار کررہی تھی۔ نظریں بدستور جھکی تھیں۔

"مذہب سے پھرنے والے کو جان سے مارنے کا حکم ہے۔" بلدیو نے ڈرایا ناز کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اسے بھی اپنے باپ سے محبت تھی۔

"جسم تو امانت ہی تھا۔" اس نے یوں ٹھہرے انداز سے کہا کہ بلدیو کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بلدیو نے اپنے خنجر پر ہاتھ رکھا۔

"سوچ لو کیا یہ آخری فیصلہ ہے؟" اس نے گرج کر بیٹی کو آخری موقع دیا۔

"یہی میرا فیصلہ ہے۔" وہ ویسے ہی مضبوطی سے کھڑی رہی۔

بلدیو کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا گلا دبادے یا اپنی جان لے لے۔ ایک جوشیلا انصاف پسند آدمی اس کے اندر جوش مار رہا تھا۔ مگر وہ ایک محبت کرنے والا باپ بھی تھا۔

"یہی فیصلہ ہے تو پھر چلی جا۔ تم ہم میں سے نہیں رہیں۔ اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔"

نہیں میں اپنا ارادہ نہ بدل دوں۔ تو میری وہ بیٹی نہیں ہے۔ چلی جا۔" بلدیو نے منہ موڑ لیا اور اسے جانے کا موقع دیا۔

"لیکن ٹونی اور بھائی؟" ناز نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

"ان کے آنے سے پہلے چلی جاؤ۔ وہ برداشت نہیں کرپائیں گے۔" بلدیو نے بڑائی کا مظاہرہ کیا۔

اس وقت باپ کا دلاسہ دینا ہاتھ، سر پر محسوس کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کرسکتی تھی مگر جانتی تھی اب یہ ہاتھ اس کے سر پر دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔ وہ دوڑتی ہوئی اوپر اپنے کمرے میں گئی۔ جلدی سے دو چار ضروری چیزیں باندھیں۔ پھر بہن کو الوداع کہہ کر نیچے آئی۔ اس بار گھر سے نکلنا مختلف تھا اس بار وہ کسی انسان کے لیے گھر نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اس کو معلوم تھا وہ کیا چاہتی ہے۔

"دار جی مجھے معاف کردینا۔" نیچے آکر اس نے باپ سے کہا جو منہ موڑے کھڑا تھا۔

باپ نے مڑ کر نہیں دیکھا تو وہ دوڑ کر ماں کے پاس گئی۔ وہ بستر پر نڈھال لیٹی تھیں۔

اس دل کے دورے کے بعد سے وہ دوبارہ اپنی اصلی حالت میں نہیں آسکی تھیں۔ ناز نے جاکر ماں کو نیند سے ہی جگانا چاہا تھا کہ آخری بار مل لے۔ ماں نہیں جاگی۔

"امی..... امی جی! اٹھو۔" اس نے باقاعدہ ماں کو جھنجھوڑ دیا۔ وہ پھر بھی نہیں اٹھی۔

"بابا جی امی!" اس نے باپ کو کہا تو بلدیو نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ وہ نیند میں سوتے سوتے ہی فانی دنیا سے کوچ کرچکی تھیں۔

☆☆☆

"وقت آگیا ہے۔" ایک موبائل سے باقی چھ نمبرز پر یہ خفیہ پیغام گیا۔ سب نے پڑھ لیا تو پیغام سب کے لیے مٹادیا گیا۔

اس شام حسام نے ماں کی قسموں کی پرواہ کیے بغیر اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے کی حامی بھر لی۔ اس پر گاؤں میں داخلے کی پابندی تھی۔ وہ تھانے میں جاکر اپنے دوسرے شہر میں ہونے کی روزانہ تصدیق کروا رہا تھا۔ ورنہ اغوا کا مقدمہ بننے کو تیار تھا۔ مگر اپنا گھر اپنے لوگ سب اس کو بہت یاد آتے تھے۔ اس لیے جب دوست نے رابطہ کیا تو وہ رہ نہ سکا اور چھپ کر اس سے ملنے آگیا۔

"ہاں یار میں آگیا ہوں۔" اس نے مطلوبہ جگہ پہنچ کر دوست کو فون ملایا۔

اتنے میں ایک زوردار گاڑی دوڑتی ہوئی آئی

اور حسام کو ٹکر مار کر اسے آسمان میں کئی فٹ اوپر اڑا کر دور پھینک دیا۔

☆☆☆

پچھلے دو روز سے گھر بھرا ہوا تھا۔ امی کی آخری رسومات میں بہت بندہ آیا تھا، جن میں سے بہت سوں کو وہ پہچانتی بھی نہیں تھی۔ اب سارے دعا کرنے گردوارے گئے تھے۔

وہ نہیں گئی تھی۔ اس نے منہ سے نہیں کہا تھا مگر سمجھنے والے جان گئے تھے کہ وہ اب وہاں کبھی نہیں جائے گی۔ وہ خاموشی سے اوپر اپنے کمرے میں آ گئی۔ نیچے گھر میں ایک بزرگ خاتون تھیں اور باہر ایک دو کزنز تھے۔ ناز اوپر کمرے میں آئی تو اسے احساس ہوا کمرے میں کچھ بہت مختلف تھا۔ کمرے میں بو بھی جیسے کیس کھلی رہ گئی ہو۔ وہ رک کر غور کرنے لگی۔ پھر اسے بستر پر تکیے کے پاس پڑی اپنی پازیبیں نظر آئیں۔ اس نے بڑھ کر پازیبیں اٹھائیں۔ ٹھک کر کے پیچھے کمرے کا دروازہ بند ہوا۔ وہ پلٹی اور دروازہ دیکھا۔ کسی نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ تھوڑی دیر میں کمرہ دہکنے لگا۔ پہلے دیا سلائی جیسا۔ پھر جون کی تپتی دوپہر جیسا۔ پھر الاؤ جیسا۔ پھر جنگل کی آگ جیسا۔

ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔

☆☆☆

'خسرو دریا پریم کا الٹی وا کی دھار،
جو اترا سو ڈوب گیا جو ڈوبا سو پار۔'

عندلیب خیام

ناز اور حسام۔

ڈوبے تو سب ہیں پار کوئی کوئی لگتا ہے۔ خیام کی عندلیب بھٹک رہی تھی اور ناز حسام کو زندگی نے جینے کی سزا سنا دی تھی۔

☆☆☆

"تم ٹھیک ہو گئے ہو یہ کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ چلو گھر چلیں۔" تین سرجریز، ہفتوں کے پلستر اور بے حساب مصائب کے بعد وہ ٹھیک ہو گیا تھا۔

اس کے لمبے بال کٹ کر بوائے کٹ رہ گئے تھے۔ چہرے پر چھوٹی سو بر داڑھی تھی اور آنکھوں میں بے تحاشہ حیرت۔

"گھر؟ گاؤں؟ کیا مجھے وہاں جانے کی اجازت مل گئی ہے؟" اس نے بھائی سے تصدیق چاہی۔

"ہاں چلو امی یاد کر رہی ہیں۔" بھائی نے بے تاثر چہرے سے کہا۔

حسام وہیں ٹھٹک گیا تھا۔ یہ خبر تو جشن کے مترادف تھی۔ پھر بھی بھائی اتنا خاموش کیوں تھے۔

"کیا ابا کو کچھ گروی رکھ کر گارنٹی دینی پڑی ہے؟ یہ ممکن کیسے ہوا؟" حسام نے پوچھا۔ اسے زندگی قریب محسوس ہو رہی تھی۔

"ویسے ہی۔" وہ ٹالتے ہوئے گاڑی کو شہر کی حدود کے باہر لے گئے۔

"وہاں لے جا کر مجھے حویلی میں بند تو نہیں کر دیں گے؟ کہ کسی کو معلوم ہی نہ ہو کہ میں وہاں ہوں۔" راستے میں پٹرول ڈلوانے رکے تو حسام نے پھر پوچھا۔

"نہیں مگر تم بھی احتیاط کرنا۔ اپنے علاقے میں ہی رہنا۔" بھائی نے سمجھایا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو حسام سے پھر رہا نہیں گیا۔

"گاؤں تو ویسا ہی ہے پھر بدلہ کیا ہے؟ ناز کی شادی ہو گئی یا وہ کینیڈا چلی گئی؟"

آپ ویسے تو مجھے لانے سے رہے۔ بتا دیں ورنہ پہلی فرصت میں اس کے گھر چلا جاؤں گا۔" اب اس نے صاف بتا دیا کہ وہ بہلنے والا نہیں ہے۔ اسے صحیح جواب چاہیے۔

"ناز کی امی فوت ہو گئی تھیں۔" بھائی نے تمہید باندھی۔ حسام دیکھتا رہا۔

"دو دن بعد گھر میں آگ لگ گئی۔ نچلے کمرے میں ایک بزرگ خاتون تھیں۔ انہیں بچا لیا گیا۔ ناز اوپر بھی وہاں کوئی نہیں پہنچ سکا۔ اوپر کا پورا پورشن جل

گیا۔ "بھائی نے سر جھکایا اور رو دیے۔

"نہیں بھائی! آپ کو غلط اطلاع ملی ہے۔ اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسے کچھ ہوا ہوتا تو میں بھی نہیں بچتا۔" حسام نے بھائی کو اتنی زور سے پکڑا کہ بھائی کو گاڑی روکنی پڑی۔

"میں نے خود دیکھا ہے جب باڈی نکالی گئی۔ یہی حقیقت ہے۔ مجھے معاف کر دو میں نے پہلے تمہارا ساتھ نہیں دیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا یہ سب ہو جائے گا۔" بھائی نے حسام کو گلے لگانا چاہا۔ حسام نے دروازہ کھولا اور دیوانہ وار بھاگنے لگا۔ بھائی نے پہلے اسے پکارا پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ دکھی تھے کاش انہوں نے پہلے ساتھ دیا ہوتا اور وہ حسام اور ناز کو دنیا سے چھپا کر خود محفوظ مقام پر پہنچا کر آتے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

وہ اسے بتا ہی نہیں سکا کہ وہ اسے کرنافی چڑیل اس کی لمبی ناک کی وجہ سے نہیں کہتا تھا۔ وہ اسے کرنافی چڑیل اس لیے کہتا تھا کیونکہ اس کی ناک پر نخرا ہوتا تھا۔

اسے اب سمجھ آئی تھی وہ نخرہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ناز کو معلوم ہوتا کہ وہ کتنی حسین اور قیمتی ہے تو پاؤں زمین پر نہیں اتارتی۔

"میں بھی اب یہاں نہیں رہوں گا۔ کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ یہ زمین نہ تمہاری سگی ہے نہ میری۔ یہ تو محبت کرنے والوں کی قاتل ہے۔ پہلے بھی تھی۔" وہ با آواز بلند بول رہا تھا۔ اپنے ہی الفاظ پر چونکا۔ عندلیب چچی ان کو تو وہ بالکل بھول چکا تھا۔ وہ اٹھ کر پھر بھاگنے لگا۔ وہ بہت دیر بھاگا تھا مگر اب اسے تکلیف محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔

وہ سنسان راستے سے ہو کر اونچی دیوار والے مکان کی طرف جانے لگا۔ اب وہاں جانے سے اسے ذرا خوف نہیں تھا۔ پھر بھی وہ نہیں چاہتا تھا کوئی اور اسے جاتا دیکھے۔

"عندلیب چچی! میں حسام۔ چچی باہر آ جائیں کوئی نہیں ہے۔" حسام نے پہنچ کر آوازیں لگائیں۔ وہ مکان پچھلی بار کی نسبت گندا تھا۔ چاروں طرف سے آرہی تھی اور گہرا سناٹا تھا۔

"چچی! میں ہوں حسام۔" وہ اس کمرے کو ڈھونڈ رہا تھا جہاں تہہ خانے کا راستہ تھا۔ آج سارے کمرے ایک جیسے لگ رہے تھے۔

"انہوں نے تو میری ناز کو مار دیا اور مجھے جینے کے لیے چھوڑ دیا۔ چچی میں بالکل تنہا ہوں۔ جس کا نام آپ کی سانسوں پر لکھا ہو اس کے بغیر سانس کیسے لیتے ہیں؟ آپ کیسے زندہ ہیں۔ مجھ سے سانس نہیں لی جا رہی۔"

اس میں کمرہ ڈھونڈنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ وہیں دوزانو ہوا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ اتنی دیر رویا کہ تہہ خانے میں موجود عورت سے بھی برداشت نہیں ہوا۔ وہ دروازہ کھول کر آہستہ سے لچکتی گھسٹتی کمرے سے باہر آئی۔ اس کی کالی چادر نے اس کا پورا وجود چھپا رکھا تھا۔

"چچی، میں آپ کی طرح مضبوط نہیں۔ میں مر جانا چاہتا ہوں۔" وہ ویسے ہی رو رہا تھا۔

"اس نے اپنی جان داؤ پر لگا کر تمہاری زندگی بچائی اور تم ناقدرے مر جانا چاہتے ہو۔

وہ واپس اس لیے گئی تھی تاکہ تمہیں بچا سکے۔" سناٹا اس کی آواز کی کھنک سے ٹوٹا۔

حسام چپ ہو گیا۔ اس نے چہرہ اوپر کر کے اس وجود کو دیکھا۔ اس نے چادر سرکائی۔

"میں بھوت نہیں ہوں۔" اس نے یقین دلایا۔

☆☆☆

پرسہ دینے والوں کے رش میں عندلیب بھی چادر لپیٹ کر اندر چلی گئی تھی۔ وہاں آس پڑوس کی کئی مسلمان خواتین بھی تھیں۔ عندلیب جنگل میں ان لڑکوں کی باتیں سن چکی تھی۔ حسام کو بچانا اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ مگر وہ ناز کو چوکنا ضرور کر سکتی تھی۔ عندلیب نظر بچا کر اوپر چلی گئی۔ لڑکیوں کا رنگین کمرہ

پہچانا کون سا مشکل ہوتا ہے۔ وہ وہاں باتھ روم میں چھپ گئی۔ اس کو لگا کوئی جاننے والا آیا ہوگا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی کیس آن کر کے گیا ہے۔ ناز اپنی پازیبیں اس کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ اس نے وہ بستر پر رکھ دیں۔ تاکہ ناز جان جائے کہ وہ آس پاس ہے۔ مگر انہیں مہلت نہیں ملی۔ ناز کے کمرے میں آتے ہی آگ بھڑک گئی۔ ناز دروازہ پیٹتی رہی مگر کوئی نہیں آیا۔ کھڑکی بہت اونچی تھی۔

"یہی واحد راستہ ہے تم چھلانگ لگا کر بھاگ جاؤ۔ اسکول کے سامنے میں نے رکشے والے کو روک رکھا ہے۔ وہ تمہیں کہیں پہنچا دے گا۔" عندلیب نے زور دیا۔ ناز نے جانے کی تیاری ماں کے مرنے سے پہلے کی تھی۔ فوراً بیگ اٹھایا۔ مگر کھڑکی پر جنگلا تھا۔ کمرے میں آگ بھی تھی اور دھواں بھی۔ دونوں نے کسی طرح مل کر جنگلا توڑا۔ ناز کودی تو اس کی ٹانگ ہل گئی۔ عندلیب نے اس کا بیگ پھینکا۔ اس نے سر باہر نکالا تو اس کا پراندہ جنگلے میں پھنس گیا۔ ناز نیچے کھڑی منتظر تھی کہ عندلیب پیچھے آئے گی۔ مگر وہ نہیں آسکی۔ الٹا کچھ لڑکے اس طرف آگئے اور پہرا دینے لگے۔ ناز کھسک کر پیچھے ہوگئی۔ وہ دور ہوتی گئی۔ اس وقت جان بچانے کی جلدی میں ناز کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل گئی۔ عندلیب کے جسم کو ناز کا جسم سمجھ کر الوداع کہہ دیا گیا۔ ناز جاتی تو کہاں جاتی۔ اس لیے اسی مکان میں آگئی جہاں اور کوئی نہیں آتا تھا۔ چار دن بعد اسے احساس ہوا کہ اس کی ٹانگ میں بہت درد ہے۔ وہ عندلیب کی طرح تاک نہیں تھی کہ خاموشی سے ہسپتال ہو آئے۔ وہ ڈری سہمی معصوم لڑکی تھی جس نے اپنے خیر خواہ کو آگ کا لقمہ بنتے دیکھا تھا۔ وہ وہیں رہی اور ٹانگ کا درد ٹھیک ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا۔ اس کو تو حساب ہی نہیں۔ اس کی ٹانگ ٹھیک ہو ہی گئی۔ مگر چال واپس نہیں آئی۔ وہ ایک ٹانگ سے اب ٹیڑھا چلتی تھی۔

☆☆☆

"تم چاہو تو اپنی زندگی دوبارہ شروع کرلو۔ میں نے اپنا خدا پالیا ہے۔ الحمدللہ۔" اس نے کہا۔

حسام تو اسے دیکھے جا رہا تھا۔ پچھلی زندگی کی ہر تکلیف بھول گئی تھی۔ موت کے منہ سے نکلنے کا وہ عمل سہانا لگنے لگا تھا کیونکہ اس کے اختتام پر ناز کھڑی تھی۔

"جس اللہ کے لیے یہاں تک آئی ہو اس نے ہمارا ساتھ ہمیں انعام دیا ہے۔" حسام پلک جھپکنا بھول گیا تھا۔

"میں اب صحیح سے چل بھی نہیں سکتی۔ تم چلے جاؤ گے تو میں کوئی گلا نہیں کروں گی۔ وعدہ۔" ناز نے شرمندگی سے سر جھکایا۔

حسام کے بس میں ہوتا تو ابھی اسے اپنے سینے میں چھپا لیتا۔ مگر اب اس نورانی چہرے والی کے ساتھ اس کے مذہب کی پابندیاں بھی تھیں۔

"او پھلیلے لوکی، میں نے محبت تمہاری چال سے تھوڑی کی تھی۔" حسام نے شرارت سے اس کی ناک کو چھوا۔

ناز خوشی سے رو دی۔ ہوا میں خسرو کی شاعری سنائی دینے لگی۔

من تو شدم، تو من شدی،
من تن شدم، تو جاں شدی،
تا کس نہ گوید، بعد ازیں،
من دیگرم، تو دیگری،

میں تو بن گیا ہوں اور تو میں بن گیا ہوں۔ میں تن ہوں تو جاں ہے۔

پس اس کے بعد کوئی نہیں کہہ سکتا میں اور ہوں اور تو اور ہے۔

☆☆

قرۃ العین خرم ہاشمی

دکھی رانی

"اماں! ثانیہ کی عیدی لے کر کس دن جانا ہے؟"

فاطمہ نے بڑی بھابھی ہونے کے ناتے فکرمندی سے سوال کیا۔ ابا اور اماں افطاری کے بعد

pklibrary.com

چائے پی رہے تھے۔ اس کی بات سن کر چونک گئے۔

"عید میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ عیدی تو ساری مکمل ہے ناں؟" انھوں نے فکرمندی سے سوال کیا۔

"آپ بے فکر رہیں۔ سعدیہ اور میں ہر چیز بہت اچھی اور ثانیہ کی پسند کے مطابق ہی خرید کر لائے ہیں۔"

اس نے مسکرا کر کہا تو لاؤنج میں داخل ہوتی منجھلی بہو نے بھی سر ہلایا۔

اماں نے تشکر آمیز نگاہوں سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"مجھے اندازہ ہے۔ سحری اور افطاری کا کام ہی بہت ہوتا ہے۔ پھر چھوٹے بچوں کے ساتھ ساتھ ہم بوڑھے بیمار لوگوں کی بھی ذمہ داری تم دونوں نبھا رہی ہو۔ اب تو خیر سے چھوٹی بہو نے بھی کام شروع کر دیا ہے۔ ماشاء اللہ میری تینوں بہوئیں بہت اچھی اور سلیقہ مند ہیں۔"

آمنہ اندر داخل ہوئی تو اماں نے مسکرا کر کہا۔

آمنہ کی شادی کو دو مہینے ہوئے تھے۔ پڑھی لکھی مگر نخریلے مزاج کی آمنہ کی نگاہ ہر چیز پر ہوتی تھی۔

جبکہ بڑی دونوں بہوئیں دھیمے مزاج کی مالک تھیں۔ ان میں تحمل اور سمجھ داری زیادہ تھی۔

"مگر یہ بھی تو بتائیں کہ آپ کی لاڈلی بیٹی کتنی

ست اور کام چور ہوتی تھی۔ پتا نہیں سسرال میں کیسے گزارا کرتی ہے۔"

آمنہ کا شوہر ارسلان پر مزاح لہجے میں کہتا ہوا پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ابا تڑپ اٹھے۔

"خبردار! میری دکھی رانی کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا کہا۔ میری بیٹی تو شہزادی ہے۔ سسرال میں بھی عیش ہی کر رہی ہے۔ اللہ ہر بچی کے نصیب اچھے کرے۔"

ابا نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔ اماں نے دل میں آمین کہا جبکہ سعدیہ اور فاطمہ مسکرانے لگیں کہ وہ ابا کی اکلوتی بیٹی سے جنونی محبت سے بخوبی واقف تھیں مگر آمنہ نے بغور ان کی بات کو سنا۔

"خیر ابا جی! ہر بیٹی اپنے والدین کے گھر شہزادی ہی ہوتی ہے مگر اصل بات تو تب ہے جب سسرال میں اپنے سلیقے سے دھاک بٹھا دے۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ ثانیہ نے بمشکل بی۔ اے تک تعلیم حاصل کی۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ گھر کے کاموں سے بھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ لگتا ہے والدین کے لاڈ پیار نے کافی بگاڑ دیا تھا کیوں ارسلان؟"

آمنہ نے شوہر کی طرف دیکھا۔ ارسلان نے گڑبڑا کر والدین کی گھورتی نگاہوں کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ماضی کی جو عام سی باتیں اس نے مذاق میں بتائی تھیں، انھیں آمنہ نے ثانیہ کی کمزوری سمجھ لیا تھا۔ اسی بات کو جتاتے ہوئے وہ ثانیہ کے بارے میں اس لہجے میں بات کر رہی تھی جو اماں اور ابا دونوں کو برا لگا۔ اس لیے ابا نماز پڑھنے کا بہانا کر کے وہاں سے اٹھ گئے۔

"آمنہ بیٹی! ثانیہ لاابالی ضرور تھی مگر یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ شادی کے بعد سب لڑکیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"

اماں نے اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے کہا۔

آمنہ طنزیہ مسکرائی۔

"میرے خیال سے اس ویک اینڈ پر ثانیہ کو افطار ڈنر پر بلا لیتے ہیں۔ پہلے بھی کئی بار کہا مگر اس کے سسرال میں آئے روز افطار پارٹیز ہونے کی وجہ سے وہ بہت بزی تھی۔"

فاطمہ بھابھی نے بات بدلی تو اماں نے سر ہلایا۔ وہ سب افطار ڈنر کی باتیں کرنے لگے جبکہ آمنہ سوچ رہی تھی کہ یہ بہت اچھا موقع ہوگا۔ اپنا آپ ثابت کرنے کا۔ وہ تیزی سے سوچنے لگی کہ اس افطار ڈنر میں وہ کون سی ڈشز بنا کر سب کو حیران کر سکتی تھی۔

☆☆☆

ثانیہ نے تہجد کی نماز پڑھ کر سلام پھیرا اور جائے نماز پر بیٹھ کر اللہ سے راز و نیاز کرنے لگی۔ سارے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ وہ سحری بنانے سے پہلے تہجد ضرور پڑھتی تھی۔ ابھی بھی جائے نماز پر بیٹھے اس کا ذہن ماضی میں بھٹکنے لگا، جب اماں کئی بار اسے جگانے آئی تھیں مگر اس کی آنکھ ہی نہیں کھلتی تھی۔ ماضی کو یاد کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مگر آنکھوں میں نمی تھی۔

"ثانیہ! کب سے آواز دے رہی ہوں۔ سحری کا وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ جلدی آؤ۔"

اماں کی گرج دار آواز سن کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلی۔ ابا اسے دیکھ کر مسکرائے اور اشارے سے اپنے پاس بیٹھنے کو کہا۔ وہ تیزی سے باپ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ انھوں نے پراٹھا اور میٹھا دہی سامنے کیا تو وہ مزے سے کھانے لگی۔ کچن میں کام کرتی اماں کی تیز نگاہیں باپ بیٹی کی محبت کے مظاہرے دیکھ رہی تھیں۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر آئیں اور سب سے آخر میں جلدی سے سحری کرنے لگیں۔ تینوں بیٹے سحری کر چکے تھے۔

"کبھی ماں کی مدد بھی کروا دیا کرو۔ اکیلی کیا کیا کروں؟" اماں نے منہ بنا کر کہا۔

"میری آنکھ ہی نہیں کھلتی۔ بہت کوشش کرتی ہوں۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔ ابا مسکرائے۔

"میری دھی رانی کو کچھ مت کہا کرو۔ ساری زندگی کام ہی کرنا ہے۔" وہ فکرمندی سے کہنے لگے جیسے وہ کل ہی رخصت ہو کر جا رہی ہے۔

"کام تو تب ہی کرے گی جب کچھ آتا ہوگا۔ وہاں جا کر بھی ماں باپ کو باتیں ہی سنوائے گی۔" اماں کلس کر گویا ہوئیں۔ وہ والدین کی بحث سے بے نیاز سحری کر رہی تھی۔

"اماں! غصہ بعد میں کر لیجیے گا۔ سحری کا وقت ختم ہونے والا ہے۔" دانش نے جلدی سے ماں کے سامنے چائے کا کپ رکھا تاکہ وہ پی سکیں۔ اماں بیٹے کی فکرمندی پر خوشی سے کھل اٹھیں۔

"بیٹی سے زیادہ بیٹوں کو میری فکر ہے۔"

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے انھوں نے جتایا مگر سامنے بھی وہ تھی جس پر ایسی جذباتی باتیں زیادہ اثر نہیں کرتی تھیں۔ دراصل اکلوتی اور ابا کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے وہ نازک مزاج بن گئی تھی۔ کچھ تینوں بھائی بھی اس کے لاڈ اٹھاتے۔ اس کے حصے کا کام بھی کر دیتے۔ اس لیے وہ بے فکر رہتی۔ ہر سال سحری، افطاری پر ایسا ہی ہوتا تھا۔ اماں سارے کام خود کرتے ہوئے اسے ڈانٹتی رہتی تھیں۔ کبھی اماں کے ساتھ کام کروا بھی تو بہت مشکل سے اور آہستہ آہستہ کہ اماں تنگ آکر خود ہی وہ کام کر لیتیں۔

الارم کی آواز پر وہ چونک کر ماضی سے حال میں پہنچی۔ جلدی سے اٹھ کر الارم بند کیا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں ذمہ داری کا پہاڑ اس کا منتظر تھا مگر وہ خوش اور مطمئن تھی کہ اس مہینے کی بابرکت ساعتوں میں اسے ہر قدم پر چھوٹی چھوٹی کئی نیکیاں کرنے کا موقع ملا ہے۔ بھرے پُرے سسرال کے لیے اکیلے سحری بناتے ہوئے وہ گھبراتی نہیں تھی۔ اس لیے ابھی بھی تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کام کرنے لگی۔

"کاش اپنے والدین کو بھی یہ سکھ دیا ہوتا۔"

ساس سسر کو سب سے پہلے چائے دیتے ہوئے اس نے دکھی دل سے سوچا۔

☆☆☆

"ثانیہ بتا رہی تھی کہ سب کام وہ اکیلے ہی کرتی ہے۔ اس کی ساس تو بیمار ہے۔ دو نندیں بیاہی ہوئی ہیں جبکہ شوہر کے علاوہ دونوں دیوروں اور سسر کی ساری ذمہ داری اس پر ہے۔ نندیں بھی اکثر بچوں سمیت رہنے آجاتی ہیں۔ دو چھوٹے بچوں کا ساتھ، فرصت ہی نہیں ملتی میری دھی رانی کو۔"

اماں نے فکرمندی سے کہا تو فروٹ چاٹ کے لیے پھل کاٹتی فاطمہ نے ہمدردی سے سر ہلایا جبکہ آمنہ طنزیہ مسکرادی۔

"اماں! چند روٹیاں یا سالن بنالینا کوئی بڑا کام نہیں ہوتا۔ میرے خیال سے ثانیہ کو کچھ زیادہ چیزیں بنانا آتی بھی نہیں ہوں گی جیسے مجھے آتی ہیں۔ دیکھیں نا! میں نے مختلف آئٹم افطاری میں تیار کیے ہیں۔ کٹوری چاٹ، میکرونی، چکن ڈونٹس، ایگ رول، پیزا برید، قیمہ پاکٹ اور کھانے میں چکن کڑاہی!"

آمنہ نے طویل لسٹ سنانا شروع کی۔ اماں جو پہلے اسے ٹوکنے لگی تھیں، اس کی محنت کا سوچ کر چپ ہوگئیں۔ روزے کے ساتھ اتنی چیزیں بنانا آسان نہیں تھا۔ وہ دل سے اس کی محنت کو سراہ رہی تھیں مگر آمنہ کا طنزیہ انداز برا لگا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس دعوت کی زیادہ تر چیزیں آمنہ نے اپنے سر لی تھیں مگر اپنی خوشی سے۔

آمنہ کا خیال تھا کہ افطار میں مختلف اور زیادہ آئٹم بنا کر وہ سب کو متاثر کرلے گی جبکہ کھانے میں بریانی، چکن کڑاہی، پالک گوشت اور میٹھے میں کھیر شامل تھی۔

ثانیہ اپنے سسرال والوں کے ساتھ میکے آئی تو اس کا استقبال بہت گرم جوشی سے کیا گیا۔ آمنہ نے ہر چیز آگے ہو کر پیش کی۔ مہمانوں کو ہر چیز بہت پسند آئی اور انھوں نے کھلے دل سے سراہا۔ آمنہ خوشی سے کھل اٹھی۔ اسے لگا کہ وہ سب پر اپنی دھاک بٹھا چکی ہے۔

"ماشاء اللہ! میری تینوں بھابیوں نے میرے میکے کی شان بڑھا دی ہے۔ سسرال میں میری عزت بن گئی ہے۔"

جانے سے پہلے ثانیہ نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ اماں اور ابا خوشی سے کھل اٹھے۔

"ہم تمہاری عیدی لے کر آنا چاہ رہے ہیں۔ جس دن تم فارغ ہو، بتا دینا۔" فاطمہ بھابھی نے نرمی سے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"جس دن آپ آنا چاہیں۔ میں گھر پر ہی ملوں گی۔ دراصل میں عید کے تیسرے دن کی دعوت کا کہنے آئی تھی۔"

اس نے کہا تو اماں منع کرنے لگیں کہ اس کی ضرورت نہیں مگر وہ نہ مانی۔

"آمنہ کی پہلی عید ہے۔ میرے گھر دعوت تو بنتی ہے ناں!" ثانیہ نے مسکرا کر کہا تو آمنہ چونکی۔

"اچھا تو مجھے نیا پکوان کھانے کی تیاری ہے۔" وہ دل میں سوچ کر مسکرائی۔ ثانیہ چلی گئی تو وہ عید کی دعوت کے بارے میں سوچنے لگی۔

"زیادہ سے زیادہ کیا بنا لے گی؟ یہ ہی چند چیزیں۔ افطار والے آئٹم تو نہیں بنا سکتی نا!"

آمنہ سوچتی رہی۔ اسے بے صبری سے عید کی دعوت کا انتظار تھا۔ کچھ دن کے بعد فاطمہ بھابھی اور سعدیہ، ثانیہ کی عیدی لے کر گئیں۔ واپسی پر وہ ثانیہ کی بہت تعریفیں کر رہی تھیں۔ اماں اور ابا تو سن کر خوش اور حیران ہوتے رہے کہ ان کی دھی رانی نے بخوبی گھر سنبھالا ہوا ہے مگر آمنہ کو یہ سب جھوٹی تعریفیں لگ رہی تھیں۔

"ہونہہ! ارسلان نے سب بتایا ہوا ہے کہ کتنی پھوہڑ اور نکمی تھیں ثانیہ بی بی!"

وہ طنزیہ انداز میں سوچتے ہوئے عید کی دعوت کی تیاری کرنے لگی۔ اس دن وہ بہت خاص بن کر جانا چاہتی تھی تاکہ اس کے سلیقے کے ساتھ، اس کے ڈریسنگ سینس کی بھی تعریف ہو۔

☆☆☆

"تم کاموں میں لگی ہو۔ ہمارے پاس بھی بیٹھو۔"

pklibrary.com

اماں پچھلے آدھے گھنٹے سے یہاں سے وہاں چکر لگاتی، ملازمہ کو مختلف ہدایات دیتی ثانیہ کو دیکھ رہی تھیں۔ ثانیہ کا گھر پوش علاقے میں تھا۔ سارا گھر بہت خوبصورتی اور نفاست سے سجا تھا۔ آمنہ تو اس کا گھر دیکھ کر ہی خاموش ہوگئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ثانیہ کا رہن سہن اتنا اچھا ہوگا۔

''میں تو سیدھی سادی عورت ہوں۔ گھر سجانے کا شوق ثانیہ کو ہی ہے۔ ماشاء اللہ بہت تیز اور سمجھ دار ہے۔ ہر کام خود کرنے کی عادت ہے۔''

ثانیہ کی ساس نے مسکراتے ہوئے کہا تو اماں اور ابا حیرت اور خوشی سے سر ہلانے لگے جبکہ آمنہ نے پہلو بدلا۔

''ساس ہو کر اتنی تعریفیں؟'' وہ حیران ہوگئی۔ اس کی حیرانی خاموشی میں بدل گئی جب کچھ دیر کے بعد ڈائننگ روم میں کھانا لگتے ہی ثانیہ انھیں بلانے آئی۔ جیسے ہی آمنہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی تو بوفے سسٹم کی طرح ترتیب اور سلیقے سے میز سجی دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ کھانا پیش کرنے سے لے کر پلیٹ، کانٹا، چمچہ تک کی سروِنگ میں ترتیب کا خیال رکھا گیا تھا۔

کھانے میں رکھی مختلف ڈشز دیکھ کر آمنہ خاموش ہوگئی تھی۔ بیک بیف وِد پائن ایپل ساس، فرائیڈ فش وِد لیمن ساس، قورمہ، پلاؤ، پالک پنیر، روسٹ، بہاری بوٹی اور میٹھے میں کاجو کھیر اور چیز کیک جبکہ اسرائیلی پروڈکٹس کا بائیکاٹ کرنے کی وجہ سے کوئی بھی کولڈ ڈرنک رکھنے کے بجائے، اس نے پینا کولاڈا پیش کیا۔ ہر چیز گھر میں بنی تھی۔ آمنہ تو اس کا سلیقہ اور ہنر دیکھ کر خاموش ہو کر مزے دار کھانے سے انصاف کرنے لگی جبکہ اماں اور ابا مختلف ناموں کی عجیب و غریب ڈشز کو حیرت سے دیکھتے اور چکھتے ہوئے بار بار اپنی ''دھی رانی'' کی طرف دیکھ رہے تھے جو بڑی مستعدی سے سب مہمانوں کو دیکھتے ہوئے ہر چیز گرما گرم میز پر پہنچا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کے ذائقے سے وہ پہلے کب واقف تھے؟

وہ حیران تھے کہ کیا یہ وہ ہی لاپرواسی ثانیہ ہے، جسے اماں ہر وقت ڈانٹتی رہتیں اور ابا اس کا دفاع کرتے رہتے۔

''ابا! پچھلے پانچ سالوں سے سسرال میں سب کام کرتے ہوئے کئی بار دل میں یہ حسرت جاگی تھی۔ کاش آپ دونوں کی بھی ایسے ہی خدمت کی ہوتی جیسے سسرال میں سب کی کر رہی ہوں۔ سچ کہوں تو عید کی یہ دعوت صرف آپ دونوں کے لیے تھی۔ آپ دونوں کو یہ بتانے کے لیے کہ آپ کی دھی رانی، سسرال میں بھی رانی بن کر ہی راج کر رہی ہے۔''

کھانے کے بعد ابا اور اماں نے جب اس کے بنائے کھانوں کی تعریف کی تو وہ نم لہجے میں گویا ہوئی۔ میکے میں لاابالی رہنے والی ہر لڑکی لازمی نہیں کہ شادی کے بعد بھی ایسی ہی رہے۔

''میں جانتا تھا میری دھی رانی بہت سمجھ دار ہے تمہاری اماں کو ہی شکوے رہتے تھے۔''

ابا نے فوراً اسے سینے سے لگاتے ہوئے اماں کو گھورا تو وہ تڑپ اٹھیں۔

''ہاں تو میں کون سا دشمن ہوں۔ بھلے کے لیے ہی کہتی تھی۔ اسی لیے تو آج میری دھی رانی۔۔۔!''

دونوں کی بحث سن کر وہ سب مسکرا رہے تھے جبکہ ثانیہ باپ کے سینے سے لگ کر کھڑی اس راحت کو محسوس کرنے لگی جو صرف باپ کے شفیق لمس میں پنہاں ہوتی ہے۔

☆☆

مریم عزیز

دستورِ وفا

مکمل ناول

دوسری جانب گہری خاموشی تھی۔

"غفران!" اتنی خاموشی پر سعید صاحب کو اسے پکارنا پڑا تھا۔

"چاچا جی! آپ فون رکھیں، میں کل کرتا ہوں آپ کو فون۔" وہ جب بولا تو اس کی آواز بے حد سنجیدہ تھی۔

"غفران!" ان کے پکارنے پر وہ رکا تھا۔

"مجھے نہیں پتا بیٹا! تم فوزیہ سے کیسے بات کرتے ہو لیکن اس سے کہو میری انابیہ سے دور رہے۔"

"ہوں۔" غفران نے مختصر ہنکارا بھر کر فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

ان کی بیٹیاں سامنے ڈھیر سارا سامان پھیلائے اس پر تبصرہ کر رہی تھیں جبکہ فوزیہ کسی سے برپائی اور کوک سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ موبائل فون کی گھنٹی پر شائنہ نے تیزی سے فون اٹھایا۔

"غفران ماموں کا ہے۔" اس نے چہکتے ہوئے فون آن کیا تھا۔

"ہیلو ماموں کیسے ہیں؟"

"آپا کو فون دو۔" وہ بڑے سخت انداز میں بولا تھا۔ شائنہ نے گھبرا کر جلدی سے فون ماں کو دیا انہوں نے اشارے سے پوچھا لیکن شائنہ نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"ہیلو غفران! کیسے ہو آج اس وقت فون کیا سب ٹھیک ہے؟"

"آپا! تم نے انابیہ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔" اس کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ ایک پل کے لیے وہ خاموش ہی رہ گئیں لیکن اگلے ہی پل سنبھل کر بولیں۔

"پاگل ہو گئے ہو میں کیوں ہاتھ اٹھاؤں گی اس پر اللہ ایسی جھوٹی آفت لڑکی سے بچائے۔ ابھی گھر بسا نہیں اور بہن بھائی میں پھوٹ ڈلوانی شروع کر دی۔" انہوں نے طیش سے بات کرتے لہجہ رقت آمیز کر لیا۔

"غفران! میں تو تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے اس کی شکایت نہیں کی۔ تمہارے سامنے اتنی بھولی بھالی بنی رہتی ہے ورنہ پوچھو شائنہ اور ندا سے مجھ سے اتنی بدتمیزی کرتی ہے میں نے تو کبھی تم سے شکایت نہیں کی۔" غفران نے گہرا سانس لے کر خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

"آپا! انابیہ کیسی ہے اور تم کیسی ہو میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ مجھ سے نارمل بات نہیں کرتی شکایت کیا لگائے گی۔"

"پھر تمہیں الہام ہوا ہے۔" فوزیہ چمک کر بولیں۔

"الہام ہی سمجھو اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ آپا! اپنی زبان اور ہاتھ کنٹرول میں رکھو اگر تمہاری یا تمہاری اولاد کی وجہ سے میرا انابیہ کے ساتھ رشتہ خراب ہوا تو یاد رکھنا میں بہت برا پیش آؤں گا۔" اس کے سخت اور دھمکی آمیز انداز پر فوزیہ دنگ رہ گئی تھیں۔

"غفران! تم کیسے بات کر رہے ہو۔ میں تمہاری سگی بہن ہوں اور تم اس غیر لڑکی کے لیے مجھے دھمکا رہے ہو۔"

"میں دھمکا نہیں رہا بتا رہا ہوں اور وہ غیر لڑکی نہیں میری منگیتر اور ہونے والی بیوی ہے جس کی

عزت فرض ہے آپ پر۔"

"غفران تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے بچے! مجھے تو خود انابیہ بڑی پیاری ہے میرے لیے وہ بالکل شائستہ اور غدا کی طرح ہے۔" ان کے کہنے پر ان کی بیٹیوں نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔

"میں اسے اس کے بھلے کے لیے سمجھا رہی تھی

دوسری قسط

pklibrary.com

اب اگر اسے میرا کچھ کہنا بے عزتی لگا ہے تو آئندہ میں کچھ نہیں کہوں گی۔" ان کا افسردہ لہجہ سن کر دوسری طرف جیسے غفران چپ کر گیا تھا۔

"میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں آپا! مزید پریشانی نہیں چاہتا۔ آپ جانتی ہیں کتنی مشکل سے انابیہ سے میری منگنی ہوئی ہے۔ میں کوئی مسئلہ نہیں چاہتا۔" "ہاں میرے بھائی سمجھ گئی تم پریشان نہ ہو۔" وہ لگاوٹ سے بولیں۔ "تم آ کب رہے ہو؟"

"ابھی تو پھنسا ہوا ہوں جلد آنے کی کوشش کروں گا آپ کو یا ندا شائنہ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے میسج کر دیجیے گا۔" وہ اب شاید اپنے سخت رویے کی تلافی کر رہا تھا۔

"ہاں کیوں نہیں بچیوں نے تو لسٹ بنا رکھی ہے آخر تمہاری شادی کو لے کر سب کے بڑے ارمان ہیں۔" "اور ہاں آپا! میں نے منگنی پر انابیہ کے لیے جو چیزیں لی تھیں گولڈ اور کپڑے وہ سب اسے دے دیں اور مزید اچھے کپڑے اسے دلوا دیں، میں نہیں چاہتا جب میں آؤں، وہ ویسے پرانے کپڑوں میں گھوم رہی ہو۔" اب کی بار غفران نے سخت کے بجائے مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" فوزیہ بڑی دقت سے مسکرا کر بولیں۔ "چلو اپنا خیال رکھنا۔" کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔

"کیا ہوا امی! ماموں غصہ کیوں کر رہے تھے۔" ندا نے ان کے قریب آ کے پوچھا۔

"کیا ہماری چیزیں اب نہیں آئیں گی؟" شائنہ کو اپنی فکر تھی جبکہ فوزیہ ماتھے پر بل ڈالے کچھ سوچنے میں مصروف تھیں۔

"امی بولیں نا!" ندا نے ان کا کندھا ہلایا۔

"دماغ مت خراب کرو میرا۔ روٹیاں ڈال لو تمہارے پاپا آتے ہوں گے۔"

"میں کیوں ڈالوں روٹیاں، انابیہ کو بلائیں۔" ندا منہ بناتی پیچھے ہٹی تھی۔

"اپنے کام خود کرو۔ آئندہ کسی کام کے لیے انابیہ کو بلانے کی ضرورت نہیں۔" کہہ کر وہ اٹھ گئی تھیں جبکہ ان دونوں نے حیرت سے جاتی ماں کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

اس کے سامنے لیٹی عورت زندہ تھی کیونکہ اس کی آنکھوں سے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے لیکن پھر بھی اس پر کسی مردے کا گمان ہو رہا تھا انہوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا جو کانپ رہا تھا۔ اس کی اپنی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں جس کی وجہ سے بار بار سامنے کا منظر دھندلا رہا تھا۔

"وعدہ کرو مجھ سے۔" اس نے روتے ہوئے ان کا کانپتا ہاتھ دیکھا۔

"وعدہ کرو انابیہ! تم ہمیشہ اس کے ساتھ رہو گی۔ ہر حال میں یہ رشتہ نبھاؤ گی چاہے تمہیں کتنا ہی انتظار کرنا پڑے وعدہ کرو۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں ماما۔" اس نے ان کا کانپتا ہاتھ تھام لیا تھا جو بے حد ٹھنڈا تھا۔ اس کے ہاتھ پر ان کی گرفت قدرے سخت ہوئی تھی۔

"اپنی ماں جیسا تم نے بالکل نہیں بننا۔ تم اچھی بیٹی، اچھی بیوی، اچھی ماں بنو گی۔ تم عفت گل نہیں انابیہ گل ہو۔ بہت پاکیزہ، بہت معصوم، تمہیں بس ایک مرد کی بن کر رہنا ہے اور تمہیں اس کا انتظار کرنا ہے جس سے تمہارا نام جڑا ہے۔" دیکھتے ہی دیکھتے ان کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اس کے ہاتھ پر ان کا لمس کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا تھا وہ ساکت نظروں سے ان کا ساکت جود دیکھ رہی تھی ایک دم اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔

"انابیہ!" اپنے نام کی پکار سن کر اس نے تیزی سے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹائے۔

"ماما!" انہیں زندہ دیکھ کر وہ خوش ہوئی تھی لیکن ان کا چہرہ سنجیدہ اور آنکھوں میں غصہ تھا۔

"ماما!" اس نے انہیں پکارنے کے ساتھ بے ساختہ ان کا ہاتھ تھاما تھا۔

"انابیہ تم نے وعدہ توڑ دیا تم نے انتظار نہیں کیا

سوتم بھی عفت گل بن گئی ہو تمہیں سزا ملے گی۔"

وہ تیزی سے سر نفی میں ہلا رہی تھی۔ پھر اس نے چونک کر اپنی ہتھیلی دیکھی اس پر جلتا کوئلہ تھا اسے اپنی ہتھیلی پر شدید جلن کا احساس ہوا تھا وہ بے ساختہ چیخی اور پھر چیختی چلی گئی۔ ☆☆☆

نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اس لیے وہ نماز پڑھنے کے بعد کتاب لے کر بیٹھ گئے پھر جیسے کسی خیال کے آتے ہی وہ چونکے تھے۔ کتاب بیڈ پر رکھ صندوق نکالا جس پر چھوٹا سا تالا جھول رہا تھا۔ سائیڈ پر لٹکے کوٹ کی اندرونی جیب سے چابی نکال کر انہوں نے وہ تالا کھولا اندر چند پرانی تصویریں اور کاغذات تھے۔

سب کاغذات کے پیچھے سے انہوں نے ایک کاغذ نکالا۔ کاغذ کھول کر انہوں نے ایک بار پھر اس پرچے کو پڑھا۔

"مجھے معاف کرنا عفت! میں اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکا۔ میں مجبور ہوں۔" وہ بڑبڑا رہے تھے۔

مجھے اب اس کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے اس کاغذ کو مضبوطی سے پکڑا اور اس کے دو ٹکڑے کرنے چاہے اس سے پہلے کہ وہ ایسا کرتے، انہیں انابیہ کے چیخنے کی آواز آئی تھی۔ کاغذ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

وہ یونہی سب کچھ چھوڑ کر حواس باختہ سے انابیہ کے کمرے کی طرف بھاگے تھے۔ وہ شاید نیند میں چیخی تھی وہ اتنی بے چین تھی کہ وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

"انابیہ! میری بچی اٹھو کیا ہوا ہے؟" وہ اس کا گال تھپتھپا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس کی چیخیں رک گئی تھیں لیکن وہ اب بھی سسک رہی تھی۔

"انابیہ!" انہوں نے اب زور سے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"امی" اس نے ایک دم چونک کر آنکھیں کھولیں کچھ دیر وہ خالی خالی نظروں سے ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"انابیہ بچے! کیا ہوا ہے۔" انہوں نے پیار سے اس کا سر سہلایا۔

"بابا! امی ناراض ہیں۔ وہ بہت ناراض ہیں وہ کہہ رہی ہیں میں عفت گل بن گئی ہوں۔ میں وعدہ خلاف ہوں۔ انہوں نے میرا ہاتھ جلا دیا۔"

اس نے بچوں کی طرح روتے ہوئے اپنا ہاتھ ان کے سامنے کیا جہاں کانچ لگنے کی وجہ سے زخم تھے۔ شاید اس نے خواب دیکھا تھا انہوں نے اس کا کانپتا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اسے تسلی دی تھی۔

"بیٹا! کچھ نہیں ہوا سب ٹھیک ہے تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔" ان کے کہنے پر وہ چپ ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی بھی شاید وہ اسی خواب کے زیر اثر تھی۔ "لیکن بابا! وہ ناراض ہیں میں نے انتظار نہیں کیا۔" وہ بہت دھیما بول رہی تھی۔ سعید صاحب کتنی دیر تک بول ہی نہیں سکے۔

"تمہاری غلطی نہیں بیٹا! تم وعدہ خلاف نہیں۔ جو بھی فیصلہ تھا میرا تھا۔ قصوروار میں ہوں تم نہیں بس اس بارے میں مت سوچو۔" وہ اس کا سر سہلانے لگے انہوں نے نظر گھما کر گھڑی کی طرف دیکھا صبح کے نو بجنے والے تھے۔

انابیہ کا ہاتھ پکڑتے ہی انہوں نے اندازہ ہو گیا تھا اسے تیز بخار ہے شاید اسی لیے وہ ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہی تھی۔

"انابیہ بیٹا ہمت کرو۔" منہ دھو کر آؤ ہاسپٹل چلتے ہیں تمہارا بخار بہت تیز ہے۔"

"نہیں بابا! مجھے نہیں جانا۔" وہ بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! ضد نہیں کرتے پتا ہے نا اگر دوائی نہ لی تو تمہارا بخار بگڑ جائے گا۔"

"اچھا ہے بابا میں مر جاؤں میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ ایک بار پھر رو پڑی تھی۔

"انابیہ! آئندہ کوئی فضول بات مت کرنا پانچ منٹ میں تیار ہو کر باہر آؤ میں ناشتا بناتا ہوں۔" وہ اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر باہر نکل گئے۔

وہ ٹرے لے کر باہر آئے تو فوزیہ کمرے کے درمیان میں بڑا سا تھیلا لیے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔

ان پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دیں جبکہ وہ انہیں نظر انداز کر کے ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔

"خیریت اتنی صبح یہاں اگر انابیہ کو بلانے آئی ہو تو وہ نہیں آسکتی طبیعت ٹھیک نہیں اس کی۔" وہ قدرے رکھائی سے بولے۔

"کیا بات کر رہے ہیں۔ ابا جی! میں کیوں اس سے کام کرواؤں گی میں تو یہ جیولری اور کپڑے دینے آئی تھی، وہ تھیلا فوزیہ نے صوفے پر رکھ دیا۔

سعید صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا تھا تب ہی انابیہ دھیرے دھیرے چلتی اندر آئی تھی۔ اس کی آنکھیں اور گال سرخ ہو رہے تھے۔ فوزیہ کو صبح دیکھ کر وہ پریشان ہوئی تھی۔

"انابیہ تمہاری طبیعت تو کافی خراب لگ رہی ہے۔" فوزیہ نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تو وہ سعید صاحب کی طرف دیکھنے لگی۔

"آکر ناشتا کرو، پھر ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔" "انابیہ!" اسے منع کرنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر انہوں نے غصے سے اس کا نام لیا۔ تو وہ اسی طرح چلتی ہوئی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ "مجھے پتا نہیں تھا تمہاری اتنی طبیعت خراب ہے ورنہ میں خود چلتی تمہارے ساتھ ڈاکٹر کے پاس پر آج شائنہ کے ساتھ اس کی سہیلی کی طرف جانا تھا۔" ان کی بات پر جب ان دونوں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ منہ بنا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

ٹیب کی اسکرین کو وہ انہماک سے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی انگلی بھی اسکرین پر اوپر نیچے حرکت کر رہی تھی۔ تب ہی گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا نوید تیزی سے باہر نکلا تو اس نے تھوڑا سا کھسک کر کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں کوئی گرا ہوا تھا یقیناً وہ ان کی گاڑی سے ٹکرانے کی وجہ سے گرا تھا

حذیفہ نے افسوس سے سر جھٹک کر دوبارہ ٹیب پر نظریں ڈالیں لیکن کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھایا اس کے ماتھے پر بل تھے کیونکہ وہاں اب لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا وہ گہرا سانس لے کر باہر نکلا۔

"عجیب بدتمیز لوگ ہو تم گاڑی میں بیٹھ کر کیا بالکل اندھے ہو جاتے ہو۔ باپ کی روڈ سمجھی تھی۔"

"تمیز سے بات کرو۔" نوید کی آواز پر ہجوم چیرتا ہوا آگے بڑھا۔

"میں تمیز سے بات کروں ایک تو بزرگ آدمی کو گرا دیا اوپر سے بدتمیزی کر رہے ہو۔" دوسرے آدمی نے نوید کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ!"

حذیفہ نے آگے بڑھ کر آدمی کے ہاتھ کو پکڑ کر جھٹکا دیا جس نے نوید کا گریبان پکڑا تھا اس آدمی نے غصے سے حذیفہ کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کی پرسنالٹی اور چہرے کا رعب دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔

"سر! غلطی ان بابا جی کی ہے۔ یہ سگنل گرین ہونے کے باوجود روڈ کراس کر رہے تھے۔"

نوید، حذیفہ کو دیکھ کر تیزی سے بولا تو اس نے ایک نظر نیچے گرے آدمی پر ڈالی اور پھر چونک کر انہیں دیکھا۔ ان کے بازو اور گھٹنوں پر شاید چوٹ آئی تھی۔ ہجوم میں کھڑے لوگ بڑے زور و شور سے تبصرے کر رہے تھے۔ لیکن کسی نے اتنی زحمت نہیں کی تھی کہ گرے ہوئے بزرگ کو اٹھا کر اسپتال ہی لے جائیں۔

"بیٹا! چھوڑو یہ صحیح کہہ رہے ہیں میری غلطی ہے میں نے جلدی میں اپنی طرف آتی گاڑی کو نہیں دیکھا۔"

سعید صاحب نے بمشکل درد کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی تو حذیفہ نے جھک کر انہیں کھڑا ہونے میں مدد دی۔

"شکریہ بیٹا! تکلیف کے لیے معذرت چاہتا ہوں میں پریشانی کی وجہ سے دیکھ نہیں سکا۔"

انہوں نے ابھی تک حذیفہ کی طرف نہیں دیکھا

تھا بلکہ وہ زمین پر گرے انجکشن اور دوائیوں کو دیکھ رہے تھے جو گر کر ٹوٹ چکے تھے۔ جہاں افسوس سے ان کی آنکھیں نم ہوئی تھیں وہی ان کا سر چکرا رہا تھا۔

"آپ ٹھیک ہیں۔" انہیں چکراتے دیکھ کر حذیفہ نے مضبوطی سے انہیں تھاما۔

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ بمشکل بولے تو حذیفہ اور نوید انہیں پکڑ کر سائیڈ پر لے آئے وہ ہسپتال کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر گہرے سانس لینے لگے۔

"نوید! انہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ انہیں چوٹ آئی ہے۔" حذیفہ نے اپنے سیکریٹری سے کہا۔

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" وہ دوبارہ گھبرا کر بولے۔

"بابا جی! کوئی بات نہیں یہ سامنے تو ہاسپٹل ہے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔" نوید ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

"بیٹا! مجھے پہلے ہی دیر ہوگئی ہے۔ اندر میری بیٹی ہے وہ گھبرا رہی ہوگی۔ پہلے ہی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔"

حذیفہ جو جانے کے لیے مڑ رہا تھا بے ساختہ پلٹا تب ہی سعید صاحب کی نظر اس پر پڑی تھی اور اب کی بار وہ بھی چونکے تھے لیکن کچھ بولے نہیں۔ بس نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

وہ آہستہ آہستہ اب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ حذیفہ خود کو ان کے پیچھے جانے سے روک نہیں سکا تھا۔ نوید نے حیرت سے حذیفہ کو دیکھا اور خود بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔

"لائے آپ انجکشن؟" ایک نرس سعید صاحب کے پاس آکر رکی تو ان کے پیچھے آتا حذیفہ بھی رک گیا۔

"معافی چاہتا ہوں بیٹا! میں لا رہا تھا لیکن انجکشن میرے ہاتھ سے گر کے ٹوٹ گئے۔" وہ بے چارگی سے بولے تو نرس نے غصے سے انہیں دیکھا۔

"بزرگو آپ بھی کمال کرتے ہیں پہلے آپ نے اتنی ایمرجنسی لگائی ہوئی تھی پہلے آپ کی بیٹی کو دیکھا جائے۔ اسپیشل نمبر لے کر اسے ڈاکٹر کو دکھایا آپ کو خود پتا ہے لڑکی کو کتنا تیز بخار ہے لیکن حد ہے لاپرائی کی۔"

"حذیفہ تیزی سے آگے بڑھا۔ "مجھے دیں پرچی" نرس نے پہلے حذیفہ اور پھر سعید صاحب کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا جو خود بھی حیرت سے حذیفہ کو دیکھ رہے تھے۔

"لائیں۔" اس نے دوبارہ کہا تو نرس نے جلدی سے اپنی فیس کی جیب سے پین اور رائٹنگ پیڈ پر انجکشن لکھ کر پرچہ حذیفہ کی طرف بڑھایا۔

"تھینکس، نوید یہ جلدی سے لے کر آؤ۔"

نوید جو سب ناسمجھی سے دیکھ رہا تھا۔ حذیفہ کے گھورنے پر جلدی سے سر ہلاتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

"آپ نے خوامخواہ تکلیف کی۔" سعید صاحب اس کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے۔

"میری غلطی کی وجہ سے آپ کا نقصان ہوا تھا تو میری ذمہ داری ہے کہ اس کا ازالہ بھی کروں۔"

اس کی بات کا سعید صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے بنچ کے کنارے بیٹھ گئے جبکہ حذیفہ وہی کھڑا اضطرابی انداز میں اپنا دایاں پاؤں ہلا رہا تھا۔

"انکل جی آپ کی بیٹی آپ کو بلا رہی ہے۔" نرس کی اطلاع پر سعید صاحب تیزی سے کھڑے ہوئے ان کے کمرے میں جاتے ہی حذیفہ بھی دروازے کی طرف بڑھا۔

"بابا! اب گھر چلیں میرا یہاں دل گھبرا رہا ہے۔" حذیفہ نے دروازے کی اوٹ سے اندر جھانکا۔

"چلتے ہیں بیٹا بس انجکشن لگوالیں۔" سعید صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔ وہ جو سعید صاحب کی پشت کو گھور رہا تھا۔ ان کے پیچھے ہوتے ہی ساکت ہوگیا کالی چادر میں لپٹا وہ چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔

"نہیں بابا! انجکشن نہیں پلیز۔" ایک دم اس کی

آنکھوں میں آنسو آئے تھے اور ان آنکھوں کی نمی دیکھ کر حذیفہ کے ہاتھ بے ساختہ مٹھی کی صورت اختیار کر گئے۔

"سر انجکشن!" نوید کی آواز پر وہ جیسے ہوش میں آیا جلدی سے باہر نکلا نوید نے حیرت سے ضرورت سے زیادہ سنجیدہ حذیفہ کو دیکھا۔ انجکشن کمرے کی طرف جاتی نرس کو دے کر وہ نوید کی طرف مڑا۔

"گاڑی کی چابی مجھے دو اور تم عرفان کے ساتھ کیب سے چلے جاؤ۔ مجھے کسی پرسنل کام سے جانا ہے۔"

"سر میں بھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔"

نوید کے کہنے پر حذیفہ نے اسے گھور کر دیکھا۔

"جتنا کہا ہے اتنا کرو۔"

"جی!" نوید منہ بسور کر مڑ گیا۔

سعید صاحب انابیہ کو لے کر باہر نکلے تو ٹھٹک کر رک گئے۔ "آپ گئے نہیں۔" انہوں نے حیرت سے بینچ پر بیٹھے حذیفہ سے کہا جو انہیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک گہری لیکن بظاہر سرسری نظر اس نے ساتھ کھڑے وجود پر ڈالی جس کا چہرہ اب ڈھکا تھا۔ بس آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

"آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کو چوٹ لگی تھی تو میں نے سوچا آپ کو چھوڑ آؤں۔"

اس سے پہلے وہ کچھ کہتے نرس ان کے پیچھے آئی تھی۔

"بڑے صاحب ڈاکٹر کی فیس تو آپ نے دی نہیں۔" اس کے کہنے پر سعید صاحب نے چور نظروں سے اپنی طرف دیکھتے حذیفہ کو دیکھا۔ "بیٹا میں کل آ کر آپ کا بل ادا کر دوں گا۔ میں باہر دوائی لینے گیا تھا۔ میرا بٹوہ بھی شاید وہیں گر گیا ہے۔" وہ شرمندگی سے نظر جھکا کر بولے نرس نے گہرا سانس لیا۔

"انکل یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ پرائیویٹ ہاسپٹل ہے پہلے پرچی بنتی ہے جو آپ نے بنوائی نہیں۔ آپ کی عمر کا لحاظ کر کے آپ کو کمبر بھی پہلے دے دیا۔ اب آپ پیسے نہ دینے کے بہانے بنا رہے ہیں۔ یہ کیا خیراتی ہسپتال لگ رہا ہے آپ کو۔"

"کتنا بل ہے ان کا؟" حذیفہ جو ہونٹ بھینچ کر کنٹرول کر رہا تھا بمشکل ضبط سے بولا۔

"دو ہزار" حذیفہ نے والٹ نکال کر دو ہزار اس کی طرف بڑھائے پھر ایک ہزار اور نکالا اور نرس کی طرف بڑھایا۔ جبکہ اس کے سامنے تینوں افراد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپ نے اچھا ٹریٹمنٹ کیا اس کے لیے لیکن ایک بات یاد رکھیں بے شک یہ خیراتی ہاسپٹل نہیں لیکن مجبوری اور حادثہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ سو اپنا لہجہ ٹھیک رکھ کر بات کیا کریں۔"

نرس کے ہاتھ میں اضافی پیسے تھے وہ کیا کہتی دانت نکال کر سر ہلایا۔

"چلیں انکل!" حذیفہ نے ہاتھ سے سعید صاحب کو چلنے کا اشارہ کیا اور ان سے پہلے باہر نکل گیا۔ جب وہ گیٹ سے باہر آئے وہ سیڑھیوں کے سامنے کار میں ان کا انتظار کر رہا تھا۔

گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔ سعید صاحب آگے بیٹھے تھے۔ راستہ بتانے کے علاوہ انہوں نے کئی بار چور نظروں سے دیکھا جو مکمل خاموشی اور سنجیدگی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"بس بیٹا یہیں گاڑی روک دیں آگے گلی تنگ ہے گاڑی نہیں جائے گی۔"

"جی!" اس نے کار ایک سائیڈ پر روک دی۔

"بیٹا آپ تھوڑی دیر رکو گے میں آپ کے پیسے گھر سے لے آؤں۔"

"انکل پلیز، آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"نہیں میں کیوں آپ کو شرمندہ کروں گا میں تو آپ کا احساس مند ہوں کہ آپ نے مجھے شرمندہ ہونے سے بچایا لیکن ڈاکٹر کی فیس دینا آپ کی ذمہ داری نہیں تھی اگر آپ نہیں لیں گے تو مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

حذیفہ ان کی طرف ہی دیکھ رہا تھا ان کے کہنے پر اس نے گاڑی سے باہر نظر ڈالی جہاں کے کالے

نقاب میں چھپی آنکھیں اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس کے دیکھنے پر اس نے نظریں فوراً جھکالی تھیں اس نے نظریں واپس سعید صاحب پر ٹکائیں۔

"انکل! ابھی مجھے جلدی ہے لیکن میں آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گا اور آپ سے اپنی چیز ضرور واپس لوں گا۔"

اس نے باہر دیکھ کر کہا تو وہ سر ہلا کر اتر گئے ان کے اترتے ہی اس نے سنجیدگی سے ان دونوں کو جاتے دیکھا۔

☆☆☆

صوفے پر بیٹھ کر اس نے چادر سر اور چہرے سے اتار کر گہری سانس لے کر آنکھیں بند کر کے سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ سعید صاحب نے بغور اس کا زرد چہرہ دیکھا۔

"چندا! کچھ کھانے کو لاؤں۔" انابیہ نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں۔ انہیں یوں اپنی خاطر مدارت کرتے دیکھ کر اسے بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

"بابا پلیز! میں اب ٹھیک ہوں، آپ بیٹھیں میں خود لے لوں گی۔"

"نہیں کچھ بنانے کی ضرورت نہیں۔ فوزیہ نے بریانی بنا کر بھیجی ہے، نیچے، اس نے یہی کہنے کے لیے روکا تھا۔" وہ مسکرائے تو اس مہربانی پر وہ بھی مسکرا دی۔

"جانتی ہو نا یہ سب کیوں کر رہی ہے۔"

ان کا اشارہ وہ بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔ اس لیے مسکرانے کے بجائے سنجیدگی سے سر ہلا دیا۔

"بابا یہ جو ہاسپٹل میں ملے تھے یہ کون تھے۔"

"وہ" سعید صاحب یک دم چپ ہوئے اب وہ اسے کیا بتاتے۔

"وہ میرا جاننے والا تھا۔" اس سے پہلے ان میں مزید کوئی بات ہوتی سعید صاحب کا فون بجا تھا۔ اسکرین پر نظر ڈال کر انہوں نے اٹھا لیا۔

"ہاں بیٹا میں ٹھیک ہوں اور انابیہ بھی ٹھیک ہے" کہہ کر وہ دوسری طرف کی بات سننے لگے جبکہ انابیہ خاموشی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ "میں سمجھ سکتا ہوں بیٹا تمہارا بہت شکریہ۔"

دوسری طرف سے پتا نہیں کیا کہا گیا تھا وہ مسکرا دیے۔

"یہ لو بات کرو۔" انہوں نے فون انابیہ کی طرف بڑھایا جسے اس نے سعید صاحب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے تھام لیا۔

"غفران ہے۔" ان کے بتانے پر اس نے سر نفی میں ہلاتے ہوئے انہیں فون واپس کرنا چاہا تو انہوں نے آنکھیں نکال کر اسے فون پر بات کرنے کا اشارہ کیا۔

"السلام علیکم" اس نے دھیمی آواز میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام!" دوسری طرف سے اس کی مسکراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کیسی ہو۔"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیتے ہوئے ناراضی سے سعید صاحب کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا کر اسے آنے کا اشارہ کر کے باہر نکل گئے۔

"بخار کیوں ہو گیا ہے تمہیں۔" "پتا نہیں۔" اس نے اپنا زخمی ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں مجھے مس تو نہیں کر رہیں۔" اس کی آواز میں شوخی محسوس کر کے وہ خاموش ہوئی تھی۔

اس کی خاموشی پر وہ خود ہی بول پڑا تھا۔

"اتنی خاموشی" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔

"ویسے خاموشی بھی اقرار ہوتی ہے اور مجھے پتا ہے جتنی تم شرمیلی ہو خود سے تو کبھی نہیں کہوں گی کہ تم مجھے مس کر رہی ہو۔" وہ اب بھی خاموش تھی۔

"مجھے چچا جی نے بتایا آپا نے کیا کہا اور کیا کیا۔ پر میں نے انہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے وہ ایسا نہیں کریں گی۔ تم بس میرے آنے تک اپنا خیال رکھنا اور جب تم میرے پاس آ جاؤ گی۔ تو میں خود تمہارا خیال رکھوں گا۔ ٹھیک ہے انابیہ؟"

اب کے اس نے سنجیدگی سے سخت لہجے میں اس کا نام لیا تو اسے بولنا پڑا۔

"جی!"

"بتاؤ تمہارے لیے کیا لاؤں۔"

"کچھ نہیں۔"

"یار! کیسی لڑکی ہو، لڑکیاں تو اتنی فرمائشیں کرتی ہیں۔ ابھی عدا اور شائنہ نے اتنی لمبی لسٹ بھیجی ہے تم بھی بتاؤ میں چاہتا ہوں تم مجھ سے فرمائش کرو۔"

انابیہ نے بے چارگی سے سعید صاحب کے کمرے کی طرف دیکھا جو باہر ہی نہیں آرہے تھے اور کمزوری کی وجہ سے اب اسے چکر آرہے تھے۔

"جو آپ کو اچھا لگے۔" آخر کار اسے بولنا پڑا۔

"اپنی زندگی میں، میں نے بہت خوب صورت عورتوں کو دیکھا ہے ملا بھی ہوں لیکن تم جیسی کوئی نہیں تم بہت خوب صورت ہو انابیہ لیکن بات صرف خوبصورتی کی نہیں تم میں جو سب سے خالص ہے وہ تمہارا حیا ہے تم ایک کھلی ہوا ایک بند کتاب، خوب صورت راز، جس کو کوئی قسمت والا جان سکتا ہے اور وہ خوش نصیب میں بننا چاہتا تھا اور دیکھو میں بن گیا۔ تم جلدی میری بن جاؤ گی۔" اس سے زیادہ سننے کی اس کی میں ہمت نہیں تھی اس نے فون بند کر کے آف کر دیا۔

☆☆☆

دروازے کے آگے کتنی دیر تک وہ کھڑا رہا وہ نہیں جانتا تھا وہ یہاں اپنے آنے کا کیا جواز دے گا۔ لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ اس کو دیکھنے کے بعد وہ بے چین تھا اور ساری رات سو نہیں سکا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر دائیں ہاتھ میں پکڑے شاپرز کو بائیں ہاتھ میں منتقل کیا جس میں پہلے سے ایک شاپر تھا۔

گھنٹی بجانے کے بعد وہ گہرا سانس لے کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ دروازہ کھلنے پر اجنبی چہرہ سامنے آنے پر اس کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ شکیل نے حیرت سے اس شاندار شخص کو دیکھا۔

"جی فرمائیں!" اسے خاموش دیکھ کر شکیل صاحب نے سوال کیا۔

"کیا سعید صاحب یہیں رہتے ہیں۔" وہ آتو گیا تھا لیکن اب جگہ کو لے کر کنفیوژ ہو گیا تھا۔ کیونکہ جہاں تقریباً سب ہی گھر اور دروازے ایک سے لگ رہے تھے۔

"جی ان ہی کا گھر ہے۔" شکیل نے اب مزید حیرت سے اجنبی کو سر سے پیر تک دیکھا۔

"میں ان کی عیادت کے لیے آیا تھا۔"

"عیادت" شکیل نے حیرت سے دہرایا۔

"انہیں کیا ہوا ہے۔" وہ الٹا اس سے پوچھنے لگے تو اب کی بار حذیفہ نے سامنے کھڑے شخص کو بغور دیکھا۔

"کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟" سب کچھ نظر انداز کرتا وہ کام کی بات پر آیا تھا۔

"ہاں جی آئیں۔ یہاں سے اوپر چلے جائیں۔" اندر داخل ہو کر ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

سیڑھیاں ختم ہوتے ہی بڑا سا کمرہ تھا جہاں فرنیچر کے نام پر چند پرانے صوفے اور کرسیاں تھیں۔ وہ دو قدم آگے بڑھا تب ہی دائیں طرف دروازے پر ہلکی چل محسوس کر کے وہ مڑا اور دروازے سے نظر آتے چہرے کو دیکھ کر جہاں اس کی اضطرابی کیفیت غائب ہوئی تھی وہیں اس کی آنکھیں بھی چمک اٹھی تھیں وہ جو سعید صاحب کے کپڑے استری کر کے کچن میں جا رہی تھی بے ساختہ دروازے میں ہی رک گئی سامنے کھڑا وجود اسے اپنا وہم لگا تھا۔

وہ کتنے ہی پل اسے دیکھتی رہی مقابل بھی ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس وہم کو جھٹلانے کے لیے اس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں اس کی اس ادا پر سامنے والے کے چہرے پر پڑی بے ساختہ مسکراہٹ آئی تھی۔ اس کو جھٹکا لگا تھا وہ وہم نہیں تھا حقیقت تھا وہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹ کر دروازے کی اوٹ میں ہو گئی تھوک نگل کر اس نے اپنی گھبراہٹ کو کم کرنا چاہا۔

"السلام علیکم!" اگلے ہی پل بھاری لیکن مسکراتی آواز اسے اپنے قریب سنائی دی۔ اس نے تیزی سے گلے میں پڑے دوپٹے کو خود پر پھیلا کر اچھی

طرح سر پہ لپیٹا۔

"میں انکل سے ملنے آیا تھا۔" اسے باہر نہ آتا دیکھ کر اسے بتانا پڑا تھا وہ دونوں ہاتھ مسلتی خود کو ہمت دیتی باہر آئی وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا تھا اب کی بار انابیہ نے اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

"آپ بیٹھیں میں بابا کو بلا کر لاتی ہوں۔" وہ سر جھکائے اسے کہتی دوسرے کمرے کی طرف مڑ گئی جبکہ حذیفہ مسکراتا ہوا۔ سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گیا اور دونوں شاپر سینٹر ٹیبل پر رکھ دیے۔ سعید صاحب نے حیرت سے انابیہ کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور پھر پریشانی سے باہر نکلے۔ ان کو دیکھ کر حذیفہ کھڑا ہو گیا۔

"آپ!" سعید صاحب حیرت اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔ "آپ کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا؟" بغور ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے حذیفہ نے سوال کیا تو ان کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا۔ "نہیں بیٹا ایسی کوئی بات نہیں لیکن آپ یوں اچانک ان کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہیں؟" کل میری گاڑی سے آپ کو چوٹ آئی تھی ساری رات میں پریشان رہا اسی لیے آج سیدھا آپ کی خیریت پوچھنے آ گیا۔ لیکن لگ رہا ہے غلط کیا۔" وہ چہرے پر مایوسی لاتے ہوئے بولا تو سعید صاحب بے چارے بوکھلا کر رہ گئے۔

"بالکل نہیں بیٹا! مجھے بہت اچھا لگا بیٹھو۔" اسے بیٹھنے کا کہہ کر ان کی نظر ٹیبل پر رکھے شاپرز پر پڑی تو چونکے "یہ فروٹس اور کچھ بیکری آئٹم لایا تھا۔ خالی ہاتھ آنا مجھے اچھا نہیں لگا۔" ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے حذیفہ نے جواب دیا۔

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں کل بھی آپ نے اتنا کچھ کیا تھا۔" وہ واقعی شرمندہ ہو رہے تھے۔

"انکل! پرانی باتیں چھوڑیں میں نے کچھ نہیں کیا۔ مزید ایسی بات کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

سعید صاحب اس کا چہرہ دیکھنے لگے وہ اس دن سے کتنا مختلف نظر آ رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ اس کا یہاں آنا انہیں حیران کر رہا تھا۔

ان کی کھوجتی نظریں خود پر محسوس کر کے اس نے موبائل نکال لیا۔ تب ہی قدموں کی آواز پر اس نے موبائل سے دھیان ہٹا کر اوپر دیکھا۔ جوس کا گلاس لیے وہ نظریں جھکائے اس کے سائیڈ پر کھڑی تھی اس نے شکریہ کہہ کر گلاس تھام لیا۔ کیونکہ دوبارہ آنے کے لیے اس نے راہ تو ہموار کرنی تھی۔

☆☆☆

کانفرنس روم سے نکل کر وہ اپنے آفس میں آیا تو اس کی پرسنل سیکریٹری عشنا بھی اس کے پیچھے آئی تھی۔

"یس عشنا!" اس نے ابرو اچکا کر پہلے عشنا کو پھر اس کے ہاتھ میں پکڑے بیگز کو دیکھا۔

"سر! آپ نے جو کپڑے آرڈر کرنے کو کہا تھا وہ آ گئے ہیں۔" اس نے بریندڈ بیگز ٹیبل پر رکھے اور اس میں سے لیڈیز سوٹ نکال کر دکھائے۔ اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا عشنا نے بغور اپنے باس کی اس حرکت دیکھی۔

"تھینک یو عشنا یو مے گو ناؤ۔" اس کے بولنے پر وہ مسکرا کر سر ہلاتی باہر نکل گئی۔ اس نے دوبارہ ان کپڑوں کو دیکھا اور دراز سے اپنا موبائل اور کار کی چابی اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

تب ہی دستک دے کر نوید اندر آیا تھا۔ "آپ کہیں جا رہے ہیں سر۔" نوید نے اس کے ہاتھوں میں پکڑے بیگز کو دیکھ کر پوچھا۔

"کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے۔" اس کے سنجیدگی سے پوچھنے پر وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

"نہیں وہ سکیا والوں کے ساتھ میٹنگ تھی۔"

"وہ کل نہیں تھی۔" اس نے اپنا موبائل چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ بورڈ میٹنگ کل ہے لیکن آج ان کے ساتھ لنچ تھا۔"

"نوید! لنچ اور میٹنگ میں فرق ہوتا ہے بہر حال

میں نہیں جارہا تم چلے جاؤ اور میری طرف سے معذرت کر لینا۔"

وہ مزید اسے کہنے کا موقع دیے بغیر باہر نکل گیا جبکہ اس کی نظر ابھی ابھی حذیفہ کے ہاتھ میں پکڑے لیڈیز بیگ پر تھی۔

وہ گنگناتے ہوئے ڈرائیو کر رہا تھا اسے انابیہ سے ملے چار ہفتے ہو گئے تھے اور اس دوران پانچ بار وہ سعید صاحب کی طرف چکر لگا چکا تھا وہ جانتا تھا وہ مروتاً اسے کچھ کہہ نہیں رہے ورنہ اس کی بلاوجہ کی آمد انہیں شاید پسند نہیں آرہی تھی۔ لیکن وہ بھی کیا کرتا جب سے ایسے انابیہ کا پتا چلا تھا۔ وہ ماضی بھول گیا تھا اسے بس یاد تھی تو انابیہ وہ اس کے بارے میں سوچ رہا تھا جب اس کا فون بجا اس نے کان سے لگا ایئر پوڈ دبایا۔

"السلام علیکم ممی کیسی ہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! تم کیسے ہو اتنے دن ہو گئے گھر نہیں آئے۔"

کچھ نہیں ممی تھوڑا بزی تھا۔ لیکن جلد چکر لگاؤں گا۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"اس ویک اینڈ پر تم گھر آجاؤ۔"

"خیریت ہے۔" ان کے انداز پر وہ چونکا تھا۔

"ہاں بھابھی نے طالب اور انعم کی منگنی ہفتے کو رکھی ہے۔ گھر کے لوگ اور کچھ قریبی دوست ہوں گے۔" حذیفہ کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی۔

"بھائی مان گئے؟" اس کے ماتھے پر بل تھے۔

"تو کیا کرتا، بھابھی نے اس کا جینا حرام کر رکھا تھا۔" وہ جیسے اس کی بے بسی یاد کر کے مسکرائی تھیں۔

"بھائی کب سے اتنے مجبور ہو گئے؟" اس نے طنزیہ انداز میں کہہ کر سر جھٹکا۔

"تمہیں کیا مسئلہ ہے یہ تو خوشی کی بات ہے ہر کوئی خوش ہے اتنے سالوں بعد کوئی خوشی آرہی ہے اور میں نے تمہاری اور نگین کی بات بھی کر دی ہے۔ اب تم بتاؤ منگنی کرنی ہے یا نکاح؟" ان کی آواز میں شوخی محسوس کر کے اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

"یہ میری منگنی نکاح بیچ میں کہاں سے آگیا۔"

"یہ کیا بات ہوئی حذیفہ! ابھی نہ بھی تو یہ رشتہ ہونا ہے تو پھر حرج کیا ہے ابھی کرنے میں۔"

"ابھی نہ بھی کا مطلب یہ نہیں کہ ابھی کر لوں ابھی میں کسی جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

وہ بیزاری سے بولا تو دوسری طرف کلثوم پریشان ہوئی تھیں۔

"میں بھابھی سے بات کر چکی ہوں۔" وہ غصے سے بولیں۔ "منع کر دیں۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

"ایسے کیسے منع کر دوں۔" ممی میں کوئی بحث نہیں چاہتا میں ابھی منگنی نکاح کچھ نہیں کر رہا بس۔"

کہہ کر اس نے فون آف کر دیا۔ اچھے بھلے موڈ کا بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ اس کے ماتھے پر بل تھے جبکہ چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں واضح تھیں۔

☆☆☆

"بیٹا آپ کیوں اتنی زحمت کرتے ہو پچھلی دفعہ بھی اتنا کچھ لے کر آئے تھے اب پھر یہ" انہوں نے سامنے پڑے ڈھیر سارے ڈبوں کو دیکھ کر تکلفاً کہا اور اتنی مہنگی چیزیں دیکھ کر وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں۔

"بس آنٹی خالی ہاتھ آنا اچھا نہیں لگتا۔" وہ بڑی مشکل سے موڈ اچھا رکھ کر بات کر رہا تھا۔ اتنے دن یہاں آتے اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ اس گھر میں انٹری کے لیے اس عورت کو رام کرنا ضروری ہے ورنہ پہلی ملاقات میں اس عورت کی لالچی اور بُری فطرت اسے محسوس ہو گئی تھی اور اوپر سے وہ دو لڑکیاں جو اس کے آنے پر سارا ٹائم اس کے اردگرد منڈلاتی رہتی تھیں۔ لیکن وہ یہ سب انابیہ کے لیے برداشت کر رہا تھا لیکن جس کی خاطر وہ یہاں آتا تھا۔ وہ بمشکل اس کے سامنے آتی تھی۔ اس کو دیکھنے کے لیے ان سب کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

"میں ذرا انکل سے مل لوں۔" وہ مسکرا کر کہتا

کھڑا ہو گیا۔

"ہاں مل آؤ لیکن کھانا نیچے کھانا۔" شائستہ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔

"جی ضرور" وہ جان چھڑانے والے انداز میں بول کر جلدی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا لیکن پہلے صوفے کے ساتھ رکھے شاپر اٹھانا نہیں بھولا تھا اور اس کا یہ عمل فوزیہ نے بغور دیکھا تھا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی کھانے کی خوشبو اس کی ناک سے ٹکرائی جسے اس نے لمبا سانس لے کر اندر کھینچا اس نے سامنے نظر ڈالی کوئی نہیں تھا تو اس کے قدم خود بخود کچن کی طرف بڑھے۔ وہ اس کی طرف پشت کیے کڑاہی میں کچھ ڈال رہی تھی۔

آہٹ کے ساتھ مردانہ پرفیوم کی خوشبو اس کے حواسوں کو معطل کر گئی۔ اس نے ڈرتے ہوئے پیچھے دیکھا اور دروازے میں کھڑے حذیفہ کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔

"بڑی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔" اس نے دو قدم اندر آتے کہا۔

"پکوڑے بنا رہی تھی۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"انکل کدھر ہیں؟"

"بابا باہر گئے ہیں۔"

"او" اس نے ہونٹ سکوڑے۔

"آپ بیٹھیں وہ آتے ہوں گے۔" وہ سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ اسے بیٹھے ابھی کچھ پل گزرے تھے جب سعید صاحب اسے اوپر آتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھ کر جہاں وہ کھڑا ہوا وہیں اسے دیکھ کر پہلے وہ حیران ہوئے اور پھر سر جھکا گئے وہ سمجھ گیا اس کا آنا اچھا نہیں لگا۔ ہاتھ میں پکڑے شاپر لیے وہ کچن میں چلے گئے۔ جب وہ واپس آئے وہ ویسے ہی کھڑا تھا۔

"بیٹھو بیٹا!" انہیں مروتاً اخلاق دکھانا پڑا۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہوں۔" انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔

"آپ پیدل گئے تھے۔"

"یہاں گلی کے نکڑ تک گیا تھا کچن کا سامان لانا تھا۔"

"میں نے اس دن بھی آپ سے کہا تھا کچھ چاہیے ہو تو مجھے ایک فون کر دیا کریں۔ میں لے کر آؤں گا۔"

اس کے کہنے پر سعید صاحب نے بغور اسے دیکھا اس سے پہلے وہ کچھ کہتے انابیہ ٹرے لے کر آئی اور چائے اور پکوڑے سامنے ٹیبل پر رکھے۔

"انابیہ" اس سے پہلے وہ باہر جاتی حذیفہ نے بے ساختہ اس کا نام لیا تھا۔

انابیہ کے ساتھ سعید صاحب نے بھی اسے چونک کر دیکھا۔ کیونکہ اس نے کبھی انابیہ کو یوں مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس نے کرسی کے ساتھ رکھے شاپنگ بیگز پکڑ کر انابیہ کی طرف بڑھائے۔

"یہ میں تمہارے لیے لایا تھا۔" انابیہ نے حیرت سے اسے دیکھنے کے بعد پریشانی سے سعید صاحب کو دیکھا۔ جنہوں نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے جیسے خود کو کچھ سخت کہنے سے روک رہے ہوں۔

"میں یہ نہیں لے سکتی۔" انابیہ کے لہجے اور چہرے دونوں سے گھبراہٹ چھلک رہی تھی۔

"کیوں میں اپنی خوشی سے لایا ہوں۔" وہ اب کھڑا ہو گیا تھا۔ انابیہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"بیٹا وہ ٹھیک کہہ رہی ہے میں پہلے بھی آپ سے کہنا چاہتا تھا۔ آپ یہ تکلفات مت کیا کریں ہمیں اچھا نہیں لگتا۔"

حذیفہ ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا جہاں مروت اب غائب ہو چکی تھی۔

"انابیہ اپنے کمرے میں جاؤ۔" ان کے کہتے ہی وہ باہر چلی گئی۔ جبکہ حذیفہ اب بھی کھڑا تھا۔

"مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔ اس لیے میں آپ کو ٹائم نہیں دے سکوں گا۔" ان مطلب سمجھ کر حذیفہ نے گہرا سانس لیا اور قدم سیڑھیوں کی طرف بڑھا دیے۔

اس کے جاتے ہی سعید صاحب نے گہرا سانس

لے کر اس کی طرف دیکھا جہاں وہ کھڑا تھا پھر وہ چونک کر رہ گئے شاپنگ بیگز وہیں رکھے تھے۔ وہ تیزی سے بیگز اٹھائے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ وہ گاڑی تک پہنچا تھا جب پیچھے آتی آواز پر مڑا جہاں سعید صاحب ہانپتے ہوئے اس کے پیچھے آرہے تھے۔

"آپ یہ بیگز بھول گئے تھے۔" انہوں نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہتے ہوئے بیگز اس کی طرف بڑھائے اس نے صرف ایک نظر بیگز کو دیکھا لیکن ہاتھ نہیں بڑھائے۔

"میں ایک دفعہ کوئی چیز تحفتاً دوں تو اسے واپس نہیں لیتا۔ اور ویسے بھی کسی کے خلوص سے دیے گئے تحفے کو واپس کرنا بداخلاقی کے زمرے میں آتا ہے۔"

"میں بداخلاقی کرنا نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی تک مروت میں ہی چپ تھا لیکن یوں آپ کا بلاوجہ آنا اور اپنا قیمتی وقت اور روپیہ یوں ہم پر ضائع کرنا بنا مقصد تو نہیں ہوسکتا۔"

"آپ کو کیوں لگا کہ میں بنا مطلب ایسا کر رہا ہوں۔" اس کے مضبوط اور سیدھے انداز پر وہ پریشان ہوئے تھے۔

"ہم سے آپ کو کیا مطلب ہوسکتا ہے۔" انہوں نے شاید اس سے زیادہ خود سے سوال کیا تھا۔

"انابیہ میں انابیہ کے لیے آتا ہوں۔"

انہیں شک تو تھا لیکن مقابل کا یوں بے باک انداز انہیں ساکت کر گیا تھا۔ لیکن اگلا احساس ناگواری اور غصے کا تھا۔

"آپ ہوش میں تو ہیں کیا کہہ رہے ہیں میں غریب ہوں، کمزور ہوں لیکن اتنا لاچار نہیں کہ آپ کی یہ بکواس برداشت کرلوں۔ آئندہ یہاں مت آیئے گا۔" انہیں اتنا غصہ آرہا تھا کہ ان کی آواز شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔

"سعید صاحب!" ان کے مڑتے ہی حذیفہ کی سنجیدہ اور غصیلی آواز نے ان کے قدم روکے۔

"جانے سے پہلے یہ جان لیں میں کون ہوں۔ حذیفہ ارباز جیلانی نام ہے میرا۔" وہ نام دھماکے کی صورت میں سعید صاحب کے سر پر پھٹا تھا وہ مڑے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے حذیفہ کو دیکھنے لگے جیسے ان کے سامنے انسان کی جگہ بھوت کھڑا ہو۔

"میرا خیال ہے، یہ کافی، انابیہ سے ملنے کے لیے۔" وہ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے انہیں دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے بے ساختہ قریب کی دیوار کا سہارا لیا۔ حذیفہ گہرا سانس لے کر ان کے پاس آیا۔

"میرا خیال ہے کہیں بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔"

وہ ان کے سامنے سر جھکائے بالکل خاموش بیٹھے تھے جبکہ وہ بھی خاموشی سے ان کے بولنے کا منتظر تھا۔

"جب میں آپ کے پاس آیا تھا تب آپ نے سرے سے ماننے سے انکار کردیا تھا تو اب یوں آنے کا مقصد؟" سعید صاحب کی سوالیہ نظریں اس پر جمی تھیں۔

"انکار کرنے سے حقیقت بدل تو نہیں جاتی۔" اس کی بات پر سعید صاحب استہزائیہ مسکرائے۔

"ایک وجود کی حقیقت اس رشتے سے انکاری ہونا آپ کو عام بات لگ رہی ہے۔ لیکن میں بھی سمجھ نہیں سکا۔ پہلے انکار اور اب یوں اتنی بے تابی۔"

ان کے کہنے پر حذیفہ نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"ماضی میں جو ہو چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ میں کیا ہر کوئی اس کے وجود سے انکاری ہے، ہم نے عفت گل کی وجہ سے بہت کچھ سہا ہے جب آپ آئے اور عفت گل کی بیٹی کی بات کی تو مجھے اس وقت وہ انکار بہتر لگا تھا لیکن اس دن انابیہ کو وہاں دیکھ کر میں خود کو روک نہیں سکا۔ جو زندگی وہ جی رہی ہے، وہ اس کے شایان شان نہیں۔"

"واہ!" اس کی بات پر سعید صاحب استہزائیہ انداز میں مسکرائے۔ "یہ طرز زندگی بھی آپ لوگوں کی

دین ہے۔ کون اپنے گھر کی عزت کو یوں رلنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ گناہ گار اس کی ماں تھی اور اس کی سزا وہ بھگت چکی ہے۔ کینسر تھا اسے تڑپ تڑپ کر اس نے جان دی ہے۔ لیکن انابیہ، وہ تو معصوم تھی بے قصور تھی۔ آپ لوگوں کا خون تھی جسے آپ کے گھر کی عورتوں نے ناجائز بنادیا۔ اس کا باپ کون تھا۔ آپ جانتے ہیں۔ ایک مرتی ہوئی عورت کم از کم اپنی اولاد کے بارے میں جھوٹ نہیں بولے گی۔ آج آپ دعوے دار بن کر آگئے ہیں پہلے آپ کہاں تھے۔ جب اس کی عزت اور جان ڈاؤ پر لگی تھی۔ عفت گل کہاں کہاں دربدر نہیں ہوئی اس کی جان بچانے کے لیے صرف آپ لوگوں کی بے حسی کی وجہ سے عفت گل نے کتنے فون کیے تھے آپ کے گھر مدد کے لیے لیکن الٹا اسے ذلیل کیا گیا۔

"یہ جھوٹ ہے ایسا نہیں ہوسکتا۔" اس الزام پر وہ تڑپ کر بولا۔

"یہ سچ ہے اپنے گھر کی عورتوں سے پوچھیے گا۔" تب آپ بھی چھوٹے تھے آپ کو علم نہیں ہوگا اس بات کا اور آخری کیل تو اس بچی کی قبر پر آپ کے باپ اور تایا نے لگائی اسے اس نام نہاد رشتے میں باندھ کر آج تک وہ بچی انتظار کی سولی پر لٹک رہی ہے۔ کیا قصور ہے اس کا بس یہی کہ وہ جیلانی خاندان کی ایسی غلطی ہے جسے کوئی ماننے کو تیار نہیں۔ ہر رشتہ ہونے کے باوجود میری بچی نے کتنی محرومیاں دیکھی ہیں مجھ سے پوچھیں۔ وہ کہتے ہوئے رو پڑے تھے۔

"صورت دیکھی ہے اس کی کتنی معصوم ہے۔ شہزادیوں کی آن بان والی میری گڑیا جس کا باپ تو محلوں کا رہنے والا تھا پر بیٹی کو لاوارث چھوڑ گیا۔"

"انکل پلیز۔" حذیفہ تکلیف سے بولا۔

"بولنے دو بچے! آج اگر دعوے دار بن کر آئے ہو تو سنو بھی۔ وہ تم لوگوں کی عزت تھی ذمہ داری تھی۔ اتنا حسن ہو تو نظروں میں آ ہی جاتا ہے۔ سوچو کیسے کیسے میں نے اسے دنیا کی نظروں سے بچانے کی کوشش کی ہے لیکن میں اس کا سرپرست تھا سگا خون کا رشتہ نہیں تھا میرا اس سے۔ لوگوں نے کیا کیا باتیں نہیں کیں لیکن میں نے پروا نہیں کی صرف اس آس پر کہ اس کے اپنے ہیں جن کے ملتے ہی وہ محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن ہوا کیا۔ اس نے اپنوں نے اس کے وجود سے انکار کردیا۔"

سعید صاحب کی طنزیہ نظریں خود پر محسوس کر کے حذیفہ ہونٹ بھینچ گیا۔

"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے اس لیے میں یہاں ہوں۔"

"مجھ سے اب کیا چاہتے ہیں۔"

"میں انابیہ کو ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔" حذیفہ کے کہنے پر سعید صاحب کتنی دیر اس کا چہرہ دیکھتے رہے۔

"آپ کے گھر والوں کو انابیہ کا پتا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بہت فرق پڑتا ہے۔ کیا انہیں پتا ہے آپ انابیہ سے ملے ہیں اور اسے یہاں سے لینے آئے ہیں۔"

حذیفہ نے گہرا سانس لیا۔" ابھی وہ نہیں جانتے اور میں ابھی ان سے بات بھی نہیں کر رہا۔"

اب کی بار سعید صاحب نے گہرا سانس لیا۔

"تو میری طرف سے معذرت میں انابیہ کو مزید کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا گناہ ہے اس کا کہ وہ ساری دنیا سے چھپ کر رہے اسے اپنانے میں شرم آئے گی آپ کے گھر والوں کو۔"

حذیفہ بالکل چپ تھا۔ شاید جس بات کو وہ اتنا آسان سمجھ رہا تھا وہ اتنی بھی آسان نہیں تھی۔

"انابیہ آپ کی امانت ہے پہلے بھی وہ میرے پاس امانت کے طور پر تھی، اب بھی آپ کی امانت ہے لیکن ایسے نہیں اسے پورے رسم و رواج کے ساتھ لے کر جائیں۔ دنیا کو پتا چلے وہ لاوارث نہیں، یوں چھپ چھپا کر اسے میں آپ کے حوالے نہیں کرسکتا۔"

"ٹھیک ہے میں گھر میں بات کر کے انہیں لے کر آتا ہوں۔" حذیفہ ہار مانتے ہوئے بولا۔

pklibrary.com

"لیکن میں انابیہ کو بتا سکتا ہوں کہ میں کون ہوں۔"

"نہیں" سعید صاحب ٹھوس انداز میں بولے۔

"لیکن کیوں؟" وہ ناراضی سے بولا۔

"پہلے اپنے گھر میں بات کریں۔ اگر آپ کے گھر والے مان جاتے ہیں تو جو آپ کی مرضی ہوگی۔ میں منع نہیں کروں گا۔ لیکن اگر آپ انابیہ کو اپنے بارے میں بتائیں گے اور کل کو آپ کے گھر والے نہیں مانتے تو میری بیٹی ٹوٹ جائے گی۔ پہلے ہی وہ بہت تکلیف میں ہے۔"

ان کی بات وہ سمجھ گیا تھا اس لیے سر ہلا گیا۔

"لیکن تب تک مجھے انابیہ سے بات کرنے کی ملنے کی اجازت ہے نا کیونکہ آپ تو جانتے ہیں نا میرا اس سے کیا رشتہ ہے۔" وہ بہت امید سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

سارے حق ہونے کے باوجود وہ ان کی اجازت کا طلب گار تھا کیونکہ سعید صاحب کا حق تھا انابیہ پر بے شک بقول ان کے کہ ان کا اس سے خون کا رشتہ نہیں لیکن انہوں نے اس کے لیے خون کے رشتے سے زیادہ کیا تھا اس کی امید دیکھ کر سعید صاحب انکار نہیں کر سکے تھے۔

☆☆☆

وہ کب سے اسے دیکھ رہی تھی، جو موبائل کو دیکھتے مسکرا رہا تھا اس کا انہماک اتنا زیادہ تھا کہ پاس لیٹے بچے کی رونے کے آواز بھی اس کا انہماک نہیں توڑ سکی تھی۔

"غفران!" تنگ آ کر اسے آواز دینی پڑی تھی۔ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

"انو کب سے رو رہا ہے اور تم پتا نہیں فون میں کون سا خزانہ کھوج رہے ہو۔" غفران نے پہلے گردن گھما کر اپنے دائیں طرف دیکھا اور پھر ناگواری سے سامنے بیٹھی عورت کو دیکھا۔

"تم میری توجہ انو کی طرف کروا رہی ہو اور خود اتنی دیر سے کیا تماشا دیکھ رہی ہو۔ اٹھا لینا تھا بچے کو۔" اس نے کہنے کے ساتھ قریب لیٹے بچے کو اٹھا لیا۔

"کیوں یہ صرف میرا ہی بچہ ہے۔ تمہارا کچھ نہیں لگتا۔" جواباً وہ ماتھے پر بل ڈال کر غصے سے بولی۔

غفران اس کو جواب دیے بغیر دانت پیستے ہوئے دوبارہ موبائل دیکھنے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا موبائل میں ایسا کیا ہے جو تمہاری نظر نہیں ہٹ رہی۔" اب وہ صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف آ رہی تھی۔ غفران نے جلدی سے موبائل بند کر کے اپنے ٹراؤزر کی جیب میں رکھا اور بچے کو دوبارہ بیڈ پر لٹایا۔ "مجھے تمہاری یہ عادت بالکل پسند نہیں ہر وقت روک ٹوک یہ مت کرو۔ وہاں مت جاؤ یہ مت دیکھو میں کیا سکون سے موبائل بھی نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے کھڑے ہوئے بمشکل خود کو چیخنے سے روکا تھا۔

"تمہیں تو کافی عرصے سے ہر بات ہی روک ٹوک لگ رہی ہے۔ شاید میں ہی زہر لگ رہی ہوں۔"

اس کے کہنے پر غفران نے سرسری سی نظر اس کے چہرے پر ڈال کر کوفت سے منہ موڑ لیا اور اس کا ایسا کرنا شہلا کو آگ لگا گیا تھا۔

"چل کیا رہا ہے تمہارے دماغ میں؟" وہ ایک دم اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور غور سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے لگی۔ غفران نے بے ساختہ گہرا سانس لے کر خود کو ریلیکس کیا۔

"شہلا! کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں ہر وقت مجھ پر شک کرتی ہو۔" اب کے اسے کندھوں سے تھام کر وہ بڑے پیار سے بولا۔

"شک نہ کروں تو کیا کروں۔ ہفتوں تو ملک سے باہر رہتے ہو گھر آ جاؤ تو سارا دھیان موبائل پر، مجھ پر اور انو پر توجہ دینا ہی چھوڑ دی ہے تم نے۔"

"یار کیسی باتیں کرتی ہو تم میری بیوی ہو اور میں کیسے اپنی بیوی اور بیٹے کو اگنور کر سکتا ہوں۔ بس کام کی ٹینشن ہے تمہیں تو پتا ہے۔ میرا کام کیا ہے۔"

''کام کی بات مت کرو۔ غفران! پانچ سال پہلے بھی تمہارا یہی کام تھا۔ تب تو تم سب کچھ چھوڑ کر میرے اردگرد ہی گھومتے تھے اور بھائی سے بھی میں پوچھتی رہتی ہوں۔ وہ بھی ہر وقت تمہاری شکایت کرتے ہیں کام میں تم کچھ دھیان نہیں دیتے ہاں البتہ پیسہ خوب اڑا رہے ہو۔'' اب کے وہ ابرو اچکا کر بولی۔

''غفران نے زیر لب اپنے سالے کو گندگی گالی دی تھی۔''

''کچھ کہا تم نے؟'' شہلا نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

''کچھ نہیں تمہارے بھائی کو تو میں شروع سے میں پسند نہیں اس لیے۔ میرے خلاف تمہارے کان بھرتے رہتے ہیں جہاں تک پیسے اڑانے کی بات ہے تو میں پاکستان تمہارے لیے گھر بنوا رہا ہوں سوچا تھا تمہیں سرپرائز دوں گا لیکن تمہارے بھائی کو کہاں میری خوشی برداشت ہوتی ہے۔'' اب کے وہ منہ بنا کر افسردگی سے طاری کرتے ہوئے بولا۔

''واقعی'' شہلا خوش ہو کر اس کی طرف بڑھی۔

''ہاں!'' وہ بمشکل مسکرایا۔ ''تو اس دفعہ میں بھی تمہارے ساتھ پاکستان جاؤں گی۔'' اس نے خوشی خوشی اپنا پلان بتایا جس میں غفران کو اپنا پلان ڈوبتا نظر آنے لگا۔

''نہیں بے بی! اس دفعہ تو میں اکیلا جاؤں گا۔ گھر بننے میں تو ابھی وقت ہے جب تیار ہوگا تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

وہ کسی صورت اس کو ساتھ لے کر نہیں جا سکتا تھا۔

''اب چھوڑیہ باتیں چلو تمہیں شاپنگ کرا دوں میں نے ایک ڈریس دیکھا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے لگا اس میں میری بے بی کمال لگے گی۔''

''میں ویٹ کر رہا ہوں تم تیار ہو کر آجاؤ۔'' وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

جب اس نے اس سے شادی کی تھی نا تو اسے اس سے محبت تھی اور نہ ہی وہ اسے پسند تھی۔ یہ رشتہ صرف بزنس پوائنٹ آف ویو تھا۔

سات سال پہلے اس نے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی جوائن کی تھی۔ جو ٹرانسپورٹ کی آڑ میں سارے غیر قانونی دھندے کام کرتے تھے وہ ان کا ساتھ دیتے دیتے ان کا وفادار بن گیا۔ گھر میں آنا جانا تھا۔ تب ہی حامد جو اس کا مالک تھا۔ اپنی بہن کی وجہ سے پریشان تھا جو شادی کے ایک سال بعد طلاق لے کر آگئی تھی۔

غفران جانتا تھا حامد کو اپنی بہن سے کتنا پیار ہے۔ وہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت شہلا کی طرف بڑھا تھا۔ شہلا کی صورت میں وہ وفادار ملازم کے بجائے اس کے بزنس کا آدھا مالک بن سکتا تھا۔

شہلا کو اپنے جال میں پھانسنے کے لیے زیادہ کوشش نہیں کرنی پڑی وہ بہت معمولی شکل کی مالک تھی۔ بے حد چھوٹی آنکھیں، چپٹی ناک موٹے ہونٹ اور گہرا سانولا رنگ اور عمر میں غفران سے بڑی تھی۔

ایسی صورت میں جب غفران اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے ساتھ اس کا رشتہ بھی مانگ رہا تھا تو شہلا اور اس کے بھائیوں کو اور کیا چاہیے تھا۔ فوراً رشتہ ہو گیا اور غفران جو چاہتا تھا وہ مل گیا۔ کھلا پیسہ۔۔۔ اور طاقت کا نشہ جب سر پر چڑھتا ہے تو انسان کو فرعون سمجھ بیٹھتا ہے۔ وہ ہر کام کرتا تھا جو وہ چاہتا تھا۔ وہ فطرتاً عیاش اور حسن پرست تھا۔ شہلا تو صرف کامیابی کی سیڑھی تھی۔

لیکن یہ سب وہ شہلا اور اس کے بھائیوں سے چھپ کر کرتا تھا کیونکہ پتا لگنے کی صورت میں وہ جانتا تھا کہ اس سے یہ عیاشی کی زندگی چھن جائے گی۔ سب کچھ ایسے ہی چلتا رہتا اگر انابیہ اس کی نظروں میں نہ آتی۔

وہ پہلی لڑکی تھی جسے دیکھ کر حاصل کرنے سے زیادہ اسے پانے کی آرزو دل میں آئی تھی۔ وہ اسے زور زبردستی سے حاصل کر سکتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں وہ اسے اپنا اصل روپ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ وہ پچھلے دو سال سے بڑے صبر کے ساتھ اس کی ہاں کا انتظار کر رہا تھا یہ الگ بات ہے کہ اس سے ہاں کہلوانے کے لیے اسے اس کی راہ میں کتنے کانٹے بچھانے پڑے تھے۔ لیکن جو بھی تھا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا اس نے مسکرا کر پیار سے انابیہ کی تصویر کو دیکھا جو منگنی والے دن ندا نے کھینچ کر بھیجی تھی۔

"یہ کون ہے؟" پیچھے سے آتی آواز پر نا صرف اس کی مسکراہٹ سکڑی تھی بلکہ دل کی دھڑکن بھی مدھم ہو گئی تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر شک دیکھ کر وہ بمشکل مسکرایا۔

"یہ ندا اور شائنہ کی کزن ہے آپا کے گھر رہتی ہے۔ بے چاری یتیم اور مسکین ہے اس کی منگنی کی تصویر ہے۔ گھر میں فنکشن تھا اور شائنہ نے مجھے بھی بھیج دی۔"

وہ بولا تو شہلا نے ہاتھ بڑھا کر موبائل لیا وہ اب بڑے غور سے تصویر کو دیکھ رہی تھی۔

غفران نے شکر کیا کہ اس تصویر میں وہ انابیہ کے ساتھ نہیں تھا۔

"بڑی خوب صورت لڑکی ہے۔" شہلا تعریف کر رہی تھی لیکن منہ کے زاویے بگڑے تھے جو ہر خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر بگڑتے تھے۔

"تمہارا کیا کام غیر لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔" اس نے ناگواری سے غفران کو دیکھنے کے بعد تصویر ڈیلیٹ کر دی تھی اور غفران بے بسی کے مارے مٹھیاں بھینچ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

نیچے سے آتی فوزیہ کی تیز آواز پر پہلے وہ حیران ہوئی اور پھر پریشان ہو کر کھڑی ہو گئی۔ سعید صاحب کی آواز سے اسے اندازہ ہوا کہ فوزیہ سعید صاحب کے ساتھ اونچی آواز میں بات کر رہی تھیں۔ اسے تو پہلے ہی فوزیہ سے خوف آتا تھا۔ اس لیے نیچے جانے کے بجائے وہ ہاتھ مسلتی وہیں سعید صاحب کا انتظار کرنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سعید صاحب اوپر آ گئے لیکن فوزیہ کے چلانے کی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

"بابا! کیا ہوا آنٹی کیوں غصہ کر رہی تھیں۔"

"کچھ نہیں بالکل پاگل عورت ہے دورے پڑتے رہتے ہیں۔"

سعید صاحب پہلی دفعہ کافی غصے سے بولے تھے ان کو غصے میں دیکھ کر انابیہ خاموش ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ تب ہی انہوں نے ہاتھ میں پکڑے شاپر انابیہ کی طرف بڑھائے۔

"یہ رکھ لو۔" انابیہ نے حیرت سے ان شاپرز کو دیکھا۔

"بچہ اتنے خلوص سے لایا تھا۔ انکار کرنا اچھا نہیں لگا ویسے بھی مجھے وہ بہت پسند ہے بڑا نیک شریف بچہ ہے۔"

سعید صاحب اگر اس کی تعریف کر رہے تھے تو وہ واقعی تعریف کے قابل ہوگا ایسا انابیہ کو لگا تھا۔

"اور وہ فوزیہ کہ رشتے کی بات کروں۔ اب بتاؤ میں کیسے اس لڑکے کو کہوں۔ اسے دیکھ کر ہی لگتا ہے وہ بہت بڑھا لکھا اور امیر گھرانے سے ہے اور دوسرا اس نے مجھے بتایا اس کا رشتہ کہیں طے ہے پر یہ عورت سمجھتی نہیں۔ کہتی ہے میں نہیں چاہتا۔ اس کی بیٹیوں کا اچھا رشتہ ہو مجھے تو بس تمہاری فکر ہے اس لیے میں۔"

وہ اپنے دھیان میں بولتے بولتے رکے پھر اسے دیکھا۔

"تم ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ دیکھو میں اب آرام کروں گا۔" وہ کہہ کر اپنے کمرے میں آئے۔ لیکن بیڈ پر لیٹ کر بھی نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

آج جو حقیقت سامنے آئی تھی۔ اس نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ وارث تو پھر زندہ ہو گئے تھے مری ہوئی امید پھر زندہ ہو گئی تھی۔ لیکن وہ غفران کا کیا کرتے جسے وہ آس دلا چکے تھے۔ وہ جانتے تھے وہ جتنا ظالم آدمی تھا وہ تو یہ سن کر پاگل ہو جائے گا اور پتا نہیں انابیہ کے ساتھ کیا سلوک کرے گا اور پھر انابیہ جس کی امید کو انہوں نے خود ختم کیا تھا۔ وہ یہ بھی

جانتے تھے وہ غفران کو کبھی قبول نہیں کر سکے گی بس ان کی خاطر خاموش تھی وہ اب جلد بازی میں کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتے تھے فیصلہ تب ہی ہوتا جب حذیفہ اپنے گھر والوں کو لے کر آتا۔

☆☆☆

وہ بار بار اپنا دھیان پریزینٹیشن کے پوائنٹس کی طرف کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن دماغ اتنا پریشان تھا کہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے اپنی پیشانی کو مسلا تھا۔

دو ہفتے ہو گئے تھے اس کے گھر والے اس سے ناراض تھے وجہ اس کا منگنی سے انکار کرنا اور دوسری بڑی وجہ اس کے انکار پر طالب نے بھی اپنی منگنی منسوخ کر دی تھی۔ اب اس کے کھاتے میں دو دو غلطیاں تھیں۔ اس کا گھر جانا ضروری تھا لیکن ایسے حالات میں جب گھر والے اس سے ناراض تھے تو وہ کیسے انابیہ کی بات کرتا اور جب بات نہیں ہو گی تو کیسے وہ سعید صاحب کے پاس جا سکتا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا کوئی ایسا نہیں تھا جس کو وہ اس راز میں شریک کر سکتا۔

گاڑی سگنل پر رکی تو وہ باہر دیکھتے ہوئے بے توجہی سے نوید کی بات سن رہا تھا تب ہی چونک کر باہر دیکھنے لگا۔

"نوید گاڑی روکو۔" نوید حیرت سے اسے دیکھا اور سڑک کے سائیڈ پر کار روک دی۔

حذیفہ تیزی سے اترا اور سڑک کے پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔ نوید نے کچھ حیرت سے سامنے دیکھا اور پھر آنکھیں چھوٹی کر کے پہچاننے کی کوشش کی وہاں ایک بزرگ آدمی اور ایک لڑکی کھڑے تھے اور وہ وہی تھے۔ جن کے گھر آج کل سر کا بڑا آنا جانا تھا۔ وہ انہیں دیکھتے ہوئے عجیب کشمکش کا شکار ہوا۔

"السلام علیکم!" کی آواز پر سعید صاحب کے ساتھ انابیہ بے ساختہ مڑی تھی۔

"وعلیکم السلام کیسے ہو بیٹا؟" سعید صاحب اسے دیکھ کر خوش ہوئے تھے۔ جبکہ انابیہ کو بھی اسے دیکھ کر اچھا لگا تھا اور اس کی مسکراہٹ کو حذیفہ کے علاوہ سعید صاحب نے بھی بغور دیکھا تھا۔

"آپ یہاں؟" حذیفہ نے انابیہ سے نظریں ہٹا کر سعید صاحب سے سوال کیا جو ایک شاپنگ مارکیٹ کے آگے کھڑے تھے۔

"آپ یہاں؟" سعید صاحب کے پوچھنے پر وہ چونکا جیسے کچھ یاد آیا ہو۔

"یہاں سے گزر رہا تھا آپ پر نظر پڑی تو رک گیا۔" وہ مسکرایا تو سعید صاحب نے سر ہلایا۔

"گھر جا رہے ہیں؟" انہیں خاموش دیکھ کر حذیفہ نے پوچھا۔

"ہاں کسی کیسی یار کے کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"انکل کیسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ چلیں میں آپ کو چھوڑ دوں۔"

"نہیں بیٹا ابھی کوئی سواری مل جائے گی۔"

"وہ مجھے بھی پتا ہے لیکن میں اس وقت فری ہوں۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میں کوئی انکار نہیں سن رہا آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں۔"

قطعیت سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا تو سعید صاحب گہرا سانس لیتے انابیہ کا ہاتھ تھام کر اس کے پیچھے چل دیے۔

نوید نے گہرا سانس لے کر گاڑی کی بیک سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ تب ہی اس کا موبائل بجا تھا۔ نوید نے آنکھیں کھول کر اسکرین پر نظر ڈالی اسکرین پر نظر آتے نام کو دیکھ کر نہ صرف وہ سیدھا ہوا بلکہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"السلام علیکم سر" وہ گلا کھنکھارتے ہوئے بولا۔

"وعلیکم السلام نوید کیسے ہو۔" دوسری طرف سے آتی گھمبیر آواز پر اس نے تھوک نگل کر گلا تر کیا۔

"میٹنگ ختم ہو گئی۔"

"پتا نہیں سر۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"کیا مطلب پتا نہیں۔" دوسری طرف سے

طالب چونکا تو نوید نے اپنی زبان دانتوں تلے دبائی اس کی خاموشی پر طالب کے ماتھے پر بل پڑے تھے۔

"حذیفہ کہاں ہے؟" اس کے سوال پر نوید پریشانی سے اس تنگ گلی کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں حذیفہ گیا تھا۔

"نوید میں کچھ پوچھ رہا ہوں اور مجھے کوئی آئیں بائیں شائیں میں جواب نہیں چاہیے مجھے سچ سننا ہے۔"

"سر پلیز آپ حذیفہ سر کو نہیں بتائیں گے کہ میں نے آپ کو کچھ کہا ہے میری نوکری کا سوال ہے۔" اس کی بات پر طالب نے بمشکل اپنے غصے کو کنٹرول کیا تھا۔

"او کے بولو۔"

"سر کافی عرصے سے حذیفہ سر کا ایک گھر میں بہت آنا جانا ہے اور وجہ مجھے وہ لڑکی لگ رہی ہے۔ جس کے لیے سر نے ابھی بھی میٹنگ کینسل کردی ہے اور اس سے پہلے بھی وہ ایسا کئی بار کر چکے ہیں ہر دو تین دن بعد وہ شام میں جلدی میں چلے جاتے ہیں اور مجھے لگتا ہے وہیں جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کافی چیزیں بھی لے کر جاتے ہیں برینڈڈ کپڑے مہنگے تحفے اور تو اور ہاسپٹل کے بل بھی وہی پے کرتے ہیں۔"

نوید اب کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کر رہا تھا۔ گھر میں پہلے ہی اس کی منگنی سے انکار کی وجہ سے سب پریشان اور ناراض تھے لیکن طالب کو اب سمجھ میں آرہا تھا کہ اس نے کیوں کوئی وضاحت نہیں دی، کیوں گھر والوں کی ناراضی کی پروا نہیں کی۔ وہ لڑکی اس کے لیے اتنی اہم ہوگئی تھی کہ وہ گھر والوں کے ساتھ کام کو بھی نظر انداز کر رہا تھا۔

"کب سے مل رہا ہے اس سے۔" جب بولا تو اس کی آواز بہت سخت تھی۔

"یہی کوئی دو تین ماہ سے۔"

"لڑکی رہتی کہاں ہے اور کیا کرتی ہے۔"

"سر حذیفہ سر ابھی بھی ان کے گھر میں ہیں۔ یہ علاقہ کافی پسماندہ ہے لڑکی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن لڑکی بے حد خوب صورت ہے۔"

طالب نے آنکھیں بند کیں۔

"میں کل اسلام آباد آرہا ہوں۔ حذیفہ کو مت بتانا۔"

"سر! میری ریکوئسٹ ہے حذیفہ سر کو پتا نہ چلے کہ میں نے آپ کو کچھ بتایا ہے۔" وہ بہت ڈر رہا تھا۔

"مجھے پتا ہے مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں آگے بھی کچھ ہوتا ہے۔ مجھے انفارم کرتے رہنا۔" کہنے کے بعد اس نے فون آف کردیا لیکن وہ کتنی دیر غصے سے اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں وہیں بیٹھا رہا۔

☆☆☆

بیل دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ دروازہ پہلے سے کھلا تھا۔ اس وقت سامنے صحن میں رکھے صوفوں پر سب موجود تھے۔ ایک شخص جو حذیفہ کے لیے اجنبی تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا تو حذیفہ نے سوالیہ نظروں سے سعید صاحب دیکھا تو چونکا اور دوسری بے ساختہ نظر انابیہ پر ڈالی جو سہم کر سعید صاحب کے ساتھ لگی تھی۔

"بڑی سیریں ہو رہی ہیں، میں نے سوچا اچانک جا کر سرپرائز دوں گا لیکن یہاں تو پہلے سے سرپرائز تیار ہے۔"

سعید صاحب سے کہہ کر اس نے ایک چبھتی نظر حذیفہ پر ڈالی تو حذیفہ نے ناسمجھی سے اس کے انداز کو دیکھا۔

"چچا جی! آپ تو وہیں جم گئے ہیں لگتا ہے میرے آنے کی خوشی نہیں ہوئی۔" وہ کہنے کے ساتھ خود بھی چلتا ہوا آکر ان کے سامنے کھڑا ہو گیا تو سعید صاحب لگنے والے جھٹکے سے تھوڑا سنبھلے تھے۔

"کیسے ہو؟"

"آپ کے سامنے میں ٹھیک ٹھاک تعارف نہیں کروائیں گے۔ ان حضرت کے ساتھ جن کے ساتھ نا صرف آپ بلکہ آپ کی باپردہ بیٹی بھی کھلے عام گھوم پھر رہی ہے۔" غفران کے کہنے پر حذیفہ نے ماتھے پر بل ڈال کر ناگواری سے اس آدمی کو دیکھا۔

"یہ میرے عزیز دوست کا بیٹا ہے۔ مجھ سے ملنے آیا ہے۔" سعید صاحب نے مجھ پر زور دے کر کہا۔

"اچھا!" وہ اچھا کو لمبا کھینچ کر بولا۔

"اب لگ رہا ہے چچا جی میرا تعارف تو نہیں کروائیں گے تو میں خود ہی اپنا تعارف کروا دیتا ہوں میں غفران! انابیہ کا ہونے والا شوہر۔"

اس نے کہنے کے ساتھ ہاتھ بڑھایا لیکن حذیفہ کے سر پر تو جیسے دھماکا ہوا تھا۔ اس نے بے یقین نظروں سے سعید صاحب کی طرف دیکھا اور اس کا مطلب سمجھ کر انہوں نے بے ساختہ انداز میں نا صرف نظریں چرالی تھیں بلکہ سر بھی جھکا لیا تھا۔

اس نے دوسری نظر انابیہ پر ڈالی جہاں صرف ڈر تھا کوئی اور تاثر نہیں تھا۔ حذیفہ نے دوبارہ غفران کو دیکھا جو آنکھیں چھوٹی کیے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے دیکھنے پر مسکرایا۔

"لگتا ہے شدید جھٹکا لگا ہے آپ کو، یقیناً نہیں بتایا ہوگا اور آپ نے بھی لگتا ہے بڑا کچھ سوچ لیا ہوگا۔ تب ہی آپا تاریخیں نہیں بڑا آنا جانا ہے یہاں پر بڑے تحفوں کا تبادلہ ہو رہا ہے جبکہ میں پچھلے دو سال سے خوار ہو رہا ہوں۔ لیکن مجھے تو کبھی گھاس نہیں ڈالی لیکن آپ کو دیکھ کر پتا چلتا ہے امیر آسامی ہیں اور اوپر سے جوان ہونے کے ساتھ خوب صورت بھی ہیں۔"

حذیفہ نے دانت پر دانت جما کر خود کو کچھ بھی کہنے سے روکا تھا۔

"لیکن پتا ہے قصور اس بے چاری کا بھی نہیں فطرت نہیں بدلتی بیٹی ماں کا عکس ہوتی ہے۔ یقیناً اس نے آپ کو اپنی بپتی ماں کی عیاشیوں کی داستان بھی نہیں سنائی ہوگی کوئی بات نہیں میں بتا دوں گا۔ نہیں تو گلی میں موجود کسی بندے کو روک کر پوچھ لیں اس کی ماں کے بارے میں وہ بتا دے گا۔ گندہ خون گندہ ہی رہتا ہے۔"

اس نے غصے اور نفرت سے انابیہ کو دیکھا تو حذیفہ کا خود پر ضبط ختم ہوا تھا اس نے کھینچ کر تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

"خون تمہارا گندہ ہے جو اس شریف اور نیک لڑکی پر اتنے گندے الزام لگا رہے ہو۔"

غفران شاید اس تھپڑ کے لیے تیار نہیں تھا تب ہی کچھ پل گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے حذیفہ کو دیکھتا رہا اور اگلے ہی پل اس نے آگے بڑھتے ہی حذیفہ کا گریبان تھام لیا تھا۔

انابیہ ڈر کے مارے رونے لگی تھی۔ سعید صاحب کے ساتھ شکیل بھی تیزی سے آگے بڑھا فوزیہ جو پہلے ہی غفران کو اچھا خاصا بھڑکا چکی تھیں۔ غفران کو یوں بے قابو ہوتے دیکھ کر گھبرا کر آگے بڑھیں۔

جس دن غفران نے انابیہ کی وجہ سے ان سے بدتمیزی کی تھی اس دن سے وہ اس کے خلاف دل میں بغض لے کر بیٹھیں۔ وہ بظاہر خاموش تھیں کسی موقع کی تلاش میں تھیں۔ جس سے فائدہ تھا کہ وہ غفران کے دل میں انابیہ کے لیے نفرت اور بے اعتباری پیدا کر سکیں اور وہ موقع انہیں حذیفہ کی صورت میں مل گیا تھا۔ انابیہ شریف تھی، باکردار تھی وہ یہ بہت اچھے سے جانتی تھیں لیکن اس کی ماں کا حوالہ ایک ایسا ناگ تھا جو اس کی ساری زندگی کی خوشیوں کو نگل سکتا تھا۔ حذیفہ نے ان کی بیٹی کے لیے انکار کیا تھا تو وہ کیسے اسے بھی بخش دیتیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب غفران انابیہ کے کردار کی دھجیاں اڑا رہا تھا تو انابیہ کی کٹھے کی مانند سفید پڑتی رنگت انہیں کتنی خوشی دے رہی تھی۔ لیکن بات ہاتھا پائی تک آجائے گی یہ انہوں نے سوچا نہیں تھا۔

"بیٹا! تم جاؤ۔" سعید صاحب بمشکل اسے کھینچتے ہوئے لے کر آئے تھے۔ طیش کے مارے حذیفہ کا رنگ بالکل لال ہو گیا تھا۔ جبکہ غفران کی قمیض کے بٹن ٹوٹ چکے تھے اور ہونٹ کا کنارہ پھٹ چکا تھا۔

"حذیفہ نے باہر نکلنے سے پہلے ایک نظر انابیہ پر ڈالی جو روتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ

مٹھیاں بھینچے باہر نکل گیا۔

سعید صاحب نے انابیہ کو اوپر جانے کا اشارہ کیا اور اس کے اوپر جاتے ہی وہ حذیفہ کے پیچھے گئے تھے۔

"رکو حذیفہ!" وہ غصے میں تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا جب سعید صاحب کی آواز پر رکا۔

"میں پوچھ سکتا ہوں انکل یہ سب کیا تھا وہ آدمی کون ہے جو خود کو انابیہ کا ہونے والا شوہر کہہ رہا ہے۔ اور آپ کے سامنے کہہ رہا تھا مطلب آپ کی مرضی سے کہہ رہا تھا۔"

وہ خود کو بہت کنٹرول کر کے اپنا لہجہ بدتمیز ہونے سے روک پایا تھا۔

"مرضی سے نہیں مجبوری میں کیا یہ۔" وہ غم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

"میں پوچھ سکتا ہوں ایسی کون سی مجبوری تھی جس کی وجہ سے آپ نکاح پر نکاح کروانے جا رہے تھے۔"

وہ دانت پیس کر بولا تو سعید صاحب نے دکھ اور افسوس کے ساتھ اسے دیکھا۔

"میں آیا تھا آپ کے پاس، میں نے مجبوری بھی بتائی تھی آپ کو۔ میں مزید اس کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ بوڑھا ہوں اور بے بس بھی، یہ آدمی بہت عرصے سے انابیہ کے پیچھے تھا۔ میں جانتا ہوں کوئی جوڑ نہیں لیکن وہ اسے اپنانے کو تیار تھا۔ اپنا نام دے رہا تھا جبکہ آپ لوگوں کا تو نام جڑا تھا انابیہ کے ساتھ پر پھر بھی آپ نے اپنانے سے انکار کر دیا، آپ نے ہی مجھے کہا تھا۔ وہ آزاد ہے۔ مجھے بتائیں میں کیا کرتا اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں شادی کے لیے نہ مانا تو وہ دوسری صورت میں بھی انابیہ کو حاصل کر سکتا ہے، میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور یہ سچ ہے میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں بہت ڈر گیا تھا۔ ساری عمر اس بچی نے اپنی عزت کی حفاظت کی اپنے محرم کے انتظار میں اور محرم نے جب آزاد کر دیا تو پیچھے کیا بچا۔ میں اس کو مزید انتظار کی سولی پر نہیں لٹکا سکتا تھا۔"

"انکل! اگر میں نے کچھ الٹا سیدھا بول دیا تو اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں میں نے تھوڑا وقت مانگا ہے۔ سب ٹھیک کرنے کے لیے۔ اور میرے آزاد کہنے سے وہ آزاد نہیں ہو گئی۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ وہ نکاح اب بھی قائم ہے اور قائم ہی رہے گا مجھے بس تھوڑا وقت چاہیے۔"

"وقت ہی تو نہیں ہے۔" وہ ہارے ہوئے انداز بولے تو حذیفہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"تو کیا آپ نکاح پر نکاح کریں گے۔ اس آدمی کے ساتھ جو اس کی عزت نہیں کرتا اور محبت تو بالکل نہیں کرتا، دیکھ لیا میں نے اور وہ ہماری فیملی کا حصہ ہے۔ میں ایسا بالکل ہونے نہیں دوں گا۔ میں اسے ابھی یہاں سے لے جاؤں گا۔"

اس نے غصے سے قدم پیچھے کی طرف موڑے تو سعید صاحب اس کے راستے میں آ گئے۔

"آپ جذبات میں غلط قدم اٹھا رہے ہیں آج اگر اسے لے جائیں گے اور وہی بات جو مجھے اس قدم کے لیے روک رہی ہے کہ اگر آپ کے گھر والوں نے قبول نہ کیا تین لفظ اور سب ختم، پھر بتائیں کیا بنے گا انابیہ کا مجھے انابیہ کے لیے سارے رشتے چاہئیں وہ محبت چاہیے جس کی وہ حق دار ہے وہ مقام چاہیے جو اس کا ہے عزت چاہیے جس کے انتظار میں اس نے اتنا کچھ سہا ہے۔"

اب کے ان کا لہجہ مضبوطی لیے ہوئے تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن اس آدمی کو انابیہ سے دور رکھیں میں کوئی گندی نظر اس پر برداشت نہیں کر سکتا۔ اب انابیہ آپ کے پاس میری امانت ہے۔ میں جلد آؤں گا۔ سب کو لے کر ان شاء اللہ" وہ کہہ کر رکا نہیں۔

سعید صاحب جھکے کندھوں کے ساتھ واپس مڑے ابھی جا کر انہوں نے ایک اور محاذ سر کرنا تھا۔ تب ہی انہوں نے چونک کر سامنے دیکھا۔ غفران فون کان سے لگائے تیز تیز قدم اٹھاتا باہر آ رہا تھا۔

ان پر ایک تیز نظر ڈال کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔

سعید صاحب نے گہرا سانس لیا کچھ دیر کے لیے خطرہ ٹل گیا تھا۔

انہیں اب حذیفہ کا انتظار تھا وہ ہی اب برسوں کے انتظار کو ختم کر سکتا تھا غفران کے بارے میں انہیں جو غلط فہمی تھی کہ وہ انابیہ کو پسند کرتا ہے اسے خوش رکھے گا وہ غلط فہمی بھی ختم ہو گئی تھی اس کے دل میں کتنا شک تھا انابیہ کو لے کر اس سے شادی کی صورت میں تو انابیہ ہر پل اس گناہ کا بھگتان بھگتے گی۔ جو اس نے کیا بھی نہیں تھا۔

☆☆☆

یہ شاید دسویں کال تھی پہلی تین کالز تک بیل جا رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے جتنی دفعہ کال ملائی فون آف ملا تھا۔ پہلے اسے غصہ تھا لیکن اب اسے پریشانی ہو رہی تھی۔ وہ ہونٹ چباتے کھڑکی سے باہر لان میں لگے درختوں کو دیکھنے لگی۔ جبکہ آنکھیں بے ساختہ نم ہوئی تھیں۔

اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ محسوس کر کے اس کے پیچھے دیکھا جہاں طالب کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں۔

"بھائی! آپ سوئے نہیں؟"

"اگر یہی سوال میں تم سے کروں تو؟" وہ اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"نیند نہیں آ رہی تھی۔" آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے وہ سر جھکا کر موبائل کو دیکھنے لگی۔

"نیند کیوں نہیں آ رہی۔"

"پتا نہیں۔" چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"نگین" وہ جھٹکے سے اٹھا اور جھک کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔ وہ روتے ہوئے اس کے ساتھ لگ گئی تھی۔

"بھائی میرا دل بہت گھبرا رہا ہے کب سے حذیفہ کو فون کر رہی ہوں پہلے وہ فون اٹینڈ نہیں کر رہے تھے۔ اب فون آف جا رہا ہے۔"

"بیٹا! اس میں رونے والی کیا بات ہے ہو سکتا ہے کسی میٹنگ میں ہو اس لیے فون آف کیا ہو۔"

"پہلے تو ایسا کبھی نہیں کیا۔ ہر ویک اینڈ پر گھر ضرور آتے ہیں یہ پہلی بار ہے۔ دو ہفتوں سے وہ گھر نہیں آئے اور میں جانتی ہوں جب سے منگنی کی بات ہوئی ہے تب سے ایسا ہے۔ خود ہی انکار کر کے خود ہی ناراض ہو گئے ہیں۔"

"مما اور چھوٹی مما بھی ناراض تھیں میں تو نہیں تھی مجھ سے تو بات کرتے مجھ سے بھی بات نہیں کر رہے ہیں۔"

طالب اس سے الگ ہو کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"وہ ناراض نہیں نگین بزی ہے۔ تمہیں پتا ہے نا کہ وہ ہر بات کو کتنا سیریس لیتا ہے چاہے کام ہو رشتے۔"

"اگر رشتے اہم ہیں تو ناراض کیوں ہیں۔ منگنی سے منع کیوں کیا۔"

"کیا وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہیں۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر سوالیہ انداز میں بولی۔ طالب نے بولنے کے بجائے نفی میں سر ہلایا۔

"اگر ایسا ہوا بھائی تو میں برداشت نہیں کر سکوں گی۔"

"حذیفہ ایسا نہیں کر سکتا اور اگر اس نے ایسا کچھ سوچا تو میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔"

وہ اب ہلکے ہلکے اس کا سر تھپک رہا تھا۔

ابھی ان کے موبائل پر میسج آیا تھا۔ "نوید" کا نام دیکھ کر اس نے میسج کھولا۔

"سر گھر پر ہیں۔ موڈ نہیں اس لیے کسی سے بات نہیں کر رہے ہیں۔"

"اکیلا تھا؟" طالب نے میسج ٹائپ کیا۔

"جی سر۔"

"اوکے۔" طالب نے گہرا سانس لیا۔ "نوید کا میسج تھا کہ حذیفہ کی میٹنگ تھی اس لیے فون بند تھا۔"

pklibrary.com

وہ ٹھیک ہے فکر مت کرو۔ میں کل جا کر خود اسے لے آؤں گا۔" "تم بھی جا کر آرام کرو اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل برا نہیں کرتے۔" اس نے مسکرا کر اس کا سر زور سے ہلایا تو وہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

وہ ساری رات بے چین رہا تھا ایک پل کے لیے بھی اس کی آنکھ نہیں لگی تھی۔ اس آدمی کی غلیظ نظریں اور گھٹیا باتیں اسے طیش میں مبتلا کر رہی تھیں وہ کرنے کو بہت کچھ کر سکتا تھا لیکن وہ وقتی حل تھا۔

اسے مستقل حل چاہیے تھا اور وہ تھا انابیہ کا اپنا گھر، اپنوں کا ساتھ اور اس کے لیے گھر والوں کو انابیہ کے متعلق بتانا ضروری تھا اور اس لیے اسے گھر جانا تھا۔

اس فیصلے پر پہنچ کر وہ تھوڑا پرسکون ہوا تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے اس کی آنکھ لگی تھی جب موبائل کی آواز پر اس نے غیر دماغی سے بمشکل دکھتی آنکھوں کو کھولا سمجھ آنے پر اس نے موبائل اٹھایا۔ نوید کی کال تھی۔ اس نے آج کی اور اگلے دن کی میٹنگ کینسل کرنے کو کہا اور فون بند کر کے کتنی دیر کرسی مندی سے ہی بیٹھا رہا۔

اسے آج لاہور کے لیے نکلنا تھا۔ لیکن وہ جانے سے پہلے سعید صاحب اور انابیہ کی خیریت بھی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ گھر جانے کا تھا لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے فون نکالا۔

جتنی بیلز جا رہی تھیں، اتنی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی حتیٰ کہ فون بج بج کر بند ہو گیا۔ اس نے پریشانی سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا اور دوبارہ ری ڈائل کیا دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی جو یقیناً انابیہ کی تھی۔

"کیسی ہو انابیہ۔ حذیفہ بات کر رہا ہوں۔"

"میں ٹھیک ہوں آپ کیسے ہیں؟"

"انکل کہاں ہیں؟"

"بابا ابھی نماز پڑھ کر کچھ دیر لیٹے ہیں۔"

"ہنہ" وہ ہنکارا بھر کر چپ کر گیا۔

"میں لاہور جا رہا تھا۔ ایک دو دن لگ جائیں گے تو جانے سے پہلے ملنا چاہ رہا تھا۔" دوسری طرف خاموشی تھی۔

"انابیہ۔" طویل خاموشی پر اسے پکارنا پڑا تھا۔

"میں آپ کو آنے سے منع نہیں کرنا چاہتی لیکن آپ آئیں گے تو فوزیہ آنٹی بدتمیزی کریں گی۔ اور پھر بابا کو اور مجھے تنگ کریں گی۔" حذیفہ نے گہرا سانس لیا۔

"انابیہ، ایک بات پوچھوں سچ بتاؤ گی؟" اس کے انداز پر وہ حیران ہوئی تھی۔

"جی۔"

"کیا یہ منگنی تمہاری پسند سے ہوئی ہے۔"

"بابا نے کہا یہ رشتہ مجھے عزت دے گا اور بابا میرے لیے غلط نہیں کر سکتے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔، انابیہ کیا تمہاری خوشی اس میں ہے۔"

"میری خوشی" وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "بابا نے کہا میرا انتظار لاحاصل ہے۔"

اس کی آواز میں درد محسوس کر کے، حذیفہ کو بہت تکلیف ہوئی تھی۔

"اگر رشتہ محرم ہو تو انتظار لاحاصل نہیں ہوتا۔" اس کے کہنے پر وہ کچھ نہیں بولی تھی۔

"انکل بے شک تمہارا برا نہیں کر سکتے لیکن انہوں نے جو کیا وہ غلط کیا۔ انابیہ! تم جانتی ہو تم کسی کے نکاح میں ہو تم نکاح پر نکاح کیسے کر سکتی ہو۔"

اب کی بار وہ قدرے غصے سے بولا دوسری طرف انابیہ کو لگا زمین اس کے قدموں تلے سے سرک گئی ہو۔

"آپ جانتے ہیں؟" کافی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہوئی تو اس کی آواز میں حیرت تھی۔

"میں سب جانتا ہوں، تمہارے پیرنٹس تمہاری فیملی حتیٰ کہ تمہارے ہسبینڈ کے بارے میں

بھی۔" انابیہ نے بے ساختہ دیوار کا سہارا لیا تھا۔
"بابا جانتے ہیں آپ انہیں جانتے ہیں۔"
"ہاں، میں انہیں بتا چکا ہوں۔"
"پھر انہوں نے کیوں کہا کہ....." وہ آدھی بات کہہ کر رکی تھی۔
"کیا انہوں نے مجھے ڈرائیورس دے دی ہے۔"
"کس نے کہا تمہیں؟" وہ تڑپ کر بولا۔
"بابا نے کہا انہوں نے مجھے آزاد کر دیا بابا مجھ سے جھوٹ کیوں بولیں گے۔"
"وہ جھوٹ نہیں بول رہے لیکن انہیں بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ میری بات سنو انابیہ! تم کسی صورت یہ شادی نہیں کرو گی کیونکہ تم پہلے ہی کسی کے نکاح میں ہو اور تم جانتی ہو ایسا کر کے تم گناہ کرو گی۔ تمہاری فیملی کو تمہاری مدد اور تمہیں لے کر کچھ غلط فہمیاں ہیں جو دور ہوتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور میں کوشش کروں گا سب صحیح کرنے کی لیکن تب تک تمہیں مضبوط رہنا ہوگا۔ کسی صورت یہ شادی نہیں کرنی۔"
"میں بھی یہ نکاح نہیں کرنا چاہتی لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھے اور بابا کو بھی دھمکی دے کر گئے ہیں کہ اگر ان کی بات نہ مانی تو وہ میرے ساتھ۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر رونے لگی تھی۔
حذیفہ نے مٹھی بھینچ کر غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کی تھی۔
"انابیہ! میری بات سنو، تمہیں ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں تمہاری پوری فیملی تمہارے لیے موجود ہے۔ ان کے ہوتے کوئی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ مجھے دو تین دن کا ٹائم دو، میں تمہاری فیملی کو لے آؤں گا۔"
"آپ "ان" کو لے کر آئیں گے۔" وہ بھیگی آواز میں بولی تو غصے کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔
"ہاں ان کے بغیر تو سب ادھورا ہے نا۔" وہ تھوڑا شرارت سے بولا۔
"میں بابا کو بتا دوں۔" وہ معصومیت سے بولی تو حذیفہ نے زیر لب مسکراتے سر ہلایا۔
"نہیں، ان کو کچھ نہیں بتانا بس اپنا خیال رکھنا اور میرا انتظار کرنا اور کوئی بھی بات ہو تو مجھے فون کر دینا۔" "ٹھیک ہے۔"
"جی۔"
"ایک منٹ!" انابیہ کے بولنے پر وہ رکا۔
"کیا وہ آپ کے فرینڈ ہیں؟" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا حذیفہ کو اب اندازہ ہوا کہ وہ اپنے شوہر کے لیے خاص فیلنگ رکھتی ہے۔
"فیملی فرینڈ۔"
"ٹھیک ہے ابھی مجھے نکلنا ہے میں آ کر تم سے تفصیل سے بات کروں گا۔" فون رکھ کر اس نے نوید کو کال کی۔
"نوید! دو تین سیکورٹی گارڈ سول ڈریس میں سعید صاحب کے گھر بھیج دو اور دھیان رہے کہ وہ سعید صاحب اور ان کی بیٹی کی سیکورٹی کے لیے جا رہے ہیں ان کی بل بل کی خبر مجھے ملتی رہنی چاہیے۔" کہہ کر اس نے فون بند کیا۔ اور اپنا بیگ اٹھا کر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

جونہی اس کی کار گیٹ کے اندر داخل ہوئی تھی تب ہی داخلی دروازہ کھول کر طالب باہر آیا تھا اس کو گاڑی سے نکلتا دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا۔ وہ ساتھ والی سیٹ سے اپنا بیگ نکال کر طالب کی طرف بڑھا۔
"پلیزنٹ سرپرائز میں تمہارے پاس ہی آ رہا تھا۔" طالب اس کے گلے لگتے ہوئے بولا۔
"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔" طالب نے بغور اس کی سرخ آنکھیں اور اترا ہوا چہرہ دیکھا۔
"جی بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے زبردستی مسکرا کر اسے مطمئن کرنا چاہا۔ "چلو سب تمہیں دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔" وہ طالب کے ساتھ اندر

داخل ہوا تو گھر والوں کے ساتھ وہاں طالب کے ماموں ممانی اور انعم موجود تھے۔ وہ سلام کر کے سیدھا ماں کے گلے لگا تھا۔

"آ گئی ماں کی یاد اتنے دن بعد" وہ اسے خود میں بھینچتے ہوئے ناراضی سے بولیں۔

"یاد ان کو کیا جاتا ہے جو بھول جاتے ہیں۔ آپ تو ہر وقت میرے دھیان میں رہتی ہیں۔"

"اچھا مجھے تو لگا آج کل تمہارا دھیان کہیں اور لگا ہے۔"

طالب کے بولنے پر اس نے چونک کر اسے دیکھا جو اباوہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔ حذیفہ نے سر جھٹک کر خود کو کچھ بھی کہنے سے روکا۔ اس وقت وہ کسی قسم کی تلخی نہیں چاہتا تھا۔

"اچھا ہو گیا تم آ گئے ورنہ ہم خود تمہیں لینے آجاتے۔" رخسانہ کے کہنے پر وہ ہنس پڑا تھا۔

"مجھے پتا نہیں تھا میں اتنا لاڈلا ہوں۔"

"لاڈلے تو آپ ہیں لیکن اس بار بات کچھ اور تھی۔" قاسم نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"ایسی بھی کیا بات تھی؟" وہ اب بھی کھڑا تھا۔ جبکہ نظریں سب سے ہوتی انعم کے ساتھ بیٹھی نگین پر رک گئیں اس کے دیکھنے پر نگین نے نظریں پھیر لی تھیں۔

"کل انعم اور طالب کی منگنی ہے۔" رخسانہ نے خوشی سے بتایا تو اس کی نظریں بے ساختہ طالب کی طرف گئی تھیں وہ کتنی دیر کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا لیکن ڈھونڈنے سے کوئی تاثر نہیں ملا سوائے مسکراہٹ کے اور مسکراہٹ کا مطلب خوشی ہے اس نے گہرا سانس لیا۔

"کیا ہوا مبارک باد نہیں دو گے۔" طالب نے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے پوچھا۔

"مبارک ہو بھائی!" وہ بھی جواباً مسکرا کر بولا۔

"مجھے لگ رہا تھا آج تم آؤ گے اس لیے تمہاری پسند کا کھانا بنوایا ہے۔" کلثوم نے پیار سے اس کے گال کو چھوا تو ان کی محبت محسوس کر کے وہ مسکرا دیا۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ غیر دماغی سے سب کو سن رہا تھا جبکہ دھیان بار بار موبائل کی طرف جا رہا تھا۔ اسے نوید کے میسج کا انتظار تھا طالب کا سارا دھیان اس کی طرف تھا اور وہ جانتا تھا وہ بار بار موبائل کی طرف کیوں دیکھ رہا تھا۔ نوید اسے سکیورٹی والی بات بتا دی تھی۔

ہم نے تو سوچا تھا گھر میں دو دو فنکشن ہوں گے لیکن حذیفہ کے انکار پر سب ادھورا رہ گیا یہ بات طالب کی ممانی آسیہ نے کی تو اس نے چونک کر نگین کو دیکھا۔ اس کا سر جھکا تھا لیکن وہ جانتا تھا وہ اس سے ناراض ہے۔

"آنٹی میں نے انکار تو بالکل نہیں کیا۔ میں نے صرف ڈیلے کیا تھا اور اس کے لیے میرے پاس وجہ ہے لیکن وہ میں یہاں ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔" آخر میں اس کا لہجہ تھوڑا روکھا ہو گیا تھا۔

ماحول میں ایک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ اس خاموشی میں طالب کی سنجیدہ آواز کافی نمایاں ہوئی تھی۔

"تم نے انکار نہیں کیا لیکن ڈیلے کیا۔ سوال یہ ہے ڈیلے کیوں کرنا چاہتے ہو۔ جبکہ تم جانتے ہو، دیر یا سویر تمہاری شادی نگین سے ہونی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں تھا جہاں تک مجھے یاد ہے تم نے کہا تھا میری وجہ سے تم ڈیلے کر رہے ہو اب تو میں بھی منگنی کر رہا ہوں۔ تو اب،" وہ سوالیہ انداز میں ابرو اچکا کر پوچھنے لگا۔ "کہیں تمہاری نیت تو نہیں بدل گئی۔" اس کے سوال پر اس نے ہونٹ بھینچ لیے کیونکہ سب کی شک بھری نظریں اس پر جم گئی تھیں۔

"آپ کو جو سمجھنا ہے سمجھ لیں۔" کلثوم نے حیرت سے اپنے تابعدار بیٹے کو دیکھا۔

"حذیفہ، تم ہوش میں تو ہو۔" رخسانہ نے

ناراضی سے اسے دیکھا۔

"بڑی مما اور کیا کہوں میں اب وہ ناراضی بولا۔" حذیفہ! تم اچھی طرح جانتے ہو ہمارے گھر کا اصول ہے جو بات بڑوں کے درمیان طے ہو جاتی ہے۔ وہ ہر حال میں نبھائی جاتی ہے یہ ہماری روایت ہے۔ اسی وجہ سے ہم میں اتفاق ہے ہمارے لیے ہم اسے جڑے رشتے کیا اہمیت رکھتے ہیں، تم جانتے ہو اور ہماری فیملی میں بیٹیوں کی کیا ویلیو ہے وہ بھی تم جانتے ہو۔ نگین میری بہن ہے اور میں اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔"

"حذیفہ جو ضبط کیے سب سن رہا تھا ایک دم سر جھٹک کر مسکرا دیا۔

"ابھی ابھی جن روایات کا تذکرہ کیا آپ نے میں سب بچپن سے سن اور دیکھ رہا ہوں۔ مجھے پتا ہے بابا اور تایا ابو کے نزدیک پھوپھو کی کیا ویلیو تھی۔ نگین کی کیا ویلیو ہے۔ صرف ایک سوال ہے میرا۔ اس گھر کی ایک اور بیٹی بھی ہے وہ کہاں ہے کس حال میں ہے۔ کیا اتنے سالوں سے کسی نے یہ پتا کرنے کی کوشش کی ہے۔"

اس نے سوال کرنے کے بعد باری باری سب کی شکل دیکھی۔ سب اس کا سوال سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ شمسہ نے بے ساختہ اپنا ہاتھ ماتھے پر مارا۔ انہیں اندازہ ہونا چاہیے تھا وہ کیسا ڈھیٹ لڑکا تھا جب کوئی بات اس کے دماغ میں گھس جاتی تھی وہ کر کے رہتا تھا۔ کتنا سمجھایا تھا انہوں نے۔ لیکن پھر بھی وہ اس کا ذکر کرنے سے باز نہیں آیا جس کا نام لینا بھی یہاں پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ تیز دھڑکتے دل کے ساتھ آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کرنے لگیں۔

"کس کی بات کر رہے ہو؟" طالب کا غصے سے کھڑا ہونا اس بات کا پتا دے رہا تھا کہ وہ سمجھ چکا ہے کس کی بات ہو رہی ہے۔

"آپ بہتر جانتے ہیں۔" وہ بھی اسی انداز میں بولا۔

"میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔"

"ایک منٹ طالب" کلثوم نے انگلی سے طالب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا تھا اور چلتے ہوئے اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئیں۔

"کس کی بات کر رہے ہو اس عورت کی جو تمہارے باپ اور تایا کی قاتل ہے یا اس کی بیٹی کی جو پتا نہیں کس کی ناجائز اولاد ہے۔"

"ممی!" وہ چیخ اٹھا تھا اور یہ پہلی بار تھا کہ وہ ماں کے آگے یوں بولا تھا۔ کلثوم کے ساتھ باقی سب بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ کلثوم کتنی دیر بے یقینی سے اس کا ضبط سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھتی رہیں اور پھر اگلے ہی پل پوری قوت سے تھپڑ اس کے گال پر پڑا تھا۔ شمسہ کے ساتھ رخسانہ بے اختیار کھڑی ہوئی تھیں۔

"اس عورت کی وجہ سے پہلے بھی میرا گھر برباد ہوا تم طالب، قاسم، نگین سب یتیم ہوئے۔ اس عورت کی وجہ سے اس گھر کا ماحول جہنم بن گیا تھا اور اب ایک بار پھر تم اس کی بیٹی کی بات کر رہے ہو تم اسے نگین سے ملا رہے ہو وہ نگین کی جوتی کے برابر بھی نہیں تمہاری ہمت کیسے ہوئی اسے نگین سے ملانے کی۔"

اب کے انہوں نے طیش کے عالم میں اس کا گریبان تھام لیا تھا۔ "کلثوم ہوش میں آؤ۔" شمسہ نے انہیں کندھے سے تھام کر پیچھے کرنے کی کوشش کی۔

"میں اسے نگین سے نہیں ملا رہا۔ میں صرف یہ کہہ رہا ہوں وہ اس گھر کی بیٹی ہے۔"

"ہم نہیں مانتے۔" اب کے طالب بولا۔

"آپ کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے جس کی بیٹی تھی وہ خود کہہ کر گئے تھے پھر بھی آپ لوگ اپنے خون کو ناجائز کہہ کر گالی دے رہے ہیں اور دوسرا پاپا اور تایا ابا کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جسے آپ لوگوں نے اس عورت پر ڈال دیا۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عنبرین آبدال

انا کی ڈور

کچھ فیصلے، کچھ چیزیں تو ہمارے ہاتھ میں ہوتی ہیں لیکن ہم انہیں خود ٹھکرا دیتے ہیں تو اب یہ خلش کیوں؟ وہ آسمان پہ چمکتے ستاروں کی چھاؤں میں کھڑی اس کیوں پہ آ کر اٹکی تھی۔

"میں یہ سب کیوں سوچ رہی ہوں۔ میں اسے کیوں سوچ رہی ہوں؟" وہ گہرا سانس لے کر دھیرے دھیرے چلتی صحن میں پڑی کرسی پہ بیٹھ کر اپنے سر کو کرسی کی پشت پہ ٹکا کر سیاہ چادر اوڑھے آسمان کو دیکھنے لگی تھی۔

یہ کوئی اتنی پرانی بات تو نہیں تھی۔ جو وہ بھول جاتی۔ آج بھی اسے وہ وقت پوری جزئیات کے ساتھ یاد تھا۔ جب سین آپی کا رشتہ دیکھنے کے لیے وہ لوگ ان کے گھر آنے والے تھے اور اس دن مدیحہ بیگم گھبرائی ہوئی تھیں۔ ہر چیز پرفیکٹ اور صاف ستھری تھی۔ لیکن پھر بھی انہیں کہیں نہ کہیں ان دیکھی دھول یا گرد نظر آ جاتی اور برکہ کی کم بختی آ جاتی۔

"کتنی بار کہا ہے ٹھیک سے کام کیا کرو۔ دیکھو یہاں اس ڈیکوریشن پیس کے پاس کتنی گرد ہے۔" انہوں نے چھوٹی بیٹی کو گھورتے ہوئے کہا۔

"قسم سے امی! آپ بھی ناں۔" برکہ نے ناراضی سے منہ پھلاتے ہوئے صاف حصے کو ایک بار پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے کپڑے سے صاف کیا اور پھر پلٹ کر ماں کی طرف دیکھا۔

"اب ٹھیک ہے۔" اس نے ماں سے تائید چاہی۔

"ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔"

وہ ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے رحمان صاحب کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ بیکری سے سامان خرید کر لائے تھے۔

"میں تو کہہ رہا تھا کہ ہم سیدھا انہیں کھانے پہ انوائیٹ کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ مانتے ہی نہیں۔"

چیزوں کے شاپر مدیحہ بیگم کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے رحمان صاحب نے کہا۔ اور خود صوفے پہ بیٹھ کر سین سے، پانی کا گلاس مانگ کر اپنے فون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ جہاں ان کے دوست کی کال آ رہی تھی۔ جن کے توسط سے ہی آج وہ لوگ سین کو دیکھنے کے لیے ان کے گھر آ رہے تھے۔

سین نے رحمان صاحب کو پانی کا گلاس دیا۔ اور خود جلدی سے سامنے والے کمرے میں گھس گئی تھی۔

☆☆☆

وہ لوگ رشتہ دیکھنے کے لیے آ چکے تھے۔ اب ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتوں میں مشغول تھے کہ جب مسز کامل نے سین کو بلانے کی بات کی۔

"میں ابھی سین کو بلاتی ہوں۔" مدیحہ بیگم کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھیں تو ان کے ساتھ ہی مسز کامل بھی اٹھ کر کھڑی ہوئیں اور ساتھ اپنی بیٹی ثنا کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہم آپ کے ساتھ ہی سین کے کمرے تک چلتے ہیں۔ اصل میں بچی پہلی بار ہم سے ملے گی تو کامل اور شجاع کی موجودگی میں گھبراہٹ کا شکار ہو جائے گی۔ تو اس لیے۔" صبا بیگم نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔ مدیحہ بیگم کی آنکھوں میں حیرانی در آئی تھی۔ انہوں نے اجازت طلب نظروں سے رحمان صاحب کی طرف دیکھا۔

pklibrary.com

ناولٹ

pklibrary.com

"بھابھی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تم ان کو سبین کے کمرے میں لے جاؤ۔" رحمان صاحب نے کہا۔ مدیحہ بیگم نے اپنے دائیں ہاتھ کو آگے کی سمت بڑھا کر صبا بیگم اور ثنا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

صبا بیگم، سبین سے ملیں اس سے چند باتیں کیں اور پھر دلچسپی سے ثنا کے ساتھ باتیں کرتی برکہ کو دیکھنے لگی تھیں۔ جو اس وقت ثنا کو اپنے کالج میں لاسٹ ویک ہونے والے فن فیئر کے بارے میں بتا رہی تھی۔

رشتے کے لیے آنے والے مہمان خوشی خوشی اپنے گھر لوٹ گئے تھے۔ ان کے جانے کے بعد مدیحہ اور رحمان صاحب چائے پینے کے ساتھ ساتھ ان کی باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔

"مجھے تو یہ لوگ بہت اچھے لگے ہیں۔ خاندانی اور پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ تہذیب اور رکھ رکھاؤ والے بھی۔ اچھی فیملی ہے۔ لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ اچھی جاب کر رہا ہے۔ سچ کہوں تو مجھے تو شجاع کا رشتہ اپنی سبین کے لیے دل و جان سے قبول ہے۔ باقی ان لوگوں پر ہے۔ انہیں ہمارا گھر، ہماری سبین کیسی لگی۔" مدیحہ بیگم نے کہا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ باقی جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔ میں ذرا سعادت صاحب کی عیادت کے لیے ان کے گھر جا رہا ہوں۔" رحمان صاحب ہاتھ میں چائے کے کپ کو ٹرے میں رکھتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆

ان لوگوں کو سبین بہت اچھی لگی تھی۔ رضامندی کے فون کے ساتھ کامل صاحب اور ان کی فیملی نے اب رحمان صاحب اور مدیحہ بیگم کو اپنے گھر آنے کا پیغام دیا تھا۔ یوں اس اتوار رحمان صاحب اپنے دوست جمیل اور شریک حیات مدیحہ کے ساتھ کامل صاحب کے گھر آئے تھے۔ گو کہ وہ لوگ ایک بار پہلے بھی شجاع سے اپنے گھر میں مل چکے تھے۔ لیکن ایک بار پھر مل کر رحمان صاحب اور مدیحہ بیگم کو بہت اچھا لگا تھا۔

"ہم آپ لوگوں کو جلد ہی سوچ کر جواب دیتے ہیں۔" رحمان صاحب نے فوری ہاں کرنے کے بجائے ان سے ٹائم مانگا تھا۔

"جتنا سوچنا ہے سوچ لیں۔ جو بھی تحقیقات کروانی ہیں۔ وہ بھی کروالیں۔ لیکن بس اس بات کا دھیان ضرور رکھیے گا۔ جواب ہاں ہی میں ہونا چاہیے۔" کامل صاحب نے ہنستے ہوئے مان بھرے لہجے میں کہا۔

یوں گھر آنے کے تین دن کے بعد باقاعدہ طور پر اس رشتے کے لیے ہاں کر دی تھی۔ اور آنے والے اتوار کو کامل صاحب اپنی فیملی کے ہمراہ باقاعدہ منگنی کی رسم ادا کرنے ان کے گھر تشریف لے آئے تھے اور اس بار ان کے ساتھ چھوٹا بیٹا جہانگیر بھی تھا جہانگیر پچھلے چند دنوں سے اپنے اسٹڈی ویزا کے سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا۔ صبا بیگم نے سبین کی انگلی میں انگوٹھی پہنائی۔ اور دس ہزار اس کے ہاتھ پر رکھ کر کئی نوٹ سبین کے سر سے وار کر صدقہ کر کے سبین کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ پھر اسی روز شادی کی تاریخ طے کرنے کے ساتھ، صبا بیگم نے اچانک ہی برکہ کے رشتے کی بات بھی کر ڈالی۔

"جی۔" مدیحہ بیگم نے حیرانی سے مسکراتی ہوئی صبا بیگم کی طرف دیکھا۔

"اب میں کیا کروں۔ مجھے آپ کی دونوں بیٹیاں ہی اپنی اچھی لگی ہیں کہ دل چاہ رہا ہے۔ دونوں کو ہی اپنے گھر لے جاؤں۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں ہے۔ آپ لوگ بیٹی کے والدین ہیں۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لیں۔" صبا بیگم نے متانت بھرے لہجے میں کہا۔ ابھی تو بڑی بیٹی کی منگنی کی رسم ہونے کے ساتھ ساتھ شادی کی تاریخ بھی دی ہے۔ ایسے میں ان لوگوں کی یہ نئی بات مدیحہ بیگم اور رحمان صاحب کو اچھا خاصا سٹپٹانے پہ مجبور کر گئی تھی۔

"ابھی تو برکہ پڑھ رہی ہے۔ تھرڈ ائیر میں ہے۔ اس کے بارے میں ہم نے ابھی ایسا کچھ نہیں سوچا۔" رحمان صاحب نے گلہ کھنکھارتے ہوئے مدبرانہ انداز میں کہا۔

"چلیں ٹھیک ہے جب بھی آپ برکہ کے بارے میں سوچیں۔ ہمارے بیٹے کو ذہن میں ضرور

رکھے گا۔" کامل صاحب نے کہتے ہوئے پاس بیٹھے جہانگیر کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ جو اس وقت جز بز ہو کر پہلو بدل رہا تھا۔

"جی ضرور۔" رحمان صاحب نے کہا اور پھر وہ شادی میں آنے والے مہمانوں کے بارے میں بات کرنے لگے۔

مدیحہ بیگم نے صبا بیگم کی بات کا جواب دیتے ہوئے کن انکھیوں سے سامنے بیٹھے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ جو شکل وصورت اور پڑھائی کے لحاظ سے شجاع سے بھی آگے تھا۔ مہمانوں کے جانے کے بعد یہ بات مدیحہ بیگم نے رحمان صاحب سے بھی کر ڈالی تھی۔

"لوگ اپنی بیٹیوں کے رشتوں کے لیے اتنے پریشان ہیں۔ پھر بھی اچھے اور معقول رشتے ملنا تو جیسے عذاب بن گیا ہے۔ ہماری بیٹیوں کے گھر بیٹھے اتنے اچھے رشتے آرہے ہیں بلاوجہ انکار کرنا تو کفران نعمت ہوگا۔" مدیحہ بیگم نے رحمان صاحب کے سامنے تمہید باندھی۔

"مطلب۔" رحمان صاحب نے اخبار سے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھی اپنی شریک حیات کی طرف دیکھا۔

"مطلب ہمیں جہانگیر کے رشتے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ دیکھیں ناں جہاں ہم ایک بیٹی کو بیاہ رہے ہیں۔ وہیں اسی گھر میں دوسری بیٹی کو بیاہنے میں کیا حرج ہے۔ اچھا ہے ناں۔ ہماری دونوں بیٹیاں ایک ہی گھر میں جائیں گی۔ اور ہمیں بھی زیادہ ٹینشن نہیں ہوگی۔"

پرجوش انداز میں کہتے ہوئے مدیحہ بیگم نے رحمان صاحب کی جانب دیکھا۔

"لیکن میں نے برکہ کے لیے عادل کے بارے میں سوچا ہوا ہے۔ بھائی صاحب ایک بار خود بھی مجھ سے اس سلسلے میں بات کر چکے ہیں اس کے لیے۔"

"رحیم بھائی نے ایک بار بات کرنے کے بعد دوبارہ سے پھر کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اور ویسے بھی یہ بات انہوں نے تب کی تھی جب برکہ نائنتھ کلاس میں تھی۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک آپ کے بھائی کے گھر سے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی گئی۔ اتنے سالوں میں ایک بار تو فریحہ بھابھی بات کرتیں ناں۔ مجھے لگتا ہے ان لوگوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اس لیے ایسی کسی بات کے پیچھے ایسے اچھے رشتے کو انکار کرنا نری حماقت ہے۔" مدیحہ بیگم اور رحمان صاحب سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"پہلے ہم سبین کی شادی کر لیں۔ تھوڑا اور ایک دوسرے کو جان لیں۔ اگر قسمت میں ہوا تو دوسرا رشتہ بھی یہیں ہو جائے گا۔ باقی جو اللہ کو منظور ہوگا۔ وہی ہوگا۔" رحمان صاحب نے اخبار لپیٹنے کے ساتھ ساتھ بات کو بھی سمیٹا تھا۔

اور پھر سبین کی شادی کی تیاریوں کے دوران مدیحہ بیگم نے صبا بیگم اور ثنا کو ہر لحاظ سے اچھا پایا۔ ایک بار پھر وہ رحمان صاحب کے سامنے آ بیٹھی تھیں۔

"اتنے اچھے سسرال والے ہماری بیٹیوں کو اور نہیں مل سکتے۔ آپ بس ان لوگوں سے کہہ دیں ہمیں جہانگیر کا رشتہ منظور ہے۔" مدیحہ بیگم نے ضدی انداز میں کہا۔

"لیکن بھائی صاحب؟" رحمان صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔

"وہ لوگ ہم سے رشتہ مانگ نہیں رہے۔ ہم لوگ ان کے انتظار میں اتنے اچھے رشتے کو انکار نہیں کر سکتے۔ یہ نہ ہو کل کو ہمیں پچھتانا پڑے۔ آپ بس کامل بھائی سے بات کریں۔ سبین اور شجاع کی مہندی والے دن ہم برکہ اور جہانگیر کی منگنی کی رسم ادا کریں گے۔" مدیحہ بیگم تو جیسے ساری پلاننگ کیے بیٹھی تھیں۔

اور پھر ان کے ضد کرنے پہ ہی رحمان صاحب کو کامل صاحب کو کال کرنی پڑی۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد رحمان صاحب نے انہیں جہانگیر کے رشتے کی ہاں کر دی تھی۔

"ہمیں اپنی برکہ کے لیے جہانگیر پسند ہے۔" رحمان صاحب نے کہا تو مدیحہ بیگم کے لبوں پہ ایک طمانیت بھری مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"میں ابھی سبین اور برکہ کو یہ خوش خبری سنا کر آتی ہوں۔" مدیحہ بیگم نے بیڈ سے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے میں بھی بھائی صاحب کو کال کر کے بتا دیتا ہوں کہ ہم نے، برکہ کا رشتہ بھی طے کر دیا ہے۔" رحمان صاحب نے کہا اور اپنے بھائی کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔

"برکہ کا رشتہ طے کر دیا؟" رحیم صاحب کی حیرانی بھری آواز نے رحمان صاحب کو لمحے بھر کے لیے سٹپٹانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"سین کے دیور کے ساتھ۔" رحمان صاحب نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"برکہ کے لیے میں نے عادل کی بات کی ہوئی تھی رحمان! اور یہ بات میری کیا اماں کی بات بھی۔ تم اس بات کو کیسے بھول سکتے ہو۔" رحیم صاحب کی ناراضی بھری آواز ان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔

"اماں کی بات بھی لیکن آپ نے ایک بار بات کرنے کے علاوہ پھر کبھی اس بات، اس رشتے کا ذکر تک نہیں کیا۔ تو مجھے لگا کہ شاید آپ کا ارادہ بدل گیا ہے۔" رحمان صاحب نے بودی سی توجیہہ پیش کی۔

"ارادہ۔ ایسے کیسے ارادہ بدل گیا۔ بات تو طے تھی۔ لیکن چلو اگر تمہارے ذہن میں ایسی کوئی بات آئی بھی تھی تو ایک بار رشتہ طے کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھنا تو تمہارا فرض بنتا تھا۔

اگر میں تمہیں انکار کرتا تو پھر تمہارا حق بنتا تھا کہ برکہ کا رشتہ کہیں بھی طے کر دیتے۔ ابھی تو عادل پڑھ رہا ہے۔ برکہ بھی پڑھ رہی ہے۔ ایسے میں رشتے کی بات کرنا مجھے تو کہیں سے بھی مناسب نہیں لگا۔ میں تو مناسب وقت کے انتظار میں تھا کہ بچے اپنی اسٹڈی مکمل کر لیں۔ اس کے بعد ہی۔" رحیم صاحب نے متاسفانہ انداز میں اپنی بات کو ادھورا چھوڑا تھا۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں۔ لیکن اب تو ہم نے وہاں ہاں کر دی ہے۔ اب ہاں کرنے کے بعد انکار کرنا کچھ مناسب نہیں لگے گا اور پھر سین کی سسرال کا بھی تو معاملہ ہے ناں۔ ایسا نہ ہو اب کوئی بدمزگی ہو جائے۔" رحمان صاحب نے شرمندگی بھرے انداز میں کہا۔ رحیم صاحب نے کچھ بھی کہے بنا کال منقطع کر دی تھی، جانے کیوں کال کے بند ہونے کے بعد رحمان صاحب کو ایک دم اپنے اس فیصلے پہ پچھتاوا سا ہونے لگا تھا۔

"جب برکہ کا خاندان میں جوڑ موجود تھا۔ تو پھر اس کا خاندان سے باہر رشتہ طے کرنے کی کیا تک تھی۔ لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔" رحمان صاحب نے سوچتے ہوئے اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اپنی پیشانی کو مسلا تھا اور گہرا سانس لیتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتی مدیحہ بیگم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جو ان سے شاپنگ پہ جانے کے لیے مزید پیسوں کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ رحمان صاحب نے کچھ بھی کہے بنا اپنی جیب سے والٹ نکالا اور پانچ پانچ ہزار کے کچھ نوٹ مدیحہ بیگم کی ہتھیلی پر سجا دیے تھے۔

"ہم لوگ جلدی آنے کی کوشش کریں گے۔ اس سے پہلے آپ گھر سے مت نکل جایئے گا۔" مدیحہ بیگم نے کہتے ہوئے پیسوں کو اپنے پرس میں رکھا۔

"مدیحہ پتا نہیں کیوں مجھے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ ہم نے، برکہ کے بارے میں فیصلہ کرنے میں کوئی جلدی تو نہیں کر دی۔" رحمان صاحب اپنے دل میں چھپی پریشانی کو عیاں کیے بنا نہیں رہ سکے تھے۔

"آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ ضرور رحیم بھائی نے ہی آپ سے کچھ الٹا سیدھا کہا ہوگا۔ ورنہ تو آپ۔"

"اف تم عورتوں کی مینٹیلٹی کبھی نہیں بدل سکتی۔ عام سی بات کو بھی مشکوک سمجھ کر سامنے والے کا منہ بند کروانا خوب آتا ہے۔" رحمان صاحب نے غصے سے مدیحہ بیگم کو گھورا تو وہ شرمندہ ہو کر چپ ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

"میں تمہیں پورے گھر میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔ اور تم ہو کے یہاں چھپی ہوئی بیٹھی ہو۔" سین نے اسٹور روم کا دروازہ کھول کر وہاں کونے میں بیٹھ کر پڑھتی برکہ کے قریب آتے ہوئے کہا۔ اور جھک کر اس کے ہاتھ سے فزکس کے نوٹس لے لیے۔

"آپی، مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔" برکہ نے ناک چڑھا کر کہا۔

''اور مجھے تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔ کتنا مزہ آئے گا برکہ۔ ہم دونوں نہیں ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گی۔'' سین نے برکہ کے قریب چٹائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ سین، برکہ کا جہانگیر کے ساتھ رشتہ طے ہونے پہ بے حد خوش تھی۔ لیکن جانے کیوں یہ خوشی برکہ محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ تذبذب کا شکار تھی۔ اور اپنے اسی تذبذب کو چھپانے کے لیے وہ یہاں اسٹور روم میں آ بیٹھی تھی۔

''کیا بات ہے برکہ۔ کیا تم اس رشتے سے خوش نہیں ہو۔ کیا تم عادل کے ساتھ۔''

''نہیں نہیں آپی۔ ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ جو امی، بابا کو ٹھیک لگا۔ مجھے بھی وہی ٹھیک لگا۔ لیکن۔'' برکہ نے سین کے چہرے سے اپنی نظروں کو ہٹایا اور سر کو جھکا کر اپنی ہتھیلی کو انگوٹھے سے مسلنے لگی تھی۔

''لیکن کیا؟'' سین نے نرمی سے بہن کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔

''لیکن مجھے جہانگیر بہت سخت مزاج سا لگا۔ اس دن وہ آنٹی صبا کے ساتھ ہمارے گھر آیا تھا ناں۔ آپ سے ملنے کے لیے، آپ نے دیکھا نا وہ کیسے خاموش اور سیریس بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے وہ مسکرانا جانتا ہی نہیں۔'' برکہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی جھلملائی تھی۔ تو وہیں سین کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

''پاگل۔'' سین نے کہتے ہوئے ایک ہلکی سی چپت برکہ کے سر پہ لگائی۔

''ایک تو وہ لوگ نوٹی انجان لوگ ہیں۔ دوسرے وہ پہلی بار ہمارے گھر آیا تھا۔ تو کیا باتیں کرتا۔ ہاں اگر ہمارا کوئی بھائی ہوتا۔ تو شاید اس سے گپ شپ لگا لیتا۔ اب بابا سے کتنی باتیں اور کیا باتیں کرتا۔ تم خوامخواہ اپنے دل میں وہم نہیں پالو۔ اچھا گمان رکھو۔ اور مجھے تو لگتا ہے۔ سب اچھا ہو ہی گیا ہے۔ میں اور تم ہمیشہ ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہیں گی۔ اس سے اچھا بھلا کوئی اور بات ہو سکتی ہے۔'' سین نے کہتے ہوئے بہن کے گرد اپنے بازوؤں کا حلقہ بنایا تھا۔

''ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس سے اچھی بھلا اور کیا بات ہو سکتی ہے'' برکہ نے کہتے ہوئے اپنے سر کو زور زور سے اثبات میں ہلایا۔ اور خود بھی سین کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

☆☆☆

اور پھر سین کی بارات والے دن برکہ اور جہانگیر کا بھی نکاح کر دیا گیا تھا اور رخصتی کو برکہ کی گریجویشن تک ملتوی کیا گیا تھا۔ نکاح نامے پہ سائن کرنے سے پہلے برکہ نے سر کو اٹھا کر اپنے سے کچھ فاصلے پہ کھڑے تایا کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پہ ناراضی، غصہ، افسوس غرض یہ کہ ایسی کئی کیفیات بیک وقت بنی ہوئی تھیں۔ برکہ کی نظر تایا کے چہرے سے ہٹ کر ان کے ساتھ کھڑے عادل پہ پڑی تھی۔ جو اس لمحے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لیکن برکہ اس کے چہرے پہ ٹھہرے تاثرات چاہ کر بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ گلہ تھا۔ یا پھر۔

برکہ نے گھبرا کر اپنا سر نیچے کیا۔ اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے نکاح نامے پہ سائن کر دیا۔ نکاح کے بعد اسے کچھ دیر کے لیے جہانگیر کے ہمراہ اسٹیج پر بٹھایا گیا۔ اور بس اس تھوڑی دیر میں برکہ نے کئی بار جہانگیر کی طرف سے کسی شوخ جملے یا کسی بے قراری بھری حرکت کا انتظار کیا۔ لیکن اس کا یہ انتظار لاحاصل ہی رہا۔ خفا سے انداز میں بیٹھا جہانگیر چہرے پہ جہاں بھر کی بے زاری سجائے بیٹھا تھا۔ اور جس وقت برکہ کو جہانگیر کے پہلو سے اٹھانے کے لیے صبا بیگم آگے بڑھیں تو خاموش بیٹھے جہانگیر کے لب کھلے تھے۔

''انکوتے بھائی کی شادی انجوائے کرنے کے بجائے آپ نے مجھے یہاں باندھ کر بٹھا دیا ہے۔'' جہانگیر نے اسٹیج سے اٹھتے ہوئے ماں سے شکوہ کیا۔ ''ہاں تو اب کر لو انجوائے۔ تمہیں کون انجوائے کرنے سے روک رہا ہے۔'' صبا بیگم نے ہنستے ہوئے کہا اور برکہ کو محبت سے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پھر اگلے دن ولیمے پہ بھی برکہ کو دیکھ کر جہانگیر نے کچھ خاص تاثر نہیں دیا تھا۔ اس کے اس انداز کو دیکھ کر برکہ مدیحہ

بیگم کے عقب میں چھپی اور پھریاں کے دوپٹے کے پلو کو پکڑ کر ان کے ساتھ ہی رہی تھی۔ ایک دو بار اس نے کن انکھیوں سے خود سے کچھ فاصلے پہ کھڑے جہانگیر کو دیکھا۔

برکہ نے جہانگیر کو فون کی اسکرین کی طرف متوجہ ہی پایا تھا۔ جہانگیر کا یوں نظر انداز کرنا نہ چاہتے ہوئے بھی گلاب کی مانند کھلی برکہ کو مرجھانے پہ مجبور کر گیا تھا۔ جانے کیوں اس کا دھڑکتا ہوا دل ہولے ہولے لرزنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ برکہ کچھ سوچتی ثنا اپنے کام دوپٹے کو سنبھالتی اس کے قریب چلی آئی تھی۔ اور زبردستی اسے اپنے ساتھ لے جا کر اپنے مہمانوں سے اس کا تعارف کروانے لگی تھی۔ ہونے والے سسرال والوں کی طرف سے ملنے والی توجہ پہ برکہ کا مرجھایا ہوا چہرہ پھر سے کھلا تھا۔ اور اس کے لبوں پہ شرمیں مسکراہٹ نے جگہ بنا کر اس کے دل کو پھر سے دھڑکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔

سبین اور شجاع کے ولیمے کی تقریب شان دار رہی تھی۔ اور سبین ان کے ساتھ مکلاوے کے لیے گھر آ گئی تھی، سبین کے چہرے کی چمک اور لبوں کی تفریحی ہنسی بتا رہی تھی کہ وہ کتنی خوش ہے۔ اور جس وقت یہ بات اس نے مدیحہ بیگم کو بتائی تھی۔ تو انہیں سبین کے ساتھ ساتھ برکہ کا نکاح بھی اس گھر میں کر دینے کا فیصلہ سو فیصد ٹھیک لگا تھا۔ جب ایک بیٹی اتنی خوش ہے۔ تو دوسری بیٹی کیسے خوش نہیں رہے گی۔ اور یہ خیال مدیحہ بیگم کی طمانیت کے لیے کافی تھا۔ اور اس بات کا اظہار انہوں نے سبین سے بھی کیا۔

"دیکھے تھے اپنے تایا اور ان کی فیملی کے چہرے۔ کیسے بھی حیرانی سے اپنی انگلیوں کو دانتوں تلے داب رہے تھے۔ تو کبھی غصے سے بل کھا کر تمہارے بابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شکر ہے اللہ نے ٹھیک وقت پہ میری دونوں بیٹیوں کے نصیب کھول دیے۔ تمہاری تائی تو مجھے ہمیشہ سے ہی اچھی نہیں لگتی تھیں۔ ساری زندگی ناٹک کر کر کے تمہاری دادی کا دل اپنی طرف رکھا ہمیشہ اپنی حرکتوں سے مجھے پیچھے رکھا۔" مدیحہ بیگم کے لہجے میں ماضی کی تپش تھی برکہ نے حیرانی سے ماں کو دیکھ کر اپنی نظروں کا رخ سبین کی طرف موڑا۔ سبین نے نظروں ہی نظروں میں اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

لیکن جیسے ہی مدیحہ بیگم اٹھ کر کمرے سے باہر گئیں۔ خاموش بیٹھی برکہ خاموش نہیں رہ سکی تھی۔

"تائی نے تو کبھی بھی امی کے ساتھ مقابلے بازی نہیں کی آپی۔ مقابلہ تو ہمیشہ سے امی نے ان سے کیا۔ ان کے کھڑاپے سے کیا۔ ان کی سلیقہ مندی سے کیا۔ تائی جان رشتے نبھانے میں ہمیشہ سے امی سے آگے رہیں۔ اور یہی بات دادی کے دل میں ان کے لیے محبت اور امی کے دل میں ان کے لیے حسد کو جگہ دیتی رہی۔"

برکہ وہی بول رہی تھی۔ جو بچپن سے دیکھتی آئی تھی اور یہ کون سا برسوں پرانی بات تھی۔ دادی کے مرنے کے بعد گھر بھی الگ ہو گئے تھے اور یہ ضد بھی تو مدیحہ بیگم کی ہی تھی۔ دو بیٹیوں کی ماں ہونا انہیں اپنی جیٹھانی کے سامنے بونا سا محسوس کرواتا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب وہ تین بیٹوں کی ماں کا لقب اپنے نام کے ساتھ لگائے ہوئے تھیں۔

"اچھا نا تم چھوڑو ان باتوں کو۔" سبین نے خیالوں میں کھوئی ہوئی برکہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپی۔" ان دیکھی سی نمی نے برکہ کی آنکھوں میں جگہ بنائی۔

"یہ ساس، بہو، دیورانی، جیٹھانی کے رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں برکہ اور تم ان کی بات پہ اداس ہو رہی ہو۔ کہتے ہیں شادی کے بعد بہن بھائی بھی ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ جب سب کو اپنی اپنی پڑ جاتی ہے۔ تھوڑی سی خود غرضی مزاج میں خود بخود در آتی ہے۔ لیکن ہاں میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ ہم ایسی روایتی جیٹھانی دیورانی نہیں بنیں گے۔" سبین نے انگلی اٹھا کر برکہ کو وارن کیا تو برکہ کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ہائے ہائے شرم آ رہی ہے۔" سبین نے کہتے

ہوئے آگے کھسک کر برکہ کو گدگدی کی اور پھر دونوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ اور اسی کھلکھلاہٹ کے بیچ سبین، برکہ کے کان میں گھسی اسے جہانگیر کے نام سے چھیڑنے لگی اور اس سے جہانگیر کی بات کرنے لگی۔ مکالمے سے جانے سے پہلے سبین نے جہانگیر کے نمبر کو برکہ کے فون میں محفوظ کر دیا۔

"مجھے ضرورت نہیں ہے۔" برکہ نے کہا۔

"جی، جی۔ تمہیں ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک بار جہانگیر کی کال یا پھر میسج آنے کی دیر ہے۔ پھر پوچھوں گی ضرورت ہے یا نہیں۔ اور ویسے بھی میں یہ نمبر اس لیے سیو کر رہی ہوں کہ جب جہانگیر کی کال آئے۔ تو تم انجان نمبر سمجھ کر کال اٹینڈ ہی نہ کرو۔ اور وہ بیچارہ پہچانا، پہچانا کہہ کر میسج ہی نہ کرتا رہے۔" سبین نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ تو برکہ "آپی!" کہہ کر رخ ہی بدل گئی۔

لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ لاشعوری طور پر برکہ کئی دن تک جہانگیر کے میسج یا پھر کال کا انتظار کرتی رہی۔ لیکن جہانگیر نے کال تو دور اسے کبھی میسج تک نہیں کیا تھا۔ اور برکہ یہ بات سبین سے شیئر کیے بنا نہیں رہ سکی تھی۔

"وہ جہانگیر بزی ہوتا ہے ناں۔ تو شاید اس لیے۔" سبین نے کہا اور اگلے ہی لمحے اسے اپنی دلیل بودی محسوس ہوئی تھی۔

"شاید جہانگیر کو شادی سے پہلے باتیں کرنا پسند نہیں ہے۔ وہ سنجیدہ طبیعت کا ہے تو اس لیے اس نے کال نہیں کی ہوگی۔ ویسے تو وہ اکثر ہی مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھتا رہتا ہے۔ تمہاری باتیں بھی کرتا ہے۔" سبین نے برکہ کو بتایا تھا۔ اب جانے یہ بات سچ تھی یا پھر جھوٹ برکہ نے غور نہیں کیا تھا۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہوا تھا۔ اس نے جہانگیر سے اپنا دھیان ہٹا کر اپنی پڑھائی کی طرف مبذول کر لیا تھا۔ جب جہانگیر کو ہی پرواہ نہیں تھی۔ تو پھر وہ کیا کرتی۔ لیکن ہاں کبھی کبھار اپنی دوستوں کے بیچ بیٹھ کر اسے یہ بات شدت سے محسوس ہوا کرتی تھی۔

اپنے منگیتروں کی باتیں کرتیں۔ ان کی بے تابیوں کے قصے سناتیں۔ ایسے میں کچھ دیر کے لیے ہی صحیح برکہ کو اپنی کم مائیگی کا احساس ستانے لگتا۔ اس کی دوستوں کے پاس منگنی کروانے کے بعد ہزار قصے ہوتے تھے۔ اور وہ نکاح کے بعد ایک بھی بات ایک بھی بے تابی کو نہیں پا سکی تھی۔ برکہ گھبرا جاتی اور اپنے چہرے کو کتاب میں چھپا لیا کرتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی اس کی سہیلیاں اس سے جہانگیر کے بارے میں استفسار کریں۔ اور بدلے میں اس کے پاس سنانے کو ایک بھی بات نہ ہو۔ اس لیے وہ بھی اپنے چہرے کو کتاب میں چھپانے یا کوئی بہانہ بنا کر اٹھ جاتی کہ اسے یہی بہتر لگتا تھا۔ اور وہ یہی کرتی تھی۔

☆☆☆

ابھی سبین کی شادی کو دو ماہ ہی ہوئے تھے۔ جب سبین ماں کے ساتھ کمرے کا دروازہ بند کیے جانے کون سے راز و نیاز کرنے میں مصروف تھی۔ باہر لاؤنج میں غصے سے ٹہلتی برکہ کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز ہو گیا تھا۔ اس نے زور زور سے ماں کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑ اڈالا تھا۔

"کیا مسئلہ ہے تمہیں؟" سبین نے دروازہ کھول کر خفگی سے برکہ کی طرف دیکھا۔

"یہی تو میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔ کیا مسئلہ ہے جو آپ دونوں یوں دروازہ لاک کیے باتیں کر رہی ہیں۔" برکہ نے کہتے ہوئے پہلے سبین اور پھر مدیحہ بیگم کی طرف دیکھا۔ جن کے چہرے پہ فکرمندی تھی۔ اندیشے تھے۔ اسی لمحے مدیحہ بیگم نے برکہ کی طرف دیکھا جو ان کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔

"کوئی بات نہیں ہے۔ میں ویسے ہی امی سے باتیں کر رہی تھی۔" سبین کی آواز پہ برکہ کی نظروں کا زاویہ بدلا تھا۔

"ایسی کون سی باتیں ہیں جو میرے سامنے نہیں ہو سکتیں۔" برکہ روہانسی ہوئی۔

"امی، یہ کب بڑی ہوگی۔" سبین نے اپنے لہجے میں بشاشت بھرتے ہوئے خاموش بیٹھی مدیحہ

بیگم کو مخاطب کیا۔ مدیحہ بیگم نے گہرا سانس لے کر مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں۔

"بڑے ہونے میں سال کب درکار ہوتے ہیں۔ ایک لڑکی تو کبھی کبھار لمحوں میں بڑی ہو جایا کرتی ہے۔ نٹ کھٹ، شرارتیں کرتی لڑکی کب سمجھ داری کے سبق سکھلانے لگتی ہے۔ یہ تو اسے خود بھی نہیں پتا چلتا۔" جانے کیوں مدیحہ بیگم کو یہ خیال بے چین کر گیا تھا۔ بے کل کر گیا تھا۔ اور یہ بے چینی اور بے کلی ہی تو تھی۔ سین کے سسرال واپس جانے کے بعد مدیحہ بیگم اسے کال ملا بیٹھی تھیں۔

"یہ لوگ ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے سین۔" مدیحہ بیگم سسکی تھیں۔

"کچھ بھی غلط نہیں ہوگا امی۔ میں نے بس آپ کو یہ بات اس لیے بتائی ہے کہ آپ مینٹلی طور پر تیار ہو سکیں۔" سین نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مینٹلی طور پر تیار ہو سکوں۔ شادی نکاح کوئی گڈے گڈی کا کھیل تھوڑی ہے۔ کتنے لوگوں کے بیچ بیٹھ کر ایجاب وقبول ہوا ہے۔ اور اب۔" مدیحہ بیگم سسکی تھیں۔

"امی تھوڑا سا کمپرومائز کرنے کی ضرورت ہے۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سین نے ماں کو تسلی دی۔

"ٹھیک تو کرنا ہی پڑے گا سین۔ ورنہ رشتہ داروں کو ہم کیا منہ دکھائیں گے۔ خاص طور پر تمہارے تایا کی فیملی کو۔ انہیں تو باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا نا۔" مدیحہ بیگم کا لہجہ بھیگا تھا۔

"امی بات تایا کی فیملی کی نہیں ہے۔ ہم اس معاشرے کا حصہ ہیں۔ جہاں لڑکی قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی سب سے زیادہ قصوروار ٹھہرائی جاتی ہے۔ لڑکی کی پوزیشن کو سمجھنے کے بجائے کچھ تو ہوا ہوگا۔ کچھ تو بات ہوگی کے مفروضے کو ہم اپنی باتوں، نظروں سے خواہ مخواہ کھرچنے لگتے ہیں۔ میں نے ان لوگوں سے صاف بات کر لی ہے۔ آپ فکر مت کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سین نے ماں کو تسلی دی۔ جانے مدیحہ بیگم مطمئن ہوئی تھیں یا نہیں لیکن انہوں نے کال ضرور بند کر دی تھی۔

"تمہیں آنٹی کو یہ بات نہیں بتانی چاہیے تھی۔" بیڈ کے دوسری طرف بیٹھے شجاع نے اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کو سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے سین کو پشت کی دیکھتے ہوئے کہا۔ سین نے پہلے اپنی گردن کو شجاع کی سمت موڑا۔

"تو کیا کرتی؟" سین نے شجاع سے سوال کیا۔

"تھوڑا ویٹ کر لیتیں۔ ہم معاملہ ہینڈل کر لیتے۔ ایسے آنٹی، انکل کو پریشان کرنا۔" اس سے پہلے کہ شجاع اپنی بات مکمل کرتا۔ سین ٹوک دیا۔

"ایسے معاملے ایسے ہینڈل نہیں ہوتے۔ جیسے آپ لوگوں نے ہینڈل کیا ہے۔" سین کے لہجے میں شکوہ در آیا تھا۔ اور شجاع مزید کچھ بھی نہیں بول سکا تھا۔ سین نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ اور پھر اپنی جگہ لیٹ کر کروٹ بدل گئی۔

"مجھ سے کیوں ناراض ہو رہی ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟" شجاع نے سین کی سمت کھسک کر اس کے بازو پہ اپنے ہاتھ کو رکھا۔ تو سین اٹھ کر بیٹھ گئی اور بنا کچھ کہے رونے لگی تھی۔

"تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شجاع نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے تسلی دی۔ تو سوں سوں کرتی سین نے آہستہ سے۔ سر کو اثبات میں ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

"شادی۔" برکہ نے حیرانی سے اس لفظ کو دہرایا اور ماں کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"لیکن ابھی تو میری پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوئی۔ آپ سب نے کہا تھا۔ رخصتی دو سال کے بعد ہوگی۔ تو اب آٹھ ماہ کے بعد ہی کون سی آفت آ گئی ہے۔" برکہ کو غصہ آ گیا تھا۔

"رخصتی دو سال کے بعد بھی کرنی تھی تو بات

ایک ہی ہے۔" مدیحہ بیگم نے سبزی بناتے ہوئے ہولے سے کہا۔ نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھی برکہ کی طرف دیکھا۔

"ایسی بات نہیں ہے امی! دو سال کے بعد میری پڑھائی مکمل ہونے کے بعد رخصتی تھی۔ اور اب میری پڑھائی کے بیچ ہی۔"

"شادی کے بعد پڑھ لینا۔ تمہیں کون پڑھنے سے منع کر رہا ہے۔" مدیحہ بیگم نے کہہ کر پالک کے پتوں کو نوکری سے چنا۔

"یہ کیا بات ہوئی ان لوگوں نے آپ سے کہا۔ آپ فوراً ہی رخصتی کے لیے تیار ہو گئیں۔

آپ ان سے کہہ سکتی تھیں کہ ہمیں ابھی برکہ کی شادی نہیں کرنی۔ اگر آپ انہیں انکار نہیں کر سکتیں۔ تو میں بابا سے بات کر لیتی ہوں۔ میں۔"

"برکہ!!!" ماں کی سنجیدہ بھری آواز نے برکہ کو خاموش کروا دیا۔

"تم اپنے بابا سے کوئی بھی بات نہیں کرو گی۔ اور جہاں تک رخصتی کی بات ہے۔ وہ بات انہوں نے نہیں کی۔ میں نے ان سے کی ہے۔ اس لیے بار بار اس بات کو مت دہراؤ۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ مجھے مزید پریشان مت کرو۔" مدیحہ بیگم نے کہتے ہوئے ٹیبل پہ پڑے آلوؤں کو واپس ٹوکری میں رکھا۔

"کیوں پریشان ہیں۔" برکہ اٹھ کر ماں کے قریب آ بیٹھی۔ مدیحہ نے کچھ لمحے بیٹی کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا۔ اور پھر کچھ کہے بنا اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ مدیحہ بیگم تو برکہ کو کچھ بتا نہیں سکی تھیں۔ لیکن برکہ کو جہانگیر کے نام کا ایٹن لگانے کے بعد سبین نے سب کچھ برکہ کو بتا دیا تھا۔ جو وہ اور مدیحہ بیگم پچھلے دو ماہ سے چھپا رہی تھیں۔

☆☆☆

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آپی۔" مایوں کے سوٹ میں ملبوس سبین کی بات سن کر برکہ کا رنگ لمحہ بھر کے لیے زرد ہوا تھا۔

"مجھے بھی شادی کے بعد ہی پتا چلا۔ اور میں نے اس بات پہ جہانگیر کے ساتھ ساتھ آنٹی اور انکل سے بھی لڑائی کی۔ جب ان کا بیٹا کسی اور میں انٹرسٹڈ تھا کہیں اور شادی کرنا چاہتا تھا۔ تو انہیں تم سے جہانگیر کا نکاح نہیں کروانا چاہیے تھا۔ اور وہ بھی تب جب جہانگیر نے بار بار ان لوگوں سے کہا تھا کہ وہ نور کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ بیٹے نے اگر برادری سے باہر شادی کر لی تو رشتہ داروں میں کیا عزت بچے گی۔ اس خیال نے آنٹی اور انکل کو جہانگیر کو دھمکیاں دینے پر مجبور کر دیا تھا۔"

"تو پھر مجھ سے جہانگیر نے کیوں نکاح کیا۔؟" برکہ کی سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"پراپرٹی سے عاق کی دھمکی نے جہانگیر سے نکاح نامے پہ سائن کروا دیے۔ لیکن اب سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے برکہ۔ برسوں تمہاری شادی ہے اور یاد رکھنا بیوی کا درجہ ہر لحاظ سے الگ ہوتا ہے تم چاہو تو اپنے حسن اور نزاکت سے جہانگیر کو اپنا گرویدہ بنا سکتی ہو۔ اگر تم تھوڑی سی۔"

"ایسا نہیں ہوتا آپی۔" برکہ کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر اس کے گالوں پہ بکھرے تھے۔

اس نے ایک جھٹکے سے اپنے شانے پہ دھرے سبین کے ہاتھ کو جھٹکا۔ اور بائیں ہاتھ کی پشت سے اپنے چہرے پہ بکھرے ہوئے آنسوؤں کو صاف کیا۔

"وہ ایک بنا ہوا انسان ہے آپی اور آپ مجھے کہہ رہی ہیں۔ میں سب ٹھیک کر لوں۔ میں کیسے سب ٹھیک کر سکتی ہوں۔ اس کے دل میں، میں نہیں ہوں کوئی اور ہے۔ وہ کبھی مکمل طور پر میرا نہیں ہوگا۔ اگر جہانگیر کے ماں باپ نے اس کے ساتھ غلط کیا ہے۔ تو میرے ماں باپ نے بھی میرے ساتھ غلط کیا۔ اگر جہانگیر کے ماں باپ نے دھمکی دے کر اسے میرے ساتھ نکاح کرنے پہ مجبور کیا۔ تو میرے ماں باپ بھی مجھے اس کے ساتھ سب کچھ جانتے بوجھتے رخصت کر کے غلطی کر رہے ہیں۔" برکہ رو رہی تھی۔

"برکہ! میری جان۔" برکہ کا یوں رونا سبین کو تکلیف دے رہا تھا۔ وہ بہن کے قریب کھسکی۔

"امی، بابا تو ماں باپ ہیں۔ ہاں باپ تو یونہی بیٹیوں کے معاملے میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جایا کرتے ہیں۔ لیکن آپ تو انہیں سمجھا سکتی تھیں۔ یہ شادی میرے لیے عمر بھر کا امتحان بھی تو بن سکتی ہے۔" آنسوؤں بھری نظریں اب سبین کے چہرے پہ گڑی ہوئی تھیں۔

"برکہ! یہ زندگی ہے۔ کوئی فلم یا ڈرامہ نہیں ہے۔ جہاں کچھ پسند نہیں آیا تو ریموٹ کا بٹن دبا کر بدل دیا جائے۔ بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے میری جان۔ یہ معاشرہ یہ لوگ تم سے نکاح ٹوٹنے کے بارے میں بار بار سوال کرتے۔ کہنے اور سہنے میں بہت فرق ہوتا ہے برکہ۔ میں اور امی نہیں چاہتے تھے کہ تمہیں لوگوں کے ایسے سوالات کا سامنا کرنا پڑے۔ سامنے اچھا ہو تو بہت سارے منہ خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔"

"اور اگر پیچھے اچھا نہ ہو تو کبھی کبھار دل بند بھی ہو جاتا ہے۔ یا پھر دل مر بھی سکتا ہے آپی اور ویسے بھی کتنے سوال ہوتے۔ کب تک سوال کرتے۔ یہ سوال اس درد سے کہیں کم ہوتے آپی۔ جو مجھے ان چاہا وجود بنا کر جہانگیر کے ساتھ ملے گا۔ کتنی عجیب بات ہے نا آپ کو اور امی کو ابھی تک یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ جہانگیر کبھی نہیں بدلے گا۔ اگر اسے بدلنا ہوتا تو نکاح کے بعد کبھی تو وہ مجھ سے رابطہ کرتا۔ کبھی تو بات کرتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ اس نے صاف لفظوں میں سب بتا دیا ہے۔ وہ مجھ سے زبردستی شادی کر رہا ہے۔ اور مجھے زبردستی کسی کی زندگی میں شامل نہیں ہونا آپی۔ ابھی بھی کچھ نہیں ہوا ہے آپی۔ پلیز امی بابا سے کہہ دیں کہ میں۔"

"چپ!" سبین نے کہتے ہوئے برکہ کے لبوں پہ اپنے ہاتھ کو رکھا۔

"ایسا سوچنا بھی مت۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ آنٹی، انکل، ثنا اور شجاع سب تمہارے ساتھ ہیں۔ جہانگیر بدل جائے گا۔ سب کا رجحان تمہاری طرف دیکھ کر وہ خود بخود تمہارے ساتھ بدلتا چلا جائے گا۔ اچھا گمان رکھو۔" اس کے لبوں سے ہاتھ کو ہٹاتے ہوئے سبین نے برکہ کو اپنے ساتھ لگایا۔ تو جہاں ڈھیروں سوال اس کے اندر اپنے آپ ہی مر گئے تھے۔ وہیں برکہ کی آنکھوں میں موجود آنسو ٹھہر کر رکے تھے۔

کوئی بھی اس کی بات کو سننا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اور اسی لیے اس نے اس کے بعد سبین سے کوئی بات نہیں کی تھی، یہاں تک کہ وہ رخصت ہو کر جہانگیر کے ہمراہ اس کے گھر اس کے کمرے میں، اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ اب دل کا دروازہ باقی بچا تھا۔ جانے وہاں تک اس کی رسائی ممکن بھی تھی یا۔

☆☆☆

اس کے ہر طرف سرخ گلاب بکھرے پڑے تھے، وہ خود بھی ان پھولوں کے بیچ بیٹھی کسی کھلے ہوئے خوب صورت گلاب سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ برکہ نے اپنے حنائی ہاتھ کو بڑھایا اور اپنے پاس بیڈ پہ پڑی سرخ پتیوں کو اٹھا کر اپنی ہتھیلی پہ سجا لیا۔ وہ کتنی دیر سے اپنی ہتھیلی پہ سجی ان پھولوں کی پتیوں کو دیکھے جا رہی تھی کہ جب، ایک خیال اس کے لاشعور سے نکل کر اس کے شعور پہ دستک دینے لگا۔ برکہ نے اپنے ہاتھ کو ذرا سا موڑا۔ پھولوں کی پتیاں اس کے ہاتھ کی اس جنبش پہ ناراض ہو کر واپس بیڈ پہ گری تھیں۔ مہندی لگانے والی نے اس کے ہاتھ پہ موجود مہندی کے باریک ڈیزائن میں چپکے سے جہانگیر کے نام کا پہلا حرف بھی لکھا تھا۔

"جب آپ کل ولیمے پہ تیار ہونے کے لیے آئیں گی۔ تو مجھے ضرور بتانا آپ کے ہسبینڈ نے اپنے نام کا لفظ ڈھونڈا تھا۔ یا پھر وہ ہار گئے تھے۔" کہتے ہوئے اس لڑکی نے ہولے سے برکہ کی ناک کو دبایا تھا۔ برکہ کی نظریں اپنے ہاتھوں میں چھپے اس لفظ کی متلاشی تھیں جو جلد ہی اس کی نظروں کے حصار میں آ گیا تھا۔ برکہ کے لب اپنے آپ ہی مسکائے تھے۔

"جہانگیر کبھی بھی اس لفظ کو نہیں ڈھونڈ پائیں

گے۔" برکہ ہولے سے بڑبڑائی تھی۔ اور پھر خود ہی شرما کر اس نے اپنے چہرے کو بازوؤں میں چھپایا تھا۔

"آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔ بے حد خوب صورت اور حسین۔ میں نے آپ کے خیالی دلہنیں بہت کم دیکھی ہیں۔" پارلر والی نے اس کے سر پہ دوپٹا سیٹ کرتے ہوئے کہا تھا۔ برکہ نے شرما کر اپنا چہرہ نیچے کرلیا۔

لیکن اس وقت وہ خود کو آئینے میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے سر کو اٹھایا اور دائیں جانب ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے سراپے کو دیکھنے لگی تھی۔ آئینہ بتلا رہا تھا۔ دلہن بن کر اس پہ بہت روپ آیا تھا، وہ حسین نہیں بلکہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ مزید کچھ سوچتی کمرے کا دروازہ کھلا اور جہانگیر کمرے میں داخل ہوا۔

برکہ نے فوراً ہی اپنی نظروں کو آئینے سے ہٹایا اور سر کو جھکا لیا۔ جہانگیر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا بیڈ کے پاس آ کر رکا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولنا چاہا اور پھر جانے کیا سوچ کر پلٹا اور چینج کرنے کے بعد وارڈ روب کی طرف بڑھ گیا۔ فریش ہونے کے بعد وہ ایک بار پھر بیڈ کے پاس آ کر رکا۔

"کیا تم ساری رات ایسے ہی بیٹھی رہو گی۔" اس کا سوال عجیب تھا۔ اور لہجہ عجیب تر، برکہ کے مسکراتے لب سمٹے تھے۔

"مجھے سونا ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔" جہانگیر پلٹ کر بیڈ کی دوسری طرف آ بیٹھا۔ اس بار دل بری طرح سکڑا تھا۔ بے وقعتی، کم مائیگی کا احساس اذیت بن کر رگوں میں اترا تھا۔ وہ جس کے لیے اتنا تیار ہوئی تھی۔ اس نے تو ایک نظر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"یہ تمہاری منہ دکھائی۔" جہانگیر نے سرخ مخملی ڈبیا کو برکہ کی طرف سرکاتے ہوئے کہا تو برکہ نے نظریں اٹھا کر جہانگیر کی طرف دیکھا۔

"زندگی میں زبردستی شامل تو کیا جاسکتا ہے۔ لیکن دل کے معاملوں میں زبردستی نہیں چلتی۔

اور میرا دل نور کا ہے۔ اس پہ تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔" جہانگیر آہستہ سے کہتا ہوا اپنی ٹانگوں کو پھیلا چکا تھا۔

"تمہیں سب پتا ہی ہے۔ اس لیے نور کے بارے میں بات کر کے تمہارا ٹائم ویسٹ نہیں کروں گا۔ میں اپنے حصے کی محبت نور کے ساتھ کر چکا ہوں اور۔"

"اور میرے حصے میں کیا آئے گا۔" برکہ نے آہستہ سے کہتے ہوئے اس کی بات کو کاٹا تھا۔ جہانگیر خاموش تھا۔ برکہ کی آنکھیں نمکین پانی سے بھرنے لگی تھیں۔

"میں جانتا ہوں، اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اور یقین کرو اس سب میں میرا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب بات کر چکا ہوں۔ میں انہیں بتا چکا ہوں۔ حتیٰ کہ سبین بھابھی کو بھی کہ میں سچ میں نور سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے تو سبین بھابھی سے کہا بھی تھا۔ ابھی بھی کچھ بھی نہیں بگڑا۔ میں برکہ کو طلاق دے دیتا ہوں۔ لیکن۔" جہانگیر نے اپنے سر کو جھکا تھا۔ اور برکہ کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ اس وقت دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ جہانگیر نے مزید کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اور اسی لیے وہ کروٹ بدل چکا تھا۔

آنسو آنکھوں سے موتیوں کی صورت گرنے لگے۔ تو وہیں ماضی کی کھڑکی سے ایک یاد اس کے ذہن میں کلبلائی تھی۔ برکہ نے اپنے پرس کو کھولا۔ اور اس میں موجود اپنے فون کو نکال کر کلچ واپس سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا۔ باکس میں موجود اس چھپے ہوئے میسج کو اس نے ایک بار پھر بے تابی سے پڑھا تھا۔ جو اسے حرف بہ حرف زبانی یاد تھا۔ جسے وہ پچھلے دو ماہ میں جانے کتنی بار پڑھ چکی تھی۔ اور اس وقت وہ ایک بار پھر اس میسج کو پڑھ رہی تھی۔

"اتنی بھی کیا جلدی تھی چاچو کو۔ ہم سے ایک بار

تو بات کرنی چاہیے تھی۔ محبتوں کو بھولنا آسان تو نہیں ہوتا۔ وہ بھی تب جب محبت بچپن کی ہو۔ تب جب ہر خواب میں اس شخص کا ہاتھ تھاما ہو۔ جس کا ہاتھ تھام کر یوں لگتا تھا جیسے کائنات میری دسترس میں آ گئی ہو۔ اور وہ کائنات تم نے ایک لمحے میں کسی اور کے نام کر دی۔ نام تو دیے جاسکتے ہیں برکہ لیکن محبت کو کون اور کیسے کسی اور کے نام کر سکتا ہے۔ انکار کا حق تمہارے پاس تھا۔ ایک بار تو بتاتیں میں بابا اور امی کو فوراً تمہارے گھر بھیج دیتا۔ لیکن تم نے ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کیا۔ یعنی محبت تو بس مجھے تھی تم سے۔ ابھی بھی ہے۔ ہمیشہ رہے گی۔''

جانے کیوں ہمیشہ ہی برکہ کو یہ میسج ادھورا لگتا تھا برکہ کو لگتا تھا اس سے آگے لفظوں نے نہیں بلکہ آنسوؤں نے بات کی ہوگی۔ محبت اس کے حصے میں آ سکتی تھی لیکن نہیں آئی۔ اس کے حصے میں تو بس بیتا ہوا شخص آیا تھا۔ جو اس وقت بھی اس سے رخ موڑے گہری نیند سو رہا تھا۔

یعنی آج سے وہ زندگی کی امتحان گاہ میں امتحان دینے کے لیے اتار دی گئی تھی۔ جب فیصلہ ہو ہی چکا تھا۔ تو پھر عمل بھی اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ برکہ نے اپنے فون کو سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ اور پھر وہ اپنے باتھ روم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جس کے لیے وہ تیار ہوئی تھی۔ وہ اس کے من کو نہیں بھائی تھی۔ اسی لیے اگلے دن ولیمے پہ اس نے جتنا کم ہو سکتا تھا اتنا میک اپ کروایا تھا۔ اور ہال سے واپس آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے کپڑوں کو چینج کیا تھا۔ وہ مکلاوے کے لیے گھر آئی تھی۔ جہانگیر اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ اور وہ تو اگلے دن اسے مکلاوے سے واپس لینے بھی نہیں آیا تھا۔

''دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا تو اسی لیے جہانگیر کو عجلت میں ہاسپٹل جانا پڑا تھا۔'' صبا بیگم نے برکہ کو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا تو برکہ مسکرائے بنا صوفے پہ جا بیٹھی تھی۔ کہنے کو تھا ہی کیا۔ سب ہی تو جانتے تھے جہانگیر جان بوجھ کر نہیں آیا۔

☆☆☆

شادی کے ہنگاموں کے بعد دعوتوں کا سلسلہ بھی تھم چکا تھا۔ روٹین لائف شروع ہو گئی تھی۔ اور اس روٹین لائف میں جہانگیر بس سونے کے لیے کمرے میں آتا تھا۔ برکہ کو یہ سب بہت عجیب سا لگتا تھا۔ لیکن وہ کہتی بھی تو کیا کہتی۔ اس دن بھی وہ سیڑھیوں پہ بیٹھی اپنے ہاتھوں پہ مٹی مٹی مہندی کے نقش نگار دیکھ رہی تھی۔ جب سبین اس کے پاس آ کر ٹھہری تھی۔ وہ صبا بیگم کے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہوئی تھی۔ سبین نے ہاتھ میں موجود فائل کو برکہ کی طرف بڑھایا۔ ان کے گھر میں ننھا مہمان آنے والا تھا۔ اور یہ خبر سنتے ہی برکہ اپنی ساری اداسی بھول گئی۔ اور بہن کے گلے لگ گئی تھی۔ گھر میں سب ہی افراد بے حد خوش تھے۔ یہاں تک کہ جہانگیر بھی۔

''کیا یہ انسان مسکرا بھی سکتا ہے۔'' برکہ نے مسکراتے ہوئے جہانگیر کو حیرانی سے دیکھا۔ تو اسی لمحے جہانگیر کی نظر برکہ کے چہرے پہ پڑی۔ نا صرف اس کے لب اپنے آپ سمٹ چکے تھے۔ بلکہ وہ اٹھ کر لاؤنج سے اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ برکہ کے دل میں کچھ ٹوٹا تھا۔

جانے کیوں سبین، امی اور آنٹی کی باتیں سن کر اسے لگنے لگا تھا۔ وہ جہانگیر کو ٹھیک کر لے گی۔ لیکن اب اسے ایسا ہوتا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔ جو شخص اس کے سامنے مسکرانا نہیں چاہتا۔ وہ کیسے اس سے محبت کر سکتا تھا۔ بلول دل کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی برکہ مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔

☆☆☆

سبین کے ہاں بیٹا ہوا اور اس کے دو سال بعد اس کی گود میں منہا بھی آ گئی تھی۔ برکہ کی گود ابھی تک خالی تھی۔ اس کی خالی گود کا احساس اب مدیحہ بیگم کو شدت سے ہونے لگا تھا۔ اس دن بھی وہ سبین سے ملنے کے لیے گھر آئی تھیں۔ سبین چھلہ کرنے کے لیے مدیحہ بیگم کے پاس آئی ہوئی تھی۔ جب منہا کو گود میں کھلاتی برکہ کو دیکھ کر مدیحہ بیگم کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

اس کی شادی کو بھی تین سال ہونے والے تھے اور وہ ابھی تک خالی گود تھی۔

"سین، برکہ کو بھی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤ۔" مدیحہ بیگم نے کہا تو منہا کو کھلاتی ہوئی برکہ نے سر اٹھا کر ماں کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"تاکہ اللہ کہیں بھی اولاد دے۔" اس کی نظروں کے جواب میں مدیحہ بیگم نے کہا تو برکہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ وہ کچھ بھی کہے بنا وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں آ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی۔

"میں نے نور سے نکاح کرنا ہے۔" رات ہی تو جہانگیر نے اسے بتایا تھا۔ جتنے آرام سے جہانگیر نے اسے بتایا تھا۔ اتنے ہی آرام سے برکہ نے اس کی بات سن لی تھی۔ اس نے تو کچھ کہنے کا مان بھی برکہ کو نہیں دیا تھا تو کہتی بھی تو کیا۔

دفعتاً برکہ کے فون کی بیل ہوئی تو برکہ چونک کر آئینے کے سامنے سے ہٹی۔ اور صوفے پہ بیٹھ کر ہاتھ بڑھا کر فون اٹھا لیا۔ عادل کی کال تھی۔ اس سارے عرصے میں عادل نے پہلی بار اسے کال کی تھی۔ برکہ نے کال اٹینڈ کی اور فون کان سے لگا لیا۔

"کیسی ہو؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"شادی مبارک ہو۔" برکہ نے کہا تو دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ عادل کی پندرہ دن پہلے ہی اپنے ماموں کی بیٹی کے ساتھ شادی ہوئی تھی۔

"ہیلو!" برکہ بھی، کال کٹ گئی ہے۔

"تھینک یو۔" عادل نے آہستہ سے کہا۔

"تم خوش ہو۔" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ برکہ سن سی ہوئی تھی۔ اس نے تو کبھی عادل سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ تو پھر وہ کیوں ایسے پوچھ رہا تھا۔

"ہاں خوش ہوں۔" وہ آہستہ سے بولی تھی کہ اتنے میں سین کمرے میں آ گئی تھی۔ برکہ نے آہستہ سے عادل کی کال کاٹ کر سین کی طرف دیکھا۔

"میں خوش رہ سکتی تھی سین۔ اگر امی گھر کے اچھے رشتے کو چھوڑ کر جہانگیر کا انتخاب نہ کرتیں۔ جب خاندان میں اچھا رشتہ تھا تو پھر کیوں؟" برکہ سسکی تھی۔

"امی نے صرف اپنی انا کو، اپنی میں کو قائم رکھنے، تائی کو نیچے دکھانے کے لیے یہ سب کیا۔ کس کا نقصان ہوا ہے سین۔ امی کا یا تائی کا، کس کی اولاد خوش نہیں ہے۔ امی کی یا پھر تائی کی۔" آنکھوں میں آنسو بھرے برکہ سین سے سوال کر رہی تھی۔ وہیں دروازے میں کھڑی مدیحہ بیگم لڑکھڑائی تھیں۔

"جہانگیر نے نور سے شادی کر لی ہے۔" برکہ بتا رہی تھی۔ مدیحہ بیگم کے دل پہ بوجھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

"گمان اچھا رکھنے سے حقیقت اچھی نہیں ہو جایا کرتی سین۔ تم سب نے مل کر میرے ساتھ برا کیا ہے۔ بہت برا کیا۔"

برکہ رو رہی تھی۔ اس کے پاس بیٹھی سین بھی رو رہی تھی۔ اور کمرے کے باہر کھڑی مدیحہ بیگم بھی رو رہی تھیں۔

"ہاں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے برکہ۔ میں نے اس کے ساتھ برا کیا۔ بس اپنی جھوٹی انا کی تسکین کے لیے، بدلہ لینے کے لیے۔ حالانکہ میرے سسرال والوں نے تو کبھی میرے ساتھ مقابلہ نہیں کیا۔ وہ تو میں ہی تھی جو میں نے سب خراب کر دیا۔ سب برا کر دیا۔ کسی اور کے ساتھ نہیں بلکہ اپنی ہی بچی کے ساتھ۔" مدیحہ بیگم اپنے کمرے میں آ کر شدت سے رو پڑی تھیں۔

کبھی کبھی دوسروں کو نیچا دکھانے، دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے چکر میں ہم خسارہ اپنے دامن میں جمع کرتے ہیں۔ اور ایسا ہی خسارہ مدیحہ بیگم نے اپنی جھولی میں بھر لیا تھا جس کا تاوان ان کی اپنی اولاد برکہ کو بھرنا پڑ رہا تھا۔ اور جانے کب تک اسے یہ تاوان ادا کرنا تھا، اس کی خبر تو مدیحہ بیگم کو تھی اور نہ ہی برکہ کو یہ فیصلہ تو اب گزرتے وقت نے کرنا تھا یا پھر کاتب تقدیر نے۔ وہ صرف دعا ہی کر سکتی تھیں۔

☆☆

نگہت سیما

ماہ الملوک

مکمل ناول

لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گراؤنڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شاذیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔

ظفریاب کا ایک بیٹا آزین تھا اور شاہ زیب بیگ کی ایک بیٹی زمل تھی آزین اور زمل کا نکاح ہو چکا تھا۔

شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کی کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے وہ گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔ ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

ساتویں قسط

pklibrary.com

ہم ہولے ہولے دروازہ کھول رہے تھے کہ بی بی اماں نے جو کسی کام سے باہر نکلی تھیں چور چور کا شور مچادیا۔ ابا جان، بھائی جان سب ہی جاگ گئے تھے۔ بس پھر کچھ نہ پوچھیں کیا ہوا۔"

"بہت مار پڑی تھی کیا۔" ثنا نے شرارت سے ان کی طرف دیکھا۔

"نہیں خیر تین چار تھپڑ ہی لگائے تھے میں نے۔" جہاں زیب بیگ کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔

"جی لیکن بھائی جان نے تو وہ مار لگائی تھی کہ

pklibrary.com

ہفتوں ہڈیاں درد کرتی رہی تھیں۔" ظفریاب کو بھی یاد آیا تھا۔

"دراصل بھائی جان کو اس بات کا دکھ تھا کہ۔ ہم نے انہیں کیوں نہیں اپنے پروگرام میں شامل کیا۔" ارباب بیگ نے قہقہہ لگایا تو سب ہی ہنسنے لگے تب ہی دروازہ کھلا اور شاہ زیب بیگ نے اندر قدم رکھا اور ادھر ادھر متجسس نظروں سے دیکھنے لگے۔ آج جب آزین ڈاکٹر کے پاس سے انہیں لے کر واپس آیا تو بہت خوش تھا۔

"آج ارسلان بھائی نے پورے یقین سے کہا ہے کہ چچا جان اب بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے انہوں نے ڈوز کم کر دی ہے اور کہا ہے کہ انہیں ہیں گھمانے کے لیے لے جائیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی بعض اوقات بہت اثر انداز ہوتی ہے۔"

"ابا۔" زمل یک دم کھڑی ہو گئی تھی۔

"شاہ زیب بیٹا! آ جاؤ ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔" جہاں زیب بیگ نے کہا لیکن وہ یوں ادھر ادھر دیکھتے رہے، جیسے کسی کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ سب ہی ان کی طرف متوجہ تھے۔

"زمی۔" ظفریاب بے اختیار انھ کر ان کی طرف بڑھے وہ کچھ دیر ان کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھتے رہے پھر ان کی آنکھوں میں چمک سی نظر آئی۔

"ظفر بھائی! آپ آ گئے۔ کہاں تھے آپ کتنا ڈھونڈا ہے ہم نے آپ کو کہاں لے گئے تھے وہ آپ کو۔"

"زمی میرے بھائی!" ظفریاب نے انہیں گلے سے لگا لیا۔ اور دونوں بازوؤں میں بھینچے کھڑے تھے۔ جہاں زیب بیگ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ زمل کی آنکھیں بھی نم ہوئیں کہ جب سے ظفریاب آئے تھے ایک بار بھی شاہ زیب نے انہیں نہیں پہچانا تھا۔ حالانکہ گھنٹہ گھنٹہ بھر ظفریاب ان کے پاس بیٹھے رہتے تھے کچھ دیر بعد جب ظفریاب نے انہیں الگ کیا تھا تو ان کی آنکھیں پھر سپاٹ تھیں، ان میں پہچان کے کوئی رنگ نہ تھے۔ اور وہ ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے۔ جیسے کسی کو تلاش کرتے ہوں۔

"کچھ چاہیے آپ کو؟" زمل نے قریب آ کر ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ لیکن وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے واپس مڑ گئے۔

"یہ شیخو بابا کو ڈھونڈ رہے ہیں۔" زمل نے مڑ کر سب کی طرف دیکھا۔

"لیکن ابھی اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور پھر۔" ظفریاب ابھی تک کھڑے تھے۔

"ڈاکٹر ارسلان نے کہا ہے کہ کبھی کبھی انہیں ماضی کا کوئی واقعہ کوئی بات اچانک یاد آ جائے گی لیکن کچھ دیر بعد بھول جائے گی لیکن ایک وقت آئے گا جب سب یاد آ جائے گا۔ یہ آہستہ آہستہ بہتری کی طرف آ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ اگلے سات سال بعد جب آپ آئیں گے تو یہ بالکل ٹھیک ہوں گے۔"

ظفریاب نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہو گیا وہ یہ کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن بس بے اختیاری یہ جملہ اس کے لبوں سے نکل گیا تھا۔

"سات سال کیوں بھئی، ابھی تو اگلے سال مرتضیٰ اور مہرین کی شادی ہو رہی ہے اور ارباب نے وعدہ کیا ہے ارباب سے کہ وہ ضرور آئے گا شادی پر۔" جہاں زیب بیگ نے ظفریاب کی آنکھوں میں پھیلتے کرب کو محسوس کیا تھا۔

"ہاں ہاں ظفر نے وعدہ کیا ہے مجھ سے اور میں تو کہتا ہوں ابا جان، آپ مرتضیٰ اور مہرین کی شادی کے ساتھ ہی زمل اور آزین کی شادی کی تاریخ بھی رکھ دیں۔ مونا کہہ رہی تھی کہ ستمبر اکتوبر کی کوئی تاریخ رکھیں گے موسم اچھا ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب۔" مرتضیٰ نے جو حیران حیران سا ارباب بیگ کی طرف دیکھ رہا تھا یک دم پوچھا۔

"کیا اماں جان نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ہاں تو ہم کون سا ابھی کر رہے ہیں برخوردار! اگلے سال کی بات ہو رہی ہے۔ تب تک مہرین کا

ہاؤس جاب بھی ہو جائے گا۔" آج ارباب بیگ کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔

"لیکن مجھے مہرین سے شادی کرنا ہی نہیں ہے۔ نہ آج نہ پھر کبھی۔" ارباب بیگ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا تھا کہ اس وقت اورنگ زیب یہاں نہیں تھے۔

"تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ بچپن سے بات طے ہے تمہاری اور مہرین۔"

"میں بچپن کے طے کیے ہوئے رشتوں کو نہیں مانتا۔" وہ ان کی بات کاٹتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"مجھے مہرین سے شادی نہیں کرنی۔ ہرگز نہیں۔ اماں کو بھی یہ بتا دیں نہیں ہے پسند وہ مجھے۔"

"تم۔" ارباب غصے سے سرخ ہوتے ہوئے اٹھے تو ظفریاب نے نرمی سے ان کا ہاتھ تھام لیا اور وہ رُمل پر ایک نظر ڈالتا ہوا جو ہکا بکا سا اسے دیکھ رہی تھی تیزی سے باہر نکلا اور دروازے کے باہر کھڑی سحرش سے ٹکرا گیا، جو رُمل کو بلانے آئی تھی۔ ایک قہر آلود نظر اس پر ڈالتا دھم دھم کرتا ہوا وہ صحن عبور کر کے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کئی دنوں کے بادلوں اور مسلسل رم جھم کے بعد آج سورج نکلا تھا، سرما کی نرم گرم سی دھوپ اچھی لگ رہی تھی اس لیے ناشتے کے بعد سب ہی صحن میں آ گئے تھے۔ رات ہی ثوبان شاہ کئی ہفتوں کے بعد کراچی سے آئے تھے۔ وہاں مہران مل کے عقب میں کچھ زمین تھی جسے وہ خریدنا چاہتے تھے کہ یہ ان کی بھی خواہش تھی اور نومی کی بھی کہ وہ اور ریحان مل کر الگ سے کوئی فیکٹری لگا لیں لیکن ریحان نے صاف منع کر دیا تھا کہ اس وقت وہ ساری توجہ اپنی پڑھائی کی طرف دینا چاہتا ہے۔ پارٹ ون کے بعد اس کا ارادہ باہر جانے کا ہے۔ چند سالوں بعد واپس آ کر بھی وہ دو طرفہ توجہ نہیں دے پائے گا اس لیے بہتر ہے کہ شایان اور نومی ہی مل کر کام کر لیں۔

"میں نے جو اتنی محنت کی ہے میں اسے ضائع نہیں کروں گا۔ میرا ارادہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے علاقے میں ایک چھوٹا سا اسپتال بنانے کا ہے۔" اور وہ خاموش ہو گئے تھے حالانکہ وہ چاہتے تھے کہ وہ بزنس کرے۔ میڈیکل میں جانا اس کا شوق تھا سو پورا کر لیا اب نوکریوں کے چکر میں نہ پڑے۔ لیکن جانتے تھے کہ وہ نہیں مانے گا زمین کے سودے کا کام کافی حد تک مکمل ہو گیا تھا۔ ابھی رجسٹری وغیرہ ہونی تھی کہ تایا جان نے ہنگامی بنیادوں پر سب کو بلا لیا تھا۔ سو وہ اکیلے نہیں آئے تھے ریحان اور مہران شاہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

اختر بانو ان کی اچانک آمد پر جہاں حیران ہوئی تھیں وہاں ریحان کو دیکھ کر خوش بھی ہوئی تھیں۔

"نومی کو بھی لے آتے۔" وہ بے اختیار کہہ بیٹھی تھیں کہ لاہور سے واپس آنے کے بعد ابھی تک وہ کراچی نہیں آیا تھا۔

"نومی کو ایک آرڈر مکمل کروانا تھا۔ مہران بھی بمشکل نکلا ہے۔ مہران واپس جائے گا تو اس سے کہوں گا کہ کچھ دنوں کے لیے اسے بھیج دے۔ اگر تایا جان نے یوں اچانک نہ بلا لیا ہوتا تو میرا ارادہ تھا کہ زمین کا انتقال ہوتے ہی، ہم کچھ دنوں کے لیے آئیں گے۔" ان کے لہجے میں وہی ابتدائی دنوں والی نرمی تھی۔ اختر بانو کا من بھیگنے لگا تھا۔

"تایا جان نے اس طرح اچانک کیوں بلایا ہے سب کو۔" اختر بانو نے پوچھا تھا۔

"کچھ اندازہ نہیں ہے مجھے، شاید زمان کو پتا ہو۔" اور اس وقت صحن میں دھوپ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے یہ ہی موضوع زیر بحث تھا جب اختر بانو بھاگی اور اس کی بیٹی کے ساتھ مالٹوں کا تازہ جوس نکلوا کر لائی تھیں۔

ثوبان شاہ کو موسم سرما کی دھوپ میں بیٹھ کر کینو اور مالٹے کھانا اور ان کا فریش جوس پینا بہت پسند تھا۔ ہر سال کی طرح اس بار بھی ان کے دوست نے سرگودھا سے مالٹے بھجوائے تھے، جس کے بھلوال کے گرد و نواح میں اپنے باغات تھے۔ اختر بانو کے

اشارے پر بھاگی اور سنہری نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دیئے تھے اور اختر بانو سب کو گلاس پکڑانے لگیں۔ اختر بانو کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے ثوبان شاہ مسکرائے۔

"تھینک یو بانو۔" سامنے بیٹھی ثمینہ سے ہولے ہولے باتیں کرتی ثمرہ نے اس مسکراہٹ کو دیکھا اور ایک تیز چبھتی ہوئی نظر اختر بانو پر ڈالی۔ اسے ان دنوں ثوبان کا معمولی سا التفات بھی اختر بانو کے لیے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اختر بانو سب کو جوس سرو کرنے کے بعد واپس جانے کے لیے مڑیں تو امان نے روکا۔

"آپ کہاں جارہی ہیں۔ آجائیں ادھر آپ بھی۔" اس نے ثوبان شاہ کے دائیں طرف والی خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر سے ابھی ابھی شایان اٹھ کر گیا تھا۔

"وہ رات مہران بھائی نے بریانی کی فرمائش کی تھی تو میں ذرا اس ـــ کی تیاری کرلوں۔"

"تو پیاری والدہ، مہران چاچو کی فرمائش تو ان کی بیگم کو پوری کرنا چاہیے نا۔" امان کا دل چاہا تھا کہ جب سب یہاں اتنے دوستانہ ماحول میں بیٹھے باتیں کررہے ہیں تو اس کی ماں بھی اس دوستانہ ماحول کا حصہ بنے۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں اپنی نگرانی میں بنوالوں گی بریانی۔" صفورا جز بز ہوئی تھیں امان کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں..... ہاں آجاؤ اختر بانو!" ثوبان شاہ نے اپنی قریبی کرسی کی طرف اشارا کیا۔ اور زمان شاہ کی طرف دیکھا۔

"تو تم کیا کہہ رہے تھے کہ تایا جان نے اس طرح کیوں ہم سب کو بلایا ہے۔"

"میرا خیال ہے الیکشن نزدیک آرہے ہیں تو اسی سلسلے میں کچھ مشورے وغیرہ کرنے میں انہوں نے۔"

"لیکن اس کے لیے بطور خاص ہم سب کو ہنگامی حالات میں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی الیکشن تو دور ہیں اور ظاہر ہے ہم نے تایا جان اور دلاور بھائی کو ہی سپورٹ کرنا ہے۔ الیکشن کمپین شروع ہونے پر ہم آجاتے یہاں۔"

مہران شاہ کا اس وقت کراچی ہونا ضروری تھا انہیں احساس تھا کہ نومی پر کام کا بہت بوجھ ہوگا۔

"میرا اندازہ ہے اور جو مجھے ادھر ادھر سے سن گن ملی ہے، تایا جان بیدار بخت کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کے لیے ہم میں سے کسی کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ اس بار دلاور کو کھڑا کرنے کا ان کا ارادہ نہیں ہے۔" زمان شاہ علاقے میں رہتے تھے اس لیے وہ ان سے زیادہ جانتے تھے۔

"لیکن کیوں، یہ سیٹ تو کئی سالوں سے دلاور بھائی کی ہے۔" مہران شاہ کو حیرت ہوئی تھی۔

"دراصل آپ کے تایا جان چاہتے ہیں کہ سیٹ ان کے خاندان میں ہی رہے کہ دلاور چچا کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے انہوں نے اپنے علاقے کے لیے کوئی کام نہیں کیا جبکہ بیدار بخت نے اسمبلی میں نہ ہوتے ہوئے بھی علاقے کے لوگوں کی فلاح کے لیے کافی کام کیا ہے۔ لوگوں کو مسئلہ ہو کوئی تو بیدار بخت یا زمان چچا کے پاس جاتے ہیں۔ آپ میں سے کوئی بیدار بخت کے مقابلے میں کھڑا ہوگا تو جیتنے کا زیادہ امکان ہے علاقے کے لوگ آپ لوگوں کی عزت کرتے ہیں ایک نام ہے سب کا۔ دلاور چاچو کو لوگ زیادہ پسند نہیں کرتے۔"

امان شاہ بھی یہاں ہی رہتا تھا اور علاقے کے لوگوں سے ملتا جلتا رہتا تھا اس لیے اندازہ تھا اسے۔

"کیوں میرے بھائی نے کیا ظلم توڑے ہیں علاقے والوں پر کہ وہ پسند نہیں کرتے انہیں۔ اور ان کی عزت کیوں نہیں ہوگی۔ انہوں نے کوئی کسی کی۔" وہ مردوں کی موجودگی کا خیال کرکے مزید کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔

"اس لیے چھوٹی امی! کہ وہ سال کے گیارہ مہینے تو حیدر آباد رہتے ہیں سب اور ان گیارہ مہینوں میں چھ سات مہینے دلاور چچا اسلام آباد ہوتے ہیں۔

فصل کٹنے اور پھل اُترتے وقت ملا جلا کر وہ ایک ماہ یہاں رہتے ہیں اور علاقے کے لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں نے ایک خیال ظاہر کیا تھا آپ کو برا لگا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔'' ایمان نے ماں کی طرف دیکھا جو گھبرائی گھبرائی سی بیٹھی تھیں اس لیے معذرت کرلی۔

اس کے اس خیال سے دل ہی دل میں سب متفق تھے، لیکن ثمرہ کی دل آزاری نہ ہو اس خیال سے مہران شاہ نے کہا۔

''امان نے ایک سنی سنائی بات کی ہے بھابی! اس کا خیال غلط بھی ہوسکتا ہے۔ اور مجھے تو یوں بھی سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہم پہلے کی طرح اس بار بھی دلاور بھائی کو سپورٹ کریں گے اور کیا تایا جان یہاں آگئے ہیں۔'' ثمرہ کے ماتھے کے بل کچھ کم ہوئے تھے۔ لیکن وہ اب بھی ناراضی سے امان کو دیکھ رہی تھی۔

''میری بابا جان سے بات نہیں ہوسکی وہ اور دلاور بھائی دو دن سے اسلام آباد گئے ہوئے تھے اپنی پارٹی کی میٹنگ میں اور مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں کہ وہ یہاں آگئے ہیں یا اسلام آباد سے حیدرآباد واپس آئے ہیں۔''

''میری صبح ان سے بات ہوئی تھی وہ کچھ دیر تک پہنچ جائیں گے یہاں۔ مغرب کے بعد ہی انہوں نے سب کو بلایا ہے۔ آس پاس کے علاقوں کے کچھ معززین بھی ہیں۔ زیادہ امکان یہ ہی ہے کہ جو بات چیت بھی ہوگی وہ الیکشن کے حوالے سے ہی ہوگی۔'' زمان شاہ کھڑے ہوگئے تھے۔

''باغات کے ٹھیکے کے لیے کچھ لوگوں نے آج ڈیرے پر آنا ہے۔ میں ان سے بات چیت کر کے گھر آجاؤں گا۔'' ثوبان شاہ نے سر ہلاتے ہوئے پاس پڑی کین کی چھوٹی سی ٹیبل سے اخبار اٹھایا۔

''مہران یہ جواد احمد کے کالم پڑھتے ہو کیا۔ بہت زبردست لکھتا ہے، بہت گہری نظر ہے اس کی اور بہت عمیق مشاہدہ ہے۔''

''نہیں بھائی جان، مجھے کہاں وقت ملتا ہے کچھ پڑھنے کا۔'' مہران شاہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''چچا جان تو بس ہر وقت اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کی مل کا سوتر دنیا کا سب سے بہترین سوتر ہو۔'' ریحان نے جو خاموش بیٹھا سب کی باتیں سن رہا تھا مسکرا کر مہران شاہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی مسکرا دیے۔

''ہاں میری اور نومی کی ایسی ہی خواہش ہے کہ پوری دنیا میں ہمارے سوتر کی مانگ ہو۔''

''کبھی فرصت ملے تو پڑھنا جواد احمد کے کالم کو۔ بہت بے باک اور نڈر ہے۔ سنا ہے ینگ ہی ہے۔'' ثوبان شاہ کی نظریں اخبار پر ہی تھیں۔ ثمینہ اور صفورا بور ہو کر اٹھ گئی تھیں۔ ثمرہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی تھی کہ شایان جو کچھ دیر پہلے اٹھ کر چلا گیا تھا واپس آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ماؤزر تھا۔

''یہ کہاں سے لیا ہے۔'' ثوبان شاہ کی نظریں اس کے ہاتھ میں موجود پسٹل پر تھیں۔

''ہادی بھائی سے لیا ہے۔'' اس نے ذلاور شاہ کے بیٹے کا نام لیا۔ اسے مختلف قسم کا اسلحہ جمع کرنے کا شوق تھا۔

''لائسنس ہے تمہارے پاس۔'' ثوبان شاہ نہیں چاہتے تھے کہ شایان کے پاس کسی قسم کا اسلحہ ہو وہ جذباتی، غصیلا اور ضدی مزاج کا تھا۔

''ہادی بھائی بنوادیں گے۔ کیسا ہے؟'' اس نے مہران شاہ کی طرف بڑھایا۔ ''میں یہ آپ کو دکھانے کے لیے لایا ہوں۔''

''اچھا ہے۔'' مہران شاہ نے الٹ پلٹ کر اسے دیکھا۔ کراچی جانے سے پہلے انہیں بھی اچھی قسم کی گن رکھنے کا شوق تھا۔

''اس میں گولیاں ہیں بھائی۔'' امان نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

''گولیوں کے بغیر تو یہ محض لوہے کا ٹکڑا ہی ہے نا۔'' وہ مسکرایا۔

''پتا ہے چچا جان وہاں لاہور میں امان کے نانا

جان کے پاس اسٹیفن سن کی بہت خوب صورت گن تھی چھروں والی۔ وہ بتا رہے تھے کہ ینگ ایج میں انہیں شکار کا شوق تھا تو اپنے کسی دوست کے والد سے خریدی تھی اور پتا ہے وہ بتا رہے تھے ان کے ابا جان کے پاس تھری ناٹ تھری کی گن بھی تھی۔ جو کہیں ادھر ادھر اسٹور میں پڑی ہوگی۔ میں نے ہادی بھائی کو بتایا تو وہ تو تڑپ ہی اٹھے دونوں گنز دیکھنے کے لیے۔" اس نے مہران شاہ کے ہاتھ سے اپنا ماؤزر لیا اور الٹ پلٹ کر دلچسپی سے دیکھنے لگا۔

"بڑی امی جب بھی آپ لاہور جائیں اور نانا جان کو وہ گن مل جائے تو لے آیئے گا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا وہ بی بی اماں سے نہیں گے ڈھونڈ نے کے لیے۔" بے دھیانی میں اس کے منہ سے نانا جان نکل گیا تھا کہ لاہور کے قیام کے دوران جہاں زیب بیگ کے کہنے پر وہ انہیں نانا جان ہی کہنے لگا۔ ثمرہ تڑپ اٹھی تھیں اور اختر بانو کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"لے آؤں گی۔ لیکن اسے تو رکھو نا الجھن ہو رہی ہے مجھے۔"

"لیجیے رکھ دیتا ہوں۔" اس نے ماؤزر ٹیبل پر رکھ دیا۔ لاہور سے واپس آنے کے بعد اس کا رویہ اختر بانو کے ساتھ بدل گیا تھا وہ جو پہلے ان سے بھی کوئی بات نہیں کرتا تھا اب باتیں کرنے لگا تھا۔

"ویسے بڑی امی! میں کئی دنوں سے ایک بات سوچ رہا ہوں کہ اب ہمارے گھر میں بھی شادی کے شادیانے بجنے چاہئیں۔ ریحان بھائی اور نومی بھائی کی شادی کے متعلق کیا خیال ہے آپ کا۔"

"ہاں اب نومی اور ریحان کی شادی ہو جانی چاہیے۔" مہران شاہ نے بھی تائید کی تو ریحان نے یک دم ہاتھ جوڑے۔

"مجھے تو ابھی معاف ہی رکھیں۔ جب تک میری تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی میں شادی کا سوچنا بھی نہیں چاہتا۔ ہاں نومی بھائی کی شادی کا آئیڈیا اچھا ہے۔"

"ہاں میں بھی سوچ رہا تھا کہ یہ فریضہ اب ادا ہو جائے تو اچھا ہے۔" ثوبان شاہ نے اخبار واپس رکھ دیا۔

"میرے ذہن میں سلطانہ کی بیٹی ہے۔ بی اے کر چکی ہے۔ سلطانہ کے سسرالی عزیزوں میں سے رشتے آ رہے ہیں اس کے۔ سلطانہ نے پچھلے ہفتے بات کی تھی مجھ سے ان رشتوں کے متعلق لیکن میں نے کوئی بات نہیں کی ابھی نومی کے متعلق اگرچہ دل میں کافی عرصے سے خیال تھا کہ سلطانہ کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں گا۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر تمہاری مرضی ہو تو سلطانہ سے باقاعدہ رشتے کی بات کریں۔" انہوں نے اختر بانو سے پوچھا۔

"میں..... میں کیا کہوں جو آپ کی مرضی۔" اختر بانو جیسے کسی خیال سے چونکی تھیں۔

"تم ماں ہو اختر بانو! تمہاری مرضی کے بغیر تو تمہارے بیٹے کا رشتہ طے نہیں کریں گے ہم۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے۔" ثوبان شاہ کی سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔

"نہیں۔" اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا۔ آپ نومی سے پوچھ لیجیے گا۔ اور نومی بھائی کو میرے خیال میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا کہ وہ تو یوں بھی پھپھو اور ان کی فیملی سے بہت اٹیچڈ ہیں۔" ریحان نومی کے دل کی بات جانتا تھا۔ اسے سلطانہ پھپھو کی بیٹی زارا پسند تھی۔ اختر بانو کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"پھر بھی نومی کی مرضی معلوم کرنا ضروری ہے۔ اتنے عرصہ سے کراچی میں رہ رہا ہے۔ سلطانہ کے ہاں بھی کم ہی جانا ہوتا ہے۔ کیا پتا اپنی شادی کے متعلق اس کی کیا سوچ ہے۔ کیسی بیوی چاہتا ہے۔"

"یہاں سے واپس جا کر میں نومی سے بات کر لوں گا۔" ثوبان شاہ کو اختر بانو کی بات صحیح لگی تھی۔

"تو بس پھر جلدی شادی کیجیے گا۔ خوب مزا آئے گا۔ آپ کے میکے سے بھی سب آئیں گے نا۔ ہم ساری رسمیں کریں گے تاکہ ان کو بھی ہماری رسموں

کا پتا چلے۔ ہمارے ہاں کی شادی کی کچھ رسمیں مختلف ہیں۔'' شایان نے بات کرتے کرتے پھر ماؤزر اٹھا لیا تھا اور اسے مختلف زاویوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر یک دم ہی اس نے اس کا رخ امان کی طرف کیا۔

''اگر اس وقت میں اس کا ٹریگر دبا دوں تو۔'' وہ شرارت سے امان کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ کیا حماقت ہے شایان، رکھو اسے اب۔''

مہران جو اپنے فون پر کوئی نمبر ملاتے ہوئے اٹھے تھے انہوں نے اسے ڈپٹا اور نمبر ملنے پر بات کرتے ہوئے صحن کی طرف چلے گئے۔

''تو امان میرے بھائی۔ اگر میں تم سے کہوں کہ میں تم پر گولی چلانے والا ہوں تو تمہارے دل کی کیا حالت ہوگی۔'' وہ جیسے محظوظ ہو رہا تھا۔ اختر بانو کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔'' امان نے کندھے اچکائے، ثوبان شاہ نے تشویش بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

''شانی، یہ کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔''

''بے فکر رہیں بابا جان! میں کبھی امان کو مار نہیں سکتا۔'' اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ نیچے کر لیا۔

''اگرچہ یہ سوتیلا بھائی ہے۔ ہماری تاریخ میں تو بادشاہوں نے اپنے سگے بھائیوں اور بیٹوں کو مروایا ہے۔''

اسے الٹا سیدھا بانکنے کی عادت تھی لیکن ثوبان شاہ کو غصہ آ گیا تھا۔ جس پر انہوں نے قابو پانے کی کوشش کی تھی لیکن ایک خفگی بھری ناراض نظر اس پر ڈالی تھی۔ لیکن وہ بھی شایان شاہ تھا اسے کسی کی ناراضی اور خفگی کی کم ہی پروا ہوتی تھی۔

''ویسے بابا جان، آپ کو تاریخ سے دلچسپی ہے۔ مطالعہ بھی ہے آپ کا بہت ہے یہ تو بتائیں کہ اقتدار کے لیے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کو مارنا ضروری کیوں تھا۔ اور بھی تو طریقے ہو سکتے تھے۔ ان سے جان چھڑانے کے۔ کوئی ایسی حکمت عملی اختیار کرتے کہ سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔''

''شایان تم! اپنے نانا جان سے کہو اس بار وہ تمہیں صوبائی اسمبلی کے لیے کھڑا کریں کامیاب رہو گے۔'' ریحان نے ثوبان شاہ کی خفگی محسوس کر کے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''ضرور کھڑا ہو جاتا ریحان بھائی! لیکن ابھی تو دو سال کے لیے میں لاہور جا رہا ہوں پڑھنے۔ پنجاب یونی ورسٹی میں ایڈمیشن کے لیے اپلائی کیا ہے۔ میں نے۔''

''گڈ۔'' ریحان نے خوشی کا اظہار کیا۔

''لیکن میں نے تمہیں منع کیا تھا شانی، کہ تمہیں لاہور میں ایڈمیشن نہیں لینا۔'' ثمرہ کا خیال تھا کہ اس کے منع کرنے سے اس نے ارادہ بدل لیا ہوگا۔

''لیکن کیوں؟'' وہ ثمرہ کی طرف مڑ گیا تھا۔

''بس میں نے کہہ دیا ہے نہیں تو بس نہیں۔'' ثمرہ کا انداز حتمی تھا۔

''اگر تمہیں ایسا ہی ماسٹر کا شوق چرایا ہے تو کراچی سے کر لو۔ یا حیدر آباد سے ہی۔ اتنی دور لاہور جانے کی ضرورت نہیں۔''

''آپ میرے لاہور جانے سے اتنی خوفزدہ کیوں ہیں۔ کیا آپ کو ڈر ہے کہ بابا جان کی طرح مجھے بھی پنجاب کی کوئی کڑی (لڑکی) پسند آ جائے گی۔''

''سوچ سمجھ کر بولنے کی تو اسے عادت ہی نہیں تھی۔ جہاں ثوبان شاہ کا رنگ سرخ ہوا تھا وہاں اختر بانو کے چہرے کی رنگت بھی بدلی تھی لیکن وہ ثمرہ کی طرف متوجہ تھا۔ ''لیکن بے فکر رہیں۔ شادی میں گل رعنا سے ہی کروں گا۔ میرے لیے گل رعنا سے زیادہ حسین اور کوئی لڑکی ہو ہی نہیں سکتی۔ چاہیں تو لاہور جانے سے پہلے نکاح کر دیں میرا۔''

ثوبان شاہ کی موجودگی سے بے پروا ہو کر وہ ثمرہ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اور ثوبان شاہ کو لگا تھا کہ کسی نے سچ کہا تھا کہ شخصیت کی اٹھان میں ماحول بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور ان سے غلطی ہوئی کہ انہوں نے ثمرہ کو اسے حیدر آباد لے جانے کی

اجازت دی تھی۔ ریحان، نومی، امان کوئی بھی اس کی طرح منہ پھٹ اور بے باک نہیں تھے۔

"فضول بولے جارہے ہو تم۔ مجھے ایسا کوئی ڈر نہیں ہے۔" ثمرہ کو برا لگا تھا کہ اس کی شادی گل رعنا سے کرنے کا خیال ان کے اور ان کے میکے والوں کے درمیان تھا۔ ابھی تک تو انہوں نے اپنا ارادہ ثوبان شاہ پر بھی ظاہر نہیں کیا تھا اور یہ شانی کا بچہ۔

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم لاہور کے بجائے کراچی میں ہی پڑھو۔"

"اوہ اب سمجھا۔ آپ کو بڑی امی کے میکے والوں کا خوف ہے کہ میں نہیں ادھر جاجا کر ان کی محبتوں کا اسیر نہ ہو جاؤں کیونکہ آپ بھی جانتی ہیں کہ وہ سب بہت پیارے محبت کرنے والے مخلص لوگ ہیں۔" وہ بھی ایک کائیاں تھا۔

"لیکن آپ بے فکر رہیں، میرا نانا جان مطلب امان کے نانا جان کے گھر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہمارا خیال تو ہاسٹل میں رہنے کا تھا لیکن بابا جان کہہ رہے ہیں کہ دو بیڈ کا اپنا اپارٹمنٹ لے لو۔ ایک ملازم یہاں سے ساتھ چلا جائے گا۔ اور مجھے بابا جان کی بات پسند آئی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ اپارٹمنٹ ٹھیک رہے گا یا ہاسٹل۔"

وہ آنکھوں میں شرارت کی چمک لیے تھوڑا سا ثمرہ کی طرف جھکا۔ غصہ ضبط کرنے کی کوشش میں ثمرہ کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"بس شایان، بہت ہو گیا۔" انہوں نے دایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا کر تنبیہ کی۔

"تم لاہور نہیں جاؤ گے۔ اور اگر گئے تو میرا مرا ہوا منہ دیکھنا۔"

شایان لمحہ بھر انہیں دیکھتا رہا پھر زور سے ہنس دیا۔

"میں اب بڑا ہو گیا ہوں ڈیر مدر۔ اس طرح کی ایموشنل بلیک میلنگ نہیں چلے گی۔ میں بچہ تھا تب آپ کی اس طرح کی دھمکیوں سے ڈر جاتا تھا۔" ثمرہ کی عادت تھی کہ جب انہیں کوئی بات منوانی ہوتی تو یوں ہی مر جانے کی دھمکی سے ڈراتی تھیں اسے اور وہ مان بھی جاتا تھا۔

اختر بانو ہاتھ گود میں رکھے سہمی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ امان نے دیکھا گود میں رکھے ان کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اسے دکھ ہوا۔ حویلی کی بڑی بہو اور حویلی کا سارا انتظام سنبھالنے والی، تین جوان بیٹوں کی اس کی ماں آج بھی سہمی سہمی سی تھی۔ اس نے تاسف سے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا جو اختر بانو کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے تھے۔

"ثمرہ، ختم کرو اس تماشے کو اب۔" ثوبان شاہ کو لگا تھا کہ اب ان کا بولنا ضروری ہو گیا ہے ثمرہ کے ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے سب کی موجودگی میں انہیں بے حد سبکی اور توہین کا احساس ہو رہا تھا وہ ایک دم اٹھیں۔

"تو ٹھیک ہے دیکھ لو تم بھی اس بار صرف دھمکی نہیں دے رہی میں۔"

"اوں ہوں۔" بائیں ہاتھ سے شایان نے ثمرہ کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"آپ جیتیں میں ہارا۔ میں لاہور نہیں جاؤں گا لیکن ایک شرط پر میرے قبرستان جانے پر آپ کو اب اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔" اس نے یک دم دایاں ہاتھ اونچا کر کے ماؤزر اپنی کنپٹی پر رکھا۔ اور مسکرایا۔ "دادا جان کے دائیں طرف والی خالی جگہ میں بابا۔"

"نہیں!" اختر بانو کے لبوں سے چیخ کی طرح نکلا تھا۔ اور وہ بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔

"شا۔نی!" ٹوٹ کر ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ "نہیں۔"

اس کے قریب پہنچ کر انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ماؤزر لینے کے لیے ہاتھ اونچا کیا اور پھر لہرا کر گرنے لگی تھیں کہ شایان نے ماؤزر نیچے پھینک کر دونوں بازوؤں میں انہیں سنبھالا۔ ثوبان شاہ، امان شاہ اور ریحان جو سکتے کے عالم میں کھڑے تھے تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔

"بڑی امی۔ بڑی امی۔ میں تو بس یوں ہی کہہ رہا تھا کیا ہو گیا ہے آپ کو۔"

وہ انہیں بازوؤں میں سنبھالے کہہ رہا تھا لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھیں۔ امان نے قریب آ کر انہیں شایان سے لے لیا۔ دبلی پتلی نازک سی اختر بانو کو بازوؤں میں سنبھالے وہ تیز تیز چلتا ہوا برآمدے میں آیا اور وہاں موجود پلنگ پر لٹایا۔ اور بے چینی سے آواز دی۔

"اماں جان۔ اماں جان پلیز۔ آنکھیں کھولیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔"

"ریحان بیٹا! اپنی ماں کو دیکھو۔" ثوبان شاہ اور ریحان بھی اس کے ساتھ ہی برآمدے میں آئے تھے۔

"مانی حوصلہ!" ریحان نے امان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ہٹا کر خود اختر بانو کی نبض چیک کرنے لگا جو بہت مدھم تھی۔

"بھائی!" ثوبان شاہ نے بلند آواز میں پکارا۔ "بی۔ پی چیک کرنے والا آلہ لے کے آؤ۔ صفورا بھابی کے کمرے سے۔"

"ریلیکس بابا!" ریحان نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی ان کی کلائی پر تھا۔ نبض بہت مدھم تھی۔ امان اب ان کے ہاتھ مل رہا تھا اور اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں

شایان اور ثمرہ صحن میں اکیلے رہ گئے تھے۔ شایان کچھ دیر یوں ہی کھڑا رہا پھر اس نے ثمرہ کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے میں آ گیا۔ ریحان بی۔ پی چیک کر رہا تھا۔

"بہت لو ہے۔" اس نے بی۔ پی آپریٹر ایک طرف رکھا اور ثوبان شاہ کو بتایا۔

"پانی میں تھوڑا سا نمک اور لیموں ڈال کر لے آؤ۔" ثوبان شاہ نے بھابی سے کہا جو ابھی تک وہاں ہی کھڑی تشویش سے اختر بانو کو دیکھ رہی تھی۔

"اماں جان کا دل بہت کمزور ہے۔ شاید وہ شانی کی اس اچانک حرکت کو برداشت نہیں کر سکیں۔ شاید خوف زدہ ہو گئی تھیں۔"

امان اب ان کے پاؤں کے تلوے سہلا رہا تھا اور ریحان چمچ سے انہیں پانی پلا رہا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولتی پھر بند کر لیتی تھیں۔

"میں تمہیں اتنا کم حوصلہ نہیں سمجھتا تھا اختر۔"

انہوں نے آنکھیں کھولیں تو ثوبان شاہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا لیکن ثوبان شاہ کی طرف دیکھنے کے بجائے ان کی نظریں ان کے قریب کھڑے شایان پر پڑی تھیں۔ جس کی آنکھوں میں اب بھی حیرت تھی۔ اور ایک اطمینان بھرا سانس لے کر اٹھنے کی کوشش کی تو امان نے انہیں اٹھنے میں مدد دی تھی۔

"آپ کے ساتھ پہلے بھی کبھی ایسا ہوا؟" ریحان پریشان سا انہیں دیکھ رہا تھا۔

"کبھی دل بہت گھبرایا ہو لگا ہو کہ ہارٹ بیٹ مس ہو رہی ہے۔"

"دل تو اکثر گھبرایا ہی رہتا ہے لیکن جب ہارٹ بیٹ مس ہوتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت کے لیے لگتا ہے کہ بس دل بند ہو گیا ہے۔"

وہ ہاتھوں کی پشت سے پسینے کے قطرے پونچھ رہی تھیں۔

"میرا خیال ہے مانی بیٹے! اپنی اماں جان کو کمرے میں لے چلو۔ یہاں یہ بے آرام سی ہیں۔"

ثوبان شاہ نے کہا تو امان نے سر ہلایا اور اختر بانو کے منع کرنے کے باوجود ایک بازو ان کے گرد حمائل کیے سہارا دیتا بیڈ روم میں آ گیا۔ ثوبان شاہ اور ریحان اور شایان بھی ساتھ ہی کمرے میں آئے تھے۔ اور روم چیئرز پر بیٹھ گئے تھے جبکہ امان ان کے بیڈ پر ہی بیٹھا ہوا تھا۔

"میں اب ٹھیک ہوں۔ آپ سب پریشان نہ ہوں۔" اختر بانو نادم سی تھیں کہ ان کی وجہ سے سب پریشان ہیں۔

"آپ نے پہلے کبھی کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو

دکھایا۔" ریحان کی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"نہیں۔" اختر بانو نے نفی میں سر ہلایا۔ "کوئی ایسی خاص تکلیف تو نہیں تھی کہ ڈاکٹر کو دکھائی بس یہ ہارٹ بیٹ کا ہی تھوڑا سا مسئلہ تھا۔ پندرہ سولہ دھڑکنوں کے بعد لگتا تھا جیسے ایک دھڑکن مس ہوگئی ہو۔ وہاں لاہور میں مہرین سے ذکر کیا تھا کہ دل بہت گھبراتا ہے تو اس نے کہا تھا کہ آپ کو کسی ہارٹ اسپیشلسٹ کو دکھانا چاہیے۔ آپ کی ہارٹ بیٹ اریگولر ہے۔ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ رخسانہ تائی کو بھی یہ پرابلم ہے لیکن پھر بھی آپ چیک کروالیں۔"

"آپ نے مجھ سے وہاں ذکر کیوں نہیں کیا۔ شاہ زیب کا جو ڈاکٹر علاج کررہے ہیں۔ ان کے ایک کزن پنجاب کارڈیالوجی میں ہیں۔ زین بھائی بتارہے تھے مجھے ایک دن کہ ان کے دوست کے علاوہ اس کے خاندان میں سب ہی ڈاکٹر ہیں۔"

امان اس کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ "زین نے کہا تھا کہ وہ مجھے لے چلے گا۔ لیکن بس شادی کی مصروفیت میں خیال ہی نہیں رہا۔ پھر شادیاں بھی تو ایک نہیں تین تھیں۔"

اختر بانو کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"خیر اب زین کی شادی پر جاؤں گی یا شاید مرتضیٰ کی شادی ہی پہلے ہوجائے تو پھر چیک کروالوں گی۔ تم پریشان مت ہو بیٹا۔"

"کیوں کیا یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے کہ آپ ایک سال انتظار کریں گی۔"

ریحان کی کشادہ پیشانی پر شکن نمودار ہوئی اور پھر اس نے ثوبان شاہ کی طرف دیکھا۔

"بابا! صبح میں اماں جان کو حیدرآباد لے کر جارہا ہوں۔ وہاں میرے دوست کے فادر کا اپنا چھوٹا سا ہاسپٹل ہے۔ ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ امریکہ سے ڈگری لے کر آئے ہیں۔ اگر انہوں نے کہا تو کراچی لے جائیں گے۔"

ثوبان شاہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اختر بانو کی طرف دیکھا۔

"تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا اختر! کہ تمہیں کوئی تکلیف ہے۔"

اختر بانو نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔ ثوبان شاہ دل ہی دل میں نادم سے ہوگئے۔ کتنے سال ہوگئے تھے کہ ان کے درمیان رسمی ہاں ہوں کے سوا کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ نادم سے ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں ذرا زمان اور مہران کی طرف جارہا ہوں۔ رات ڈیرے پر جانے سے پہلے آپس میں بھی کچھ طے کرنا ہے کہ ہمارا کیا جواب ہو۔ اور اختر اب آرام کرو۔ اٹھ کر کچن میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بھاگی اور تاج کو سب پتا ہوتا ہے کہ کیسے اور کیا کرنا ہے۔"

وہ کمرے سے نکلے تو ریحان بھی ان کے پیچھے ہی گیا تھا۔

"بابا آپ کو اماں جان کا خیال رکھنا چاہیے۔ کتنی کمزور ہورہی ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ان کا ایچ۔بی بھی بہت کم ہے۔ گو ہارٹ بیٹ کا مس ہونا اتنا خطرناک نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں کوئی وین وغیرہ نہ بند ہو۔"

"اس نے مجھے کبھی بتایا نہیں ریحان کہ اسے کوئی تکلیف ہے۔ اسے بتانا چاہیے تھا مجھے۔ اگر بتاتی تو کیا میں اسے کسی ڈاکٹر کی طرف نہ لے کر جاتا۔ اب مجھے خواب تو نہیں آنا تھا کہ اسے کچھ تکلیف ہے۔"

غیر ارادی طور پر ان کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔ ریحان نے حیران ہوکر انہیں دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں تو وہ شرمندہ سے ہوگئے۔ بھلا میں کیوں سچ ہوا۔ سچ ہی تو کہہ رہا ہے ریحان مجھے اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی ایسی ہے کم گو اور اپنی تکلیف کا اظہار نہ کرنے والی۔ انہیں یاد آیا تھا کہ شادی کے چند ماہ بعد کی بات تھی اسے بخار تھا اور اس نے انہیں بتایا ہی نہیں۔ اور کچن میں ماسی تاج وغیرہ کو ہدایات دینے

اوران کی مدد کرنے چلی گئی۔ بلکہ ان کی فرمائش پر ایک دو ڈشز خود بھی بنائیں کہ اس روز انہوں نے کچھ دوستوں کو دعوت پر بلا رکھا تھا لیکن جب وہ کچن سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو وہ تیار ہو کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے اپنا جائزہ لے رہے تھے مڑ کر اسے دیکھا تو اس کا لال بھبوکا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ پہلا خیال جوان کے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ شاید دادی جان نے کچھ کہا ہے کہ دادی اور دادا جان اس شادی کے لیے دل سے رضامند نہ تھے۔

"کیا ہوا؟" وہ اس کے قریب آئے تھے اور اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر فوراً ہی اٹھا لیا تھا۔

"اوہ میرے خدا تمہیں تو بخار ہے۔"

"گلے میں تکلیف ہے۔ شاید گلے میں انفیکشن ہے اسی لیے بخار ہو گیا ہے۔ جب بھی گھر میں بھی ٹھنڈی چیز کھاتی تھی تو ہو جاتا تھا۔"

"تو بتانا تھا نا یار! میں آج دوستوں کی دعوت نہ کرتا۔ بلکہ تم بتا دیتیں تو میں تم سے فرمائش نہ کرتا خود کچھ پکانے کی۔"

"میں نے سوچا تھا۔ آپ کو خود ہی پتا چل جائے گا۔" وہ سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"کیا مجھے الہام ہونا تھا؟" وہ جھنجلائے تھے۔

"کیا اب الہام ہوا ہے؟" وہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے مسکراتی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"تم بھی نا اختر۔" وہ بے اختیار ہنس پڑے تھے لیکن بخار چیک کیا تو وہ ایک سو تین تھا۔

وہ گھبرا کر فوراً ہی اسے ڈاکٹر کی طرف لے گئے تھے اور زمان سے کہہ گئے تھے کہ وہ ان کے دوستوں کا استقبال کر لے۔ وہ اختر کو ڈاکٹر کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔ اور اس روز کے بعد سے وہ خود ہی اس کا خیال رکھنے لگے تھے۔ ان کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

انہوں نے ریحان سے کہنا چاہا کہ وہ آئندہ خیال رکھیں گے لیکن ریحان واپس جا رہا تھا۔ وہ بھی لیونگ کی طرف چلے گئے۔ جہاں مہران اور زمان موجود تھے۔ ریحان کمرے میں واپس آیا تو سب خاموش تھے۔ شایان بیڈ کے نزدیک کرسی پر بیٹھا تھا۔

"سوری بڑی امی! میری وجہ سے آپ کی طبیعت خراب ہوئی۔" اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"سوری مت کرو بیٹا! میں بس ڈر گئی تھی کہ تمہیں کچھ ہو گیا تو ثمرہ آپا کیا کریں گی۔ وہ تو ایک پل تمہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں۔" اس نے شایان کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں نے سب کو ہی پریشان کر دیا۔" اس نے امان اور ریحان کی طرف معذرت طلب نظروں سے دیکھا تو امان مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں یار۔ ویسے ہمیں تو تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تم اگر وہ حرکت نہ کرتے تو ہمیں کیسے پتا چلتا کہ ہماری اماں جان کا دل اتنا کمزور ہے اور وہ اسے کوئی روگ لگائے بیٹھی ہیں۔"

"ماؤں کے دل اپنی اولاد کے معاملے میں کمزور ہوتے ہیں انہیں کانٹا بھی چبھے تو ان کے دل پر قیامت گزر جاتی ہے۔"

"لیکن میں تو آپ کی اولاد نہیں ہوں بڑی امی۔" بے اختیار ہی شایان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"مائیں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں بیٹا چاہے امان کی ماں ہو چاہے تمہاری۔"

اختر بانو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر سے اٹھایا تو شایان چونکا یہ ہاتھ جو ابھی اس کے ہاتھ پر رکھا تھا اس لمس میں کیا تھا؟ مامتا کی شفقت، محبت اور اخلاص۔ وہ دل ہی دل میں اپنی کہی بات پر شرمندہ ہوا۔ سچ ہی تو کہہ رہی تھیں وہ کہ ماں تو ماں ہوتی ہے بھلے وہ کسی کی بھی ہو۔ لیکن اگر امان اس طرح کی حرکت کرتا تو کیا ثمرہ کا ردعمل بھی ایسا ہی ہوتا جیسے اختر بانو کا تھا شاید نہیں۔ شاید سب مائیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ ثمرہ بھی مختلف ماں تھی۔

وہ خاموش بیٹھا تھا اختر بانو اسے گاہے گاہے نظر

اٹھا کر دیکھ لیتی تھیں۔

''ایک بات کہوں بیٹا۔ مانو گے۔''

''جی بڑی امی! آپ کہیں۔''

''اپنی بات منوانے کے لیے پھر کبھی یہ طریقہ اختیار نہ کرنا۔ آپ اپنی بات پیار سے لاڈ سے اور ضد کر کے بھی منوا سکتے ہو۔ ماں ہیں تمہاری مان ہی جاتیں آخر۔''

''بات منوانے کا یہ طریقہ مجھے انہوں نے ہی تو سکھایا ہے بڑی امی! بچپن سے یہ ہی تو کرتی آ رہی ہیں میرے ساتھ۔ یہ نہیں کرو گے تو مر جاؤں گی۔ وہ نہیں کرو گے تو چھت سے چھلانگ لگا دوں گی پھر روتے رہنا ساری زندگی وغیرہ وغیرہ، میں نے تو پہلی بار ان کا پڑھایا ہوا سبق دہرایا ہے۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔

''یہ آپ مائیں بڑی بلیک میلر ہوتی ہیں۔ وہ اس طرح بلیک میل کرتی تھیں۔ دھمکی دے کر اور آپ نے اس طرح عملی مظاہرہ کر کے کر لیا۔ بہر حال پرامس اب میں ایسا کبھی نہیں کروں گا اور یہ میرا وعدہ ہے۔ شایان ثوبان شاہ کا اپنی بڑی امی سے۔''

وہ ذرا سا مسکرایا تو اختر بانو کی نظریں کتنی ہی دیر اس کے چہرے پر ٹھہری رہیں۔ اس کی مسکراہٹ میں شاہ زیب کی مسکراہٹ کی جھلک تھی۔ حالانکہ امان کی زیادہ مشابہت تھی۔ شاہ زیب سے۔ لیکن وہ بھی کہیں نہ کہیں کچھ مشابہت رکھتا تھا۔ شاہ زیب سے اور اس طرح اتنے غور اور دھیان سے پہلے کب اس نے شایان کو دیکھا تھا۔

''تھینک یو بیٹا!'' وہ ممنون ہوئی تھیں۔

''تھینک یو کا کیا مطلب ہے۔ بڑی امی۔'' اس نے مصنوعی ناراضی سے اسے دیکھا۔ ماؤں کو تو حکم دینا چاہیے۔ یہ تھینک یو تو غیروں سے کہا جاتا ہے بڑی امی۔''

اختر بانو نے محبت بھری نظر اس پر ڈالی۔

''ماں ہونے کا جو مان تم نے دیا ہے اس کے لیے اب شکریہ نہیں کہوں گی۔ اب جاؤ ثمرہ آپا تمہارے یہاں اتنی دیر ٹھہرنے سے پریشان ہو رہی ہوں گی۔ ماں ہے نا۔ دل دہل گیا ہوگا۔ اور یہ آخر تم لاہور ہی کیوں جانا چاہتے ہو۔ ماں کا دل دکھا کر مت جانا۔ ان کی خوشی اور رضامندی سے ہی جانا۔''

''کیوں کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے البتہ کوشش کروں گا کہ امی مان جائیں۔ ویسے کیا آپ بھی چاہتی ہیں کہ میں لاہور نہ جاؤں۔'' وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

''نہیں، میں بھلا ایسا کیوں چاہوں گی۔ میں تو خوش تھی کہ چلو دونوں بھائی اکٹھے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے بڑی امی! آپ آرام کریں۔ میں چلتا ہوں۔''

وہ ایک نظر تینوں پر ڈالتا ہوا باہر چلا گیا۔ باہر برآمدے میں آ کر وہ کچھ دیر کھڑا رہا۔ سوچا اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر سو جائے۔ رات دیر سے سویا تھا اور صبح جلدی آنکھ کھل گئی تھی لیکن پھر وہ ثمرہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ وہ غصے میں ہوں گی اور ایسا ہی تھا۔

''آ گئے ہو اپنی بڑی امی کی خدمت کر کے۔'' اسے دیکھتے ہی وہ بولیں۔

''میں نے بھلا کیا خدمت کرنی تھی ان کی۔ ان کے دو جوان بیٹے اور شوہر نامدار موجود تھے وہاں۔'' اس نے ثمرہ کے لہجے کو نظر انداز کیا ''میں تو معذرت کرنے گیا تھا کہ میری وجہ سے ان کی طبیعت خراب ہوئی۔''

''طبیعت خراب ہو گئی تھی یا ڈرامہ کیا تھا اس نے؟'' طنز کرتا ہوا تلخ لہجہ اس بار شایان نظر انداز نہ کر سکا۔

''کیا آپ وضاحت کریں گی کہ انہیں ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اور تمہیں یہ احساس دلانے کے لیے کہ اسے تمہاری بہت فکر ہے۔''

ثمرہ سٹپٹا گئی تھیں۔

"اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی وہ سب کی توجہ میں ہوتی ہیں۔" وہ سنجیدہ سا کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ "اور وہ ایک فوری ردعمل تھا۔ اور وہ مجھ سے زیادہ آپ کے لیے پریشان ہوگئی تھیں۔ ماں تھیں تو ایک ماں کے احساسات کو سمجھتی تھیں۔"

ثمرہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا اور پھر یہ سوچ کر خاموش ہوگئیں کہ اگر اس وقت اس نے اختر بانو کے خلاف کوئی بات کی تو وہ بھڑک اٹھے گا۔ لیکن وہ اختر بانو کو ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دے سکتی تھیں کہ وہ شایان کے دل کو اپنی مٹھی میں لے لے۔ تو لمحہ بھر سوچنے کے بعد وہ بولیں تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"غیر ہو کر اس نے میرا احساس کیا اور تم نے بیٹا ہو کر میرے متعلق نہیں سوچا۔ جھٹ کنپٹی پر پستول رکھ لیا۔ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں نے اسی پستول سے دوسری گولی خود کو مار لینی تھی۔ میں تو سکتے میں تھی اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں سکی۔ وہ ماں نہیں تھی تمہاری اس لیے اس کے دل پر اس طرح اثر نہیں ہوا تھا۔ جس طرح میرے دل پر ہوا تھا اسی لیے وہ بھاگ کر تم تک پہنچی تھی۔ تمہارے بابا بھائی جن کا تم سے خونی رشتہ تھا وہ سب تو میری طرح ہی سکتے میں تھے۔ جہاں تک بے ہوش ہونے کی بات ہے تو شاید دل کمزور ہو۔"

ثمرہ نے بہت ہوشیاری سے پتے کھیلے تھے۔ وہ بھی متاثر نظر آ رہا تھا۔

"سوری امی! لیکن آپ بھی تو خوامخواہ ضد کر رہی تھیں۔ آخر میرے وہاں پڑھنے سے آپ کو کیا مسئلہ ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو باہر پڑھنے بھیج دیتے ہیں۔ چھوٹی عمر میں ایبٹ آباد اور مری بھیج دیتے ہیں۔ چچا جان کا بھی تو اکلوتا بیٹا ہے فاران اور اسے انہوں نے ایبٹ آباد بھیج رکھا ہے۔ ریحان بھائی اور نومی بھائی کو بھی بابا نے بھیجا تھا نا۔"

"ہاں لیکن میرا اتنا جگرا نہیں ہے اختر بانو کی طرح۔" انجانے میں سچ ہی کہا تھا ثمرہ نے۔

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں شانی میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم جتنی دیر میری نظروں سے اوجھل رہتے ہو۔ میرا دل گھبرایا رہتا ہے۔"

ثمرہ کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔

"آپ بھی بڑی امی کی طرح بہادر بنیں امی۔ نومی بھائی اور ریحان بھائی مہینوں بعد حویلی آتے ہیں۔ اور اب ریحان بھائی جہاں تک میرا خیال ہے چھ سات سال کے لیے باہر چلے جائیں گے۔ مانی بھی تین ماہ تک لاہور چلا جائے گا لیکن چھوٹی امی نے مانی کو منع نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی محبت کا پتھر اس کے شوق کے راستے میں رکھ کر راہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتی ہیں۔ پرندوں کو ایک وقت پر اپنے گھونسلوں سے اڑان بھرنا ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح نئی منزلوں کی تلاش میں وقت آنے پر انسان بھی پرندوں کی طرح اپنے آشیانوں سے نکل جاتے ہیں۔" وہ ہولے ہولے بولتا ہوا جوتے کی نوز زمین پر مار رہا تھا۔

"میں اختر بانو کی طرح بہادر نہیں ہوں اور شاید اسے اپنے بیٹوں سے اتنی محبت نہیں ہے جتنی مجھے ہے۔ اسے اللہ نے بن مانگے اولاد دی۔ میں نے منتیں مان مان کر اللہ سے رو رو کر تمہیں مانگا شایان۔" انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

"یا شاید وہ ان ماؤں میں سے ہیں جو اپنی اولاد کے لیے قربانیاں دیتی ہیں ان کے بہتر مستقبل کے لیے اپنے دل پر پتھر رکھ لیتی ہیں۔ اپنی خواہش، آرزوئیں پس پشت ڈال کر ان کی خواہش پوری کرتی ہیں۔ مائیں تو سب ایک جیسی ہوتی ہیں امی سب کو ہی اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے کوئی اظہار کر دیتی ہے کوئی نہیں کرتی۔ بڑی امی کہتی ہیں ماں تو ماں ہوتی ہے۔ چاہے وہ امان کی ماں ہو چاہے شایان کی۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ ثمرہ نے جز بز ہو کر پہلو بدلا۔ چند دن لاہور میں اس کے ساتھ کیا رہ کر آ گیا ہے کہ اس کی باتوں کو اس طرح رٹا ہوا ہے جیسے قائداعظم کے اقوال ہوں۔" دل ہی دل میں کہتے ہوئے ثمرہ نے شایان کی طرف دیکھا۔

"اگر تم چاہتے ہو میں بھی تمہارے لیے قربانی دوں۔ اپنے دل پر تمہاری جدائی کا پتھر رکھ لوں تو ٹھیک ہے۔ تم اپنا شوق پورا کرلو۔" آواز پھر بھرا گئی تھی۔

"تھینک یو امی۔"

اس بے اختیار آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا اور وہ چند لمحوں کے لیے بالکل ساکت بیٹھی رہ گئی تھیں انہیں یاد نہیں تھا کہ اس سے پہلے بھی شایان نے ان کے ہاتھوں کو اس طرح محبت اور عقیدت سے چوما ہو۔ ان کی آنکھیں یکدم جگ مگ جگ مگ کرنے لگی تھیں، خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹی تھی۔ اس نے ثمرہ کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔

"آپ دنیا کی ساری ماؤں سے اچھی ماں ہیں۔"

اور یہ بات بھی اس نے پہلی بار ہی کہی تھی تو کیا لاہور میں کوئی ایسی کشش ہے کہ اجازت ملنے پر وہ اتنا خوش ہو رہا ہے۔ ثمرہ نے صرف سوچا ہی نہیں پوچھ بھی لیا۔

"آخر لاہور میں ایسا کیا ہے جو تم لاہور جانے کے لیے اتاؤلے ہو رہے ہو۔"

"لاہور میں کیا ہے۔"

وہ مسکرایا اور آنکھوں کے سامنے زُبل شاہ کا سراپا لہرایا تھا۔ گرین اور بلیو کے امتزاج والا ڈریس پہنے گجروں سے سجی کلائیاں۔ ہاتھوں میں گرین اور بلیو چوڑیوں والی ٹوکری لیے کچے پکے سیڑھیوں سے اترتی زُبل شاہ زیب کا وہ روپ تو جیسے آنکھوں میں کھب گیا تھا۔ اس وقت اگر صحن کا دروازہ کھول کر مرتضیٰ ارباب، نہ آجاتا تو وہ اس سے اس وقت کچھ اور بھی کہہ دیتا شاید یہ کہ اس وقت کوئی اپسرا لگ رہی ہے۔ کسی دوسری دنیا سے آئی کوئی حسین شہزادی۔

اچھا ہی تھا وہ آ گیا تھا ورنہ وہ اس؟ کے ایک ہی جملے پر اس کی آنکھوں کا وہ حیران سا۔ ناگوار تاثر جنہیں باقی کے دنوں میں وہ زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"لاہور بذات خود بہت بڑی کشش ہے سوئیٹ مام۔"

"کیا کوئی لڑکی ہے وہاں؟ کوئی رانگ نمبر کا چکر تو نہیں ہے۔"

ثمرہ جانتی تھیں کہ وہ رانگ نمبر پر لڑکیوں سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہادی اور رضی وغیرہ بھی رانگ نمبر پر دوستیاں کرتے رہتے تھے۔ اور جب سب مل کر بیٹھتے تو ان بے وقوف لڑکیوں کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ ثمرہ نے بھی منع نہیں کیا تھا۔

"ارے نہیں ڈیئر والدہ" وہ بے اختیار ہنس دیا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ آپ کا بیٹا رانگ نمبر پر بات کرنے والی لڑکی کے پیچھے پاگل ہو کر اس کی خاطر کہیں جائے گا۔ لڑکیاں آپ کے بیٹے کے پیچھے بھاگتی ہیں۔"

لہجے میں خود بخود ایک غرور سا ہو گیا تھا اسے وہ کراچی سے آنے والی لڑکی یاد آ گئی تھی جسے رضی اور ہادی نے بمشکل واپس کراچی بھجوایا تھا۔

"میری زندگی میں تو بس ایک ہی لڑکی ہے جسے میری امی جان نے میرے لیے پسند کیا ہے۔ گل رعنا۔"

ثمرہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"گل رعنا جیسی کوئی لڑکی ہے بھی نہیں۔"

"شایان ثوبان شاہ جیسا بھی کوئی نہیں ہے۔" مسکراہٹ اب بھی اس کے لبوں پر بکھری ہوئی تھی۔

"ہاں واقعی شایان جیسا کوئی نہیں تھا۔ اپنے تینوں بھائیوں کے ساتھ کھڑا ہوا وہ سب سے حسین لگتا تھا۔ ثمرہ نے دل ہی دل میں نظر کی دعا پڑھ کر پھونکا اور وہ ایک بار پھر ثمرہ کا شکریہ ادا کرتا ہوا کمرے سے باہر نکلا تو نظر ریحان پر پڑی جو برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ آنکھیں موندے پشت پر سر ٹکائے۔ ٹانگیں پھیلائے وہ اسے کچھ پریشان سا لگا تھا۔

''کیا بڑی امی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔''
اسے خیال آیا اور وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے ریحان کے پاس آ گیا۔
''ریحان بھائی! بڑی امی کی طبیعت کیسی ہے اب۔''
''ہاں۔'' وہ آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''ٹھیک ہیں۔ سو گئی ہیں۔ اس لیے باہر چلا آیا۔'' امان ان کے پاس ہی ہے کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے۔ آپ پریشان لگ رہے ہیں۔''
''میرے خیال میں تو نہیں لیکن صحیح تو ڈاکٹر ہی بتائے گا چیک اپ کے بعد، میں تو سوچ رہا تھا کہ کبھی کبھی ہمیں کچھ باتوں کا احساس وقت گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔ اگر وقت پر احساس ہو جائے تو شاید بہت سے دل ٹوٹنے سے بچ جائیں اور بہت سارے دلوں کو اس اذیت سے نہ گزرنا پڑے، جس سے وہ گزرتے ہیں۔''
''ہاں یہ تو ہے ریحان بھائی! بہت ساری باتیں وقت گزرنے کے بعد اپنے معنی کھو دیتی ہیں۔'' شایان نے اس کی تائید کی۔
''میری زندگی میں بہت سے پچھتاوے ہوں گے لیکن یہ پچھتاوا شاید آخری سانس تک رہے گا کہ ہم یعنی میں نے اور نومی نے اماں جان کو دوری کا عذاب دیا۔ ایک ماں کے لیے کتنا مشکل ہوتا ہوگا اپنے بچوں سے دور رہنا۔ تمہاری امی سے تمہارا کچھ عرصہ کے لیے لاہور جانا برداشت نہیں ہوا اور ہماری ماں کا جگر ادھیڑ سالوں سے ہماری جدائی کا زہر پی رہی ہیں لیکن کبھی شکوہ نہیں کیا۔
ہم مہینوں بعد حویلی آتے ہیں اور چند دن رہ کر چلے جاتے ہیں اور ان چند دنوں میں بھی صرف کھانے کی میز پر ان سے ملاقات ہوتی ہے۔
آج احساس ہوا ہے کہ ہمارے آنے پر ان کی جو آنکھیں نم ہوتی تھیں۔ ہمارے جانے تک وہ نم ہی کیوں رہتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی لمحہ ہوتا ہے ایسا جو آدمی کو جھنجوڑ کر گہری نیند سے جگا دیتا ہے۔ آج کے دن وہ لمحہ دوبارہ مجھ پر وارد ہوا۔ ایک لمحہ وہ تھا جب وہ بے ہوش ہو کر گری تھیں۔ مجھے لگا تھا جیسے میری کائنات اجڑ گئی ہو۔ زندگی میرے لیے مر جائے گی اگر میری ماں نہیں رہے گی۔ وہ ماں جسے کبھی میں نے دھیان سے دیکھا بھی نہیں تھا، جس کے پاس بیٹھ کر کبھی اپنے دل کی باتیں نہیں کی تھیں۔ کبھی ان کے دل کی باتیں نہیں سنی تھیں۔ وہ ماں جو بنا پیچھے کہے حویلی کے بیرونی گیٹ تک رخصت کرنے آتی تھیں اور ان کے لب مسلسل ہلتے رہتے تھے، جو اپنی دعاؤں کے حصار میں ہمیں رخصت کرتی تھیں اور اللہ کے سپرد کرتی تھیں۔ ہمارا سفر بخیر و خوبی گزر جاتا تھا۔ اب اس ماں کی دعاؤں کا حصار ہمارے گرد نہیں ہوگا تو جانے کتنے حادثے راہوں میں ہمارے منتظر ہوں گے۔ مجھے تب لگا تھا وہ نہیں رہیں گی تو بابا جان اور بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی میں تنہا اور اکیلا ہو جاؤں گا۔''
وہ ہولے ہولے بول رہا تھا اور شایان بہت دھیان اور خاموشی سے اس کے ایک ایک لفظ کو سن رہا تھا۔
''اور دوسرا لمحہ جب مجھ پر وارد ہوا تو اس نے مجھے جو ادراک دیا، وہ ادراک میرے دل کو نوچتا اور اذیت دیتا ہے۔ پہلے لمحے نے مجھے صرف اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کیا تھا کہ انہیں کچھ ہو گیا تو میں کتنا اکیلا ہو جاؤں گا۔ کون مجھے دعاؤں کے حصار میں رخصت کرے گا۔ مجھے تب صرف اپنی فکر تھی۔ اپنے نقصان کا احساس تھا۔ لیکن دوسرے لمحے نے مجھ پر ندامتوں اور پچھتاووں کے پہاڑ گرا دیے۔
جب اماں جان تم سے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو ثمرہ آپا کیا کرتیں۔ تمہاری جدائی وہ برداشت نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے وہ تمہیں لاہور جانے سے منع کرتی ہیں۔ ایک ماں کے لیے اپنے بچوں کو خود سے جدا کرنا آسان نہیں ہوتا وہ تمہیں سمجھا رہی تھیں اور میں ندامتوں میں بھیگا جاتا تھا کہ یہ بھی تو ایک ماں ہی ہے جسے ہم نے اپنی دوری اور جدائی کا عذاب دیا ہے۔ مجھے ان کی پیشانی اور چہرے کی ایک ایک لکیر

میں جدائیوں کی اذیت — نظر آئی۔ وہ اذیت جو مجھے کبھی نظر نہیں آئی تھی، اب نظر آرہی تھی۔

ہم جب چھوٹے تھے تو زیادہ تر بڑی دادی جان اور چھوٹی دادی جان کے پاس رہتے تھے۔ یا پھر سلطانہ پھپھو کے پاس۔ شاید ہم پہلے پوتے تھے تو وہ ہم سے زیادہ پیار کرتی تھیں یا پھر پتا نہیں کیوں لیکن اب سوچتا ہوں وہ ہمیں اماں جان کے پاس جانے نہیں دیتی تھیں۔ خود میں ہی الجھائے رکھتی تھیں اور ہم نے بھی کبھی ان کے پاس جانے کی خواہش نہیں کی۔

اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ جب چھٹیوں میں ہم گھر آتے تھے تو وہ حسرت سے ہمیں دیکھا کرتی تھیں۔ ہمارا خیال رکھتی تھیں۔ ہمارے کھانے پینے کا لباس کا کھیلنے کا پڑھائی کا ہر چیز کا۔ ہمارے بتائے بغیر ہی وہ ہماری پسند ناپسند کے متعلق جانتی تھیں۔ انہیں پتا تھا ہمیں کھانے میں کیا پسند ہے کیا ناپسند ہے۔ جب ہم گھر پر ہوتے تو ہماری پسند کے کھانے پکواتیں۔

اور ہم سب کچھ حق سمجھ کر وصول کرتے رہے۔ اور کبھی نہیں سوچا کہ ہمارا بھی تو فرض ہے کچھ۔ وہ میرے اور نومی کے لیے ایسی ہی تھیں جیسے ثمینہ اور صفورا چچی اور ثمرہ امی۔ الگ سے کبھی کوئی خاص فیلنگ نہیں تھی ان کے لیے لیکن آج دل میں ان کے لیے جو فیلنگز پیدا ہوئی ہیں وہ بالکل مختلف اور الگ ہیں۔ انہوں نے ہمیں جنم دیا۔ ہمارے لیے تکلیف اٹھائی۔

وہ ہماری ماں ہیں۔ آج مجھے ان کی آنکھوں میں جو پیاس اور تشنگی نظر آئی اپنے لیے وہ اس سے پہلے کبھی نظر ہی نہیں آئی۔ ہم کبھی آتے جاتے ان کے اس طرح گلے نہیں لگے جیسے مائی لگتا ہے۔ ہم نے کبھی اس طرح ان کے ہاتھ نہیں چومے جیسے وہ چومتا ہے۔ آنکھوں سے لگاتا ہے۔ مائی صحیح کہتا ہے شایان! ہمیں تو تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے خاص طور پر مجھے کہ تمہاری وجہ سے مجھے اس رشتے سے آگاہی ہوئی، جسے ساری زندگی میں فار گرانٹڈ لیتا رہا۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"میری ماں ایک دکھی عورت ہے۔ یہ میں نے آج جانا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ان دکھوں کو پڑھنے کی کوشش ہی نہیں کی جو ان کی آنکھوں میں رقم تھے۔ لیکن آج جب میں ان کے کمرے میں بیٹھا تھا اور وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے نیم دراز مجھے دیکھ رہی تھیں تو میں نے ان کی آنکھوں میں رقم دکھوں کی وہ بے شمار کہانیاں پڑھیں، جو پہلے کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ میکے سے جدائی کا دکھ۔ اولاد کی دوری کا دکھ اور سب سے بڑھ کر بابا جان کی بے اعتنائی کا دکھ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"میں نہیں جانتا شانی! کہ بابا جان نے دوسری شادی کیوں کی۔ میری ماں میں کیا کمی تھی لیکن اتنا جانتا ہوں کہ عورت کے لیے اپنے مرد کو تقسیم کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ہماری ایک پروفیسر تھیں۔ دو بچے تھے۔ پڑھی لکھی تھیں خوب صورت تھی۔ ان کے شوہر نے دوسری شادی کرلی تو انہیں نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ کئی ہفتوں کے بعد جب وہ کومے سے باہر نکلیں تو ماہی بے آب کی طرح تڑپتی تھیں۔

آج پہلی بار میں نے اپنی ماں کے متعلق سوچا کہ وہ بھی تو ایسے ہی تڑپتی ہوں گی کہ وہ بھی تو میڈم کی طرح بہترین شریک حیات تھیں۔ تب ہم بہت چھوٹے تھے، جب بابا جان نے دوسری شادی کی لیکن بڑے ہونے کے بعد کبھی بھی ہم نے ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی اپنے تسلی بھرے لفظوں سے ان کے دکھوں پر مرہم نہیں رکھا۔ کبھی اس قیمتی اور انمول رشتے کی قدر نہیں کی۔ تم ایسا نہ کرنا شان۔ کبھی اپنی امی کو دکھ مت دینا خواہش اور آرزوئیں تو پوری ہو ہی جاتی ہیں کبھی نہ کبھی لیکن یہ رشتے پھر نہیں ملتے۔"

"ریحان بھائی! جو گزر گیا وہ پلٹ کر واپس نہیں آسکتا۔ لیکن ابھی بہت دیر تو نہیں ہوئی آپ تلافی کرسکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت ہے تلافی

کرنے کا۔ کچھ لوگوں کے پاس تو تلافی کا وقت بھی نہیں ہوتا۔

شایان، جو ہمیشہ ہی ریحان کو لاابالی اور لاپروا سا لگتا تھا۔ اس وقت بڑا سیانا اور سمجھ دار سا لگا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور اپنے بازو پر رکھے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا۔

"ٹھیک کہتے ہو یار! جو وقت گزر گیا وہ تو پلٹ نہیں سکتا لیکن وقت ہے اس میں تلافی تو کی جاسکتی ہے کچھ نہ کچھ۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے ذرا ڈیرے تک جانا ہے۔ چلو گے۔ نظام دین کو اس کے بھتیجے نے کچھ رقم بھجوائی ہے۔ وہ دینی ہے۔ وہ ہماری مل میں کام کرتا ہے۔"

"نظام دین چاچا کیا ابھی تک ڈیرے کا سارا کام سنبھالتا ہے۔ اب تو بوڑھا ہو گیا ہوگا۔"

"ہاں ڈیرے پر تو نظام دین چاچا کا ہی سکہ چلتا ہے۔ شایان مسکرایا۔ "بابا جان اور زمان چچا اسے جانے ہی نہیں دیتے۔ سارا دن بس بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا ہے اور دوسرے ملازموں پر حکم چلاتا ہے۔"

شایان کی نیند اڑ گئی تھی، وہ ریحان کے ساتھ ہی گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ اور وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے پیدل ہی ڈیرے کی طرف جا رہے تھے جب چراغ سا میں ڈیرے کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اور رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں سی بنی ہوئی تھیں۔ شاید میلے ہاتھوں سے وہ آنسو پونچھتا رہا تھا۔ بغل میں میلی سی کپڑے کی گڑیا تھی۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ اس کی پرسوز آواز ان کے کانوں میں پڑی۔

بابل چڑیاں گڈیاں تیرے گھار (گھر) رہ گیاں۔

دنیا دے سونڑیاں رہا اے توں کیھڑ بنائی

کچھ وقفے کے بعد پھر اس کی آواز بلند ہوئی تھی

کھیاں نصیباں دیاں جھولی دے وچ پے گیاں۔ بابل چڑیاں گڈیاں تیرے گھر۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بابا جان اس نیم پاگل شخص کو حویلی سے کیوں نہیں نکال دیتے۔ ہر وقت اپنی منحوس آواز میں ایک ہی گانا گاتا رہتا ہے۔"

شایان کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

ریحان نے رک کر اسے دیکھا اور پھر چلنے لگا۔

"دکھی اور مسکین آدمی ہے یار! سال ہا سال سے اس کے خاندان کے لوگ ہی باڑے کا کام سنبھالتے آ رہے ہیں۔ جانور بھی جس طرح ان سے مانوس ہیں۔ دوسروں سے نہیں ہوتے۔"

"لیکن یہ پاگل شخص بھلا کیا خیال رکھتا ہوگا جانوروں کا، جسے اپنا بھی ہوش نہیں ہے پچھلے دنوں نانا جان اور دلاور ماموں اپنی حویلی میں آئے ہوئے تھے۔ دلاور ماموں، زمان چچا سے ملنے ہمارے ڈیرے کی طرف آ رہے تھے کہ یہ نہ جانے کہاں سے نکل آیا اور انہیں پتھر اٹھا اٹھا کر مارنے لگا۔ نظام دین چاچا نے اسے آ کر پکڑا اور ڈیرے سے ہٹا لے گیا۔ دلاور ماموں تو بہت غصے میں تھے اور انہوں نے بابا جان سے شاید بات بھی کی تھی لیکن بابا جان نے ابھی تک اسے نکالا ہی نہیں۔" شایان کو بلاوجہ ہی چراغ سائیں سے چڑ ہو گئی تھی۔

"بابا بہتر سمجھتے ہیں کہ انہیں کیا کرنا ہے یا کیا نہیں۔ بہرحال میں ان سے بات کروں گا کہ کسی ڈاکٹر سے چیک کروالیں۔ کہیں اس کی ذہنی حالت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی جو یہ مالکوں کو پتھر مارنے لگا ہے۔"

اب وہ ڈیرے میں پہنچ گیا تھا جیسا کہ شایان نے کہا تھا۔ نظام دین احاطے میں چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ "اپنے ڈاکٹر صاحب آئے ہوئے ہیں۔"

وہ ہمیشہ ریحان کو ڈاکٹر صاحب ہی کہتا تھا تب سے جب سے اس نے میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ ریحان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آج تو بڑے ڈیرے پر بھی خوب رونقیں

ہیں۔ صبح سے ہی صفائی وغیرہ ہو رہی تھی۔ ایک دو گاڑیاں کچھ دیر پہلے ادھر سے گزر کر گئی ہیں۔" وہ بیٹھا نہیں تھا۔

"ہاں آج نانا جان نے سب کو بلا رکھا ہے۔ مہران چچا اور ریحان بھائی بھی اسی لیے آئے ہیں۔"

شایان کو ایک دم بیزاری سی ہونے لگی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ ریحان نظام دین کو رقم اور پیغام دے تو وہ واپس حویلی جائیں۔ "کرسیاں منگواؤں یا اندر چل کر بیٹھیں گے۔"

نظام دین نے پوچھا۔

"بیٹھیں گے نہیں نظام چاچا!"

ریحان نے احاطے میں بچھی چارپائیوں پر نظر دوڑائی۔

"بیٹھنے کے لیے کرسیوں کی کیا ضرورت ہے یہ چارپائیاں کس لیے ہیں۔" اس نے روپے نظام دین کو پکڑائے اور بتایا کہ ان دنوں کام زیادہ ہے اس لیے وہ ابھی نہیں آسکا۔ نظام دین کی اپنی اولاد نہیں تھی۔ بھتیجے کو بیٹا بنایا ہوا تھا۔

"سنا ہے ڈاکٹر صاحب! اس بار بیدار شاہ بھی الیکشن میں حصہ لیں گے۔" نظام دین کی عادت تھی جب ریحان یا کوئی اور ڈیرے پر آتا تو آس پاس کی ساری خبریں بغیر پوچھے بتا دیتا تھا۔

"اور اگر ایسا ہوا مطلب وہ کھڑے ہوئے تو اپنے دلاور شاہ جی نہیں جیت سکیں گے۔ لوگ بہت پسند کرتے ہیں بیدار شاہ صاحب کو۔ وقت آیا تو دیکھا جائے گا۔ آپ بے پر کی نہ اڑایا کریں۔" شایان کو برا لگا تھا۔

"میں تو بس یوں ہی اندازہ بتا رہا تھا بیٹا! عوامی رائے بیدار شاہ کے حق میں ہے۔" نظام دین ثوبان شاہ کا منہ چڑھا رہا تھا اور ان کے سامنے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا اور وہ بھی دھیان سے سنتے تھے۔

اور اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ رات کو جب سب بڑے ڈیرے پر اکٹھے ہوئے تو سب کا یہ ہی خیال تھا کہ بیدار شاہ آس پاس کے علاقوں میں بہت مقبول ہو رہا ہے۔ ڈیرے پر آنے والے معززین کی بھی یہ ہی رائے تھی کہ اس بار کسی اور کو کھڑا کیا جائے۔ کچھ نے تو زمان شاہ اور ثوبان شاہ کا نام بھی لیا۔ لیکن چونکہ دونوں نے ہی انکار کر دیا تو فیصلہ یہ کیا گیا کہ تایا جان اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کے نام پارٹی کو دے دیں اور پارٹی جس کو بھی ٹکٹ دے دے۔ اور سب لوگ پوری سپورٹ کریں گے اس کی۔

ریحان اور شایان جی بھر کر بور ہوئے تھے سو فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دلاور شاہ اپنی حویلی میں تو موجود تھے لیکن ڈیرے پر نہیں آئے تھے، شایان کا خیال تھا کہ وہ ان سے ملنے جائے گا لیکن پھر اس کا ارادہ بدل گیا اور وہ ریحان کے ساتھ ہی حویلی واپس آ گیا تھا کہ اسے نیند پوری کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا لیکن نہیں جانتا تھا کہ آج بھی اسے یہ موقع نہیں ملنے والا تھا۔ بڑی حویلی اور ڈیرہ ان کے گھر سے دور نہیں تھا اس لیے وہ پیدل ہی حویلی آئے تھے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ رکا۔

"بڑی امی کو لے کر آپ کب حیدر آباد جائیں گے۔"

"ناشتے کے بعد ہی نکلیں گے۔ اپائنٹمنٹ تو لے لیا ہوگا میرے دوست نے۔" ریحان بھی اختر بانو کے بیڈ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں ریحان بھائی۔"

اس نے پوچھا۔

"نہیں یار! اس کی ضرورت نہیں ہے میں اور مانی ہوں گے شاید بابا جان بھی چلیں ساتھ۔"

ریحان نے جواب دیا تھا اور اختر بانو کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"تو میرا خیال ہے۔ میں بڑی امی کو سلام کر لوں کہ میں تو اب لمبی تان کر سو جاؤں گا اور دس گیارہ سے پہلے نہیں اٹھوں گا۔"

شایان بھی اس کے ہم قدم ہوا۔

ریحان نے ناب پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے ثمرہ کی آواز آئی ثمرہ کی عادت تھی اونچی آواز میں بولنے کی۔

"تم کیا سمجھتی ہو اختر بانو! کہ اپنی نرم نرم اور میٹھی باتوں سے شانی کے دل کو اپنی مٹھی میں لے لوگی۔ وہاں لاہور میں جانے کیا کیا پٹیاں پڑھائی رہی ہو اسے۔ اس نے ایک بار شادی پر جانے کی بات کی تو فوراً تیار ہوگئیں۔ اسے ساتھ لے کر جانے کو کیا سمجھتی ہو تم ہیں۔ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں نے اسے پالا پوسا بڑا کیا ہے راتوں کو اس کے لیے جاگی ہوں اور اب تم۔"

"نہیں ثمرہ آپا! میں بھلا کیوں اسے پٹیاں پڑھاؤں گی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

اختر بانو کی آواز میں لرزش تھی۔ ناب گھماتے ہوئے ریحان نے شایان کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"میں سب سمجھتی ہوں اختر بانو! تمہارے چلتر۔ اگر آئندہ شانی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو تمہارا وہ حشر کروں گی کہ۔"

شایان نے ریحان کا ہاتھ ناب سے ہٹا کر جھٹکے سے دروازہ کھولا۔

دونوں ایک ساتھ ہی اندر داخل ہوئے تھے سامنے اختر بانو بیڈ کراؤن پر ہاتھ رکھے کھڑی تھیں۔ ان کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو رہی تھی۔ ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ جبکہ ثمرہ کی دروازے کی طرف پشت تھی۔

"چھوٹی امی بس!" ریحان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"یہ آپ میری اماں جان سے کس لہجے میں بات کر رہی ہیں۔"

ثمرہ کے آدھے لفظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے تھے، انہوں نے پلٹ کر پہلے ریحان اور پھر شایان کی طرف دیکھا جو خونخوار نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ریحان کی نظریں بھی ثمرہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں جبکہ اختر بانو نے سہارے کے لیے ہاتھ ادھر ادھر مارے اور پھر لہرا کر گر گئیں گرتے ہوئے ان کا سر بیڈ کی پٹی سے ٹکرایا۔

"اماں جان!" ریحان تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور زمین پر بیٹھتے ہوئے ان کا سر گود میں رکھا۔ دائیں آنکھ کے اوپر سے ماتھے کی کھال تھوڑی سی پھٹ گئی تھی۔ جس سے ہلکا ہلکا خون رس رہا تھا۔ اختر بانو کے دوپٹے سے ہی ریحان نے ان کی پیشانی پونچھی اور کلائی پر ہاتھ رکھا نبض رک رک کر چل رہی تھی۔

"شانی! امان سے کہو گاڑی نکالے۔" وہ چیخا تھا۔

شایان بھاگتا ہوا باہر چلا گیا۔

ثمرہ حیران اور پریشان سی کھڑی تھیں یہ بازی کیسے پلٹ گئی تھی۔ وہ تو آج تک ثوبان شاہ سے شادی سے لے کر اب تک ہر بازی کامیابی سے کھیلتی آرہی تھیں اور اب پتا نہیں شایان نے کیا اور کتنا سنا تھا کیا وہ جان گیا تھا کہ انہیں گاڑی احاطے میں داخل ہونے کا پتا کیوں نہیں چلا تھا اور ثوبان شاہ کہاں تھے۔ کیا انہوں نے بھی سنا ہوگا کچھ۔ نہیں جانتی تھیں کہ وہ لوگ پیدل آئے تھے اور ثوبان شاہ ابھی ڈیرے پر ہی تھے۔ ان کے اندر آگ لگی ہوئی تھی انہوں نے سوچا تھا کہ سب کے چلے جانے کے بعد ہی اختر بانو سے بات کریں گی۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیں گی تاکہ آئندہ وہ شایان سے دور رہے۔ لیکن پھر ان سے صبر نہ ہو سکا تھا اور امان کے کمرے سے نکلتے ہی وہ دل کی بھڑاس نکالنے آگئی تھیں۔

"اماں جان! اماں جان! آنکھیں کھولیں۔"

ریحان کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ اور ہاتھ نبض پر تھا تب ہی دروازے پر شایان نظر آیا۔

"امان گاڑی نکال رہا ہے۔"

اور دھان پان سی اختر بانو کو دونوں بازوؤں میں سنبھالتے ہوئے ریحان تیزی سے باہر نکلا تھا۔ ثمرہ ایسے ہی کھڑی تھی۔ شایان نے ایک تیز نظر ان پر

ڈالی اور ریحان کے پیچھے لپکا۔

امان کی مدد سے ریحان اختر بانو کو لے کر گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ ایک بازو اختر بانو کے گرد حمائل کیے ان کا سر سینے سے لگائے اور دوسرا ہاتھ ان کی کلائی پر رکھے وہ مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔

''اماں جان۔ اماں جان ایسا مت کریں۔''

شایان پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھا تو امان نے گاڑی گیٹ سے باہر نکالی۔

''اماں جان کو فوری طبی امداد کی ضرورت ہے مانی۔ قریب ترین کوئی کلینک جہاں آکسیجن بھی ہو۔''

ریحان کی آنسوؤں میں بھیگی آواز نے شایان کو بھی تڑپا دیا۔ ''انکل بیدار شاہ کے علاقے میں چلو مانی۔ انہوں نے حال ہی میں چھوٹا سا ہاسپٹل بنوایا ہے۔ وہاں ہر طرح کی جدید سہولتیں ہیں اور میل فی میل ڈاکٹر ہائر کیے ہیں انہوں نے۔''

''ادھر ہی جا رہا ہوں۔''

امان جانتا تھا اکثر جاتا رہتا تھا ان کے علاقے میں۔

شایان پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا اور ریحان اختر بانو کی ڈوبتی نبض پر ہاتھ رکھے سوچ رہا تھا کیا تلافی کا وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ اور اختر بانو کی نبض لحہ بہ لحہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اجنبی دوبارہ اپنے والدین کے ساتھ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا تھا لیکن ماسٹر عبدالعزیز کے دل میں امید کی ایک جوت جلا گیا تھا۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی زیب النساء کے لیے ایسے ہی ہم سفر کے خواب دیکھے تھے اور اس روز کے بعد بھی انہوں نے سینکڑوں بار دعا کی تھی۔ ''یا اللہ تو بہتر جانتا ہے کہ کیا کس کے لیے اچھا ہے اور کیا برا۔ اگر وہ اجنبی میری زیب النساء کے لیے اچھا ہے تو اسے اس کا نصیب بنا دے۔''

جب جب انہوں نے زیب النساء کو خاموش بیٹھے کچھ سوچتے دیکھا تھا تب تب ان کے لبوں سے یہ ہی دعا نکلی تھی۔ اپنی سوچوں میں گم کبھی اس کی آنکھیں جگمگا اٹھتیں۔ کبھی لبوں پر ایک پیاری سی مسکان آ کر ٹھہر جاتی اور کبھی یکدم آنکھوں کی چمک بجھ جاتی، مسکان پھیکی پڑ جاتی اور وہ بے چین سے ہو جاتے تھے۔

اور جب گلی میں سے گزرتے ہوئے ان کا سامنا نور بھری اور اسلم سے ہو جاتا اور ان کی اپنی طرف اٹھتی، کینہ توز نظریں ان کے اندر خوف کی ایک لہر سی دوڑا دیتیں اور ان کی نظریں بے اختیار اوپر آسمان کی طرف اٹھ جاتیں۔

''یا اللہ میری بچی کا نصیب کسی نیک بندے سے جوڑنا۔''

ہر روز زیب النساء کو استانی جی کے گھر لے کر جاتے ہوئے راستے بھر سوچتے رہتے شاید آج استانی جی بتائیں کہ ان کا مہمان اپنے والدین کو لا رہا ہے لیکن ہر روز امید کی شمعیں بجھ جاتیں۔ ہر روز وہ سوچتے کہ آج خود استانی جی سے پوچھیں گے کہ ان کے مہمان کی طرف سے کوئی خط، کوئی خبر آئی لیکن پھر ہمت نہ پڑتی اور انہیں سلام کر کے خاموشی سے اسکول چلے جاتے۔ انہیں لگتا تھا جیسے ان کے اندر زہرا کی روح حلول کر گئی ہے۔

وہ بھی تو یوں ہی بے چین رہنے لگی تھی اپنے آخری دنوں میں زیب النساء کے رشتے کے لیے۔ تو کیا ان کا وقت بھی پورا ہونے والا ہے۔ اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو زیب النساء اکیلی رہ جائے گی۔ کوئی عزیز رشتہ دار بھی نہیں قریبی جو میرے بعد اس کی ذمہ داری اٹھا لیں گے۔

زیب النساء کی فکر انہیں اندر ہی اندر کھائے جاتی تھی۔ بی بی اکثر ہائی رہنے لگا تھا۔ بی۔ پی کا مسئلہ تو انہیں پچھلے کئی ماہ سے تھا۔ بلکہ شاید زہرا کی وفات کے بعد سے ہی یہ مسئلہ شروع ہو گیا تھا تاہم چند ماہ پہلے انہوں نے صادق آباد ڈاکٹر کو دکھایا تھا اور اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ بی۔ پی کی گولی ہر روز

باقاعدگی سے کھاتی ہے ناغہ بالکل نہیں کرتا لیکن اب یہ ان کی سستی تھی یا کوتاہی کہ اکثر گولی کھانا بھول جاتے اور اگر کبھی یاد بھی آجاتا تو یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ لو اب کیا ہر روز گولیاں پھانکتے رہو۔ کبھی سر میں درد محسوس ہوتا تو پھر لے لیتے تھے۔

اس روز چوہدری عبدالمالک کے بچوں کو پڑھا کر اٹھے تو سر درد سے پھٹ رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑے مار رہا ہو۔ انہیں ابھی استانی جی کے گھر سے زیب النساء کو لینے جانا تھا لیکن گلی میں چند قدم چلے ہی تھے کہ دل گھبرانے لگا۔ کبھی دل یک دم ڈوبنے لگتا اور کبھی یوں لگتا جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ شاید بی۔ پی ہائی ہو رہا ہے وہ استانی جی کے گھر جانے کے بجائے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ کہ پہلے جا کر بی۔ پی کی گولی کھالوں۔ طبیعت ذرا سنبھل جائے تو پھر جاؤں گا۔ یوں بھی سر درد کی وجہ سے وہ چوہدری عبدالمالک کے گھر سے جلدی نکل آئے تھے۔

ماسی نور بھری کے گھر کے قریب پہنچے تو انہیں لگا جیسے ابھی گر جائیں گے انہوں نے دیوار سے ٹیک لگائی کہ قدم اٹھانا محال ہو رہا تھا۔ یہ چند قدم پر تو ان کے گھر کا دروازہ تھا۔ ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لیے۔ اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ اب باقاعدگی سے گولی کھائیں گے۔ انہیں زیب النساء کے لیے زندہ رہنا ہے۔ یا اللہ مجھے اتنی مہلت ضرور دینا کہ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ محفوظ ہاتھوں میں دے سکوں۔

وہ سیدھے ہوئے اور اس سے پہلے کہ چند قدم چل کر اپنے گھر جاتے ماسی نور بھری کے نیم وا دروازے سے اس کی آواز آئی تھی۔ ایک تو اس کی آواز تھی ہی بلند اور کچھ اسے عادت بھی تھی بلند آواز میں بات کرنے کی۔

''ہاں تو تم کیا کہہ رہے تھے۔ تمہارے چاچا نے کیا کہا ہے۔''

''کتنی دفعہ بتاؤں اماں! چاچا کہہ رہا تھا سال دو سال تک ریٹائر ہو جاؤں گا تو اس سے پہلے ہم اپنا گھر ٹھیک ٹھاک کر لیں ظاہر ہے، اسے واپس اپنے گاؤں آنا ہی ہے۔''

نور بھری کا دیور ریلوے کے محکمے میں ملازم تھا اور گاؤں سے جانے سے پہلے وہ اپنے گھر میں نور بھری اور اسلم کو چھوڑ گیا تھا اس کا گھر پکا تھا جبکہ نور بھری اور اسلم کا گھر کچا تھا۔ ''جب تک میری نوکری ہے تم لوگ ادھر ہی رہ لو اور تھوڑے پیسے اکٹھے کر کے اپنے گھر کو پکا کروالو۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ گھر بند نہیں ہوگا ورنہ بند گھر تو خود ہی ڈھے جاتے ہیں۔''

''ہاں بھئی۔ اس کو اب کیا پتا کہ اپنا گھر تو اس کا نالائق بھتیجا بیچ باچ کر کھا گیا ہے۔''

نور بھری کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''تو اب تم بھی مجھے طعنے دو گی۔ میں نے کوئی عیاشی کی ہے۔ سب پیسہ تو مقدمے اور وکیلوں کی فیسوں میں کھپ گیا تھا۔'' اسلم جھلائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''کہا بھی تھا چاچا سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ لے میرے لیے پھر گھر کی فکر نہیں رہے گی۔''

''ہاں وہ تو جیسے تمہیں اپنی پڑھی لکھی بیٹی کا رشتہ دے ہی دیتا۔ سب جانتا ہے تیرے کرتوت اور وہ تیرے چاچا کی بیٹی اتنی نخریلی ہے تجھ سے ہی شادی کرے گی جیسے۔''

ماسٹر عبدالعزیز نے ایک بار پھر دیوار سے ٹیک لگائی تھی۔ دم جیسے سینے میں بار بار اٹکتا تھا۔

''پر خیر تو گھر کی فکر نہ کر۔'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد نور بھری کی آواز سنائی دی تھی ''تیرے چاچے کے واپس آنے سے پہلے گھر خالی کر دیں گے۔''

''کیا؟'' اسلم کی آواز قدرے بلند تھی۔ ''کچھ مال چھپا کے رکھا ہوا ہے کیا؟ میں تو جب مانگتا ہوں چٹا جواب دے دیتی ہو کہ دھیلا تک نہیں ہے تمہارے پاس۔''

''لو۔ میرے پاس کہاں سے آیا مال۔ یہ اپنے ماسٹر عزیز کا گھر ہے نا۔ آخر میں یہ ہمارا ہی ہونا ہے۔'' نور بھری کی آواز میں مسرت کی چہچاہٹ تھی۔

"کیا مطلب۔ ہمارا کیسے ہوا؟" اسلم کی آواز میں حیرت تھی۔

"تو اب مطلب بھی میں سمجھاؤں۔ تم نے دیکھا ہے نا ماسٹر کو دو گھڑی کا مہمان لگتا ہے۔ جھل جھل کر تو چلتا ہے بے چارہ۔ چار چھ ماہ سے زیادہ نہیں جینے والا۔ لکھ لو کہیں پھر زیبو بھی تمہاری اور گھر بھی تمہارا۔" وہ ہنسی تھی۔

"تیرا ابھی جواب نہیں اماں! دور کی سوجھتی ہے تجھے۔"

اسلم کا قہقہہ ان کے دل پر کسی بھاری پتھر کی طرح لگا تھا اور انہیں لگا جیسے اب کے جو دل ڈوبا تو پھر ابھرے گا نہیں۔ بمشکل دیوار کا سہارا لیتے ہوئے وہ چند قدم چل کر گھر کے دروازے تک آئے۔ کانپتے ہاتھوں سے تالے میں چابی لگائی اور کتنی ہی دیر تک برآمدے میں پڑی چارپائی پر گرے گہرے گہرے سانس لیتے رہے۔ پھر اٹھ کر بی۔پی کی گولی کھائی۔ دو تین ہی گولیاں رہ گئی تھیں۔ کل ہی نیاز کو شہر بھیج کر منگوالوں گا۔ اب انہیں ناغہ نہیں کرنا۔ وہ دل ہی دل میں عہد کر رہے تھے۔

پھر وہ اٹھے اور دودھ نعمت خانے سے نکالا اور اس میں پانی ملا کر "کچی" بنائی۔ ان کے ابا کہتے تھے اس سے گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں آم کھانے کے بعد یہ "کچی" ضرور پی جاتی تھی کہ بقول ان کے آم کی تاثیر گرم ہوتی ہے اور "کچی" اس گرم تاثیر کو کم کر دیتی ہے۔

دودھ میں پانی اور چینی ملا کر جو شربت بنایا جاتا ہے دیہات میں اسے کچی کہتے ہیں۔

ایک گلاس پی کر وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھے رہے۔ واقعی کچھ دیر بعد طبیعت سنبھلنے لگی تھی۔ ذرا مزید بہتر محسوس کیا تو زیب النساء کو لینے کے لیے استانی جی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ انہیں اب کیا کرنا چاہیے یہ خیال انہیں پریشان کرتا رہا۔ نور بھری کی وہ زہریلی ہنسی اور اسلم کے قہقہے ان کے کانوں میں گونجتے رہے۔ استانی جی کے گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

دروازہ استانی جی نے ہی کھولا تھا اور انہیں دیکھ کر زیب النساء کو آواز دی تھی۔

"زیب بیٹی آجاؤ۔ تمہارے ابا لینے آگئے ہیں۔"

"آپا جی! مجھے آپ سے ایک بات عرض کرنی تھی اگر اجازت ہو تو کچھ دیر بیٹھ کر بات کر لیں۔"

نگاہیں جھکائے جھکائے انہوں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں آجائیں اندر۔"

استانی جی نے ایک طرف ہو کر انہیں راستہ دیا تھا اور پھر کتنی ہی دیر تک وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھے سر جھکائے دل ہی دل میں لفظوں کو ترتیب دیتے رہے تھے۔ پھر سوچ کر بات شروع کی۔ پھر ماسی نور بھری کی باتیں سن کر دل اور پریشان ہو گیا۔

"آپا جی آج میری طبیعت بہت خراب تھی۔"

انہوں نے استانی جی اور اسلم کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو انہیں بتائی تو بے ساختہ استانی جی کے لبوں سے نکلا۔

"بڑی ہی پلید عورت ہے یہ نور بھری۔ میں تو اسے ایسا نہیں سمجھتی تھی۔"

"انسانوں کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے آپا جی۔ ساری زندگی زہرا اسے ماں کی طرح سمجھتی رہی۔ گھر میں کچھ اچھا پکتا تو ضرور بھیجتی اور یہ۔ اس کی نیت تو دیکھیں آپا جی۔ گھر اور زیب النساء پر نظر لگا کر بیٹھی ہوئی ہے کہ کب میں مروں تو یہ قبضہ کر لے۔ میرے گھر پر بھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ آپا جی وہ آپ کا مہمان کیا پھر بھی نہیں آیا۔ کہتا تھا نا کہ والدین کو لے کر آئے گا جلد ہی۔"

بالآخر انہوں نے ہمت کر کے وہ بات کہہ دی جو کہنا چاہتے تھے۔

"آیا تھا ایک روز ملنے۔ دس بارہ دن پہلے کھڑے کھڑے ہی آ کر چلا گیا۔ بتا رہا تھا چند دنوں بعد بڑے بھائی کی شادی ہے۔ دعوت دینے آیا تھا مجھے۔ اب بھلا میں کہاں اتنا لمبا سفر کر سکتی ہوں۔

pklibrary

فاطمہ بھی بلاتی رہتی ہے لیکن میں منع کر دیتی ہوں کہ خود ہی آجایا کرو۔ بہت اچھا بچہ ہے ماسٹر صاحب۔ کیا بتاؤں چند دن رہا ہے ادھر تو انسیت ہوگئی ہے۔ بہت عزت کرتا ہے میری۔ کہتا تھا کہ آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔"

"رشتے کی بات کی پھر کوئی؟" استانی جی کی بات سن کر ماسٹر عبدالعزیز نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"نہیں۔ اب تو کوئی بات نہیں کی۔ وہی بات ہی کر کے گیا تھا اس روز جب آپ کی طرف آیا تھا کہ بڑے بھائی کی شادی کے بعد ماں باپ کو لے کر آئے گا۔ اب تو کوئی بات نہیں کی اس نے۔ دوست کے ساتھ آیا تھا شادی کی دعوت دے کر چلا گیا۔"

استانی جی ماسٹر عبدالعزیز کی بات سن کر کچھ حیران ہوئی تھیں کہ پہلے تو خود ہی کہا تھا کہ جب تک وہ اپنے والدین کو لے کر نہیں آئے گا بات آگے نہیں چل سکے گی۔

"کوئی پتا ٹھکانا فون نمبر ہے اس کا آپ کے پاس۔"

ماسٹر صاحب جو کچھ سوچ رہے تھے استانی جی نے اس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔ لیکن آپ کیا سوچ رہے ہیں ماسٹر صاحب۔"

"زندگی بڑی بے اعتبار سی شے ہے آپا جی! ایک لمحے کا بھروسا نہیں ہے، میں سوچ رہا ہوں کہ اگر کل مجھے کچھ ہوگیا تو میری زیب کا کیا ہوگا؟ ماسی نور بھری اور اسلم تو بھوکے گدھوں کی طرح میری موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو میں چاہتا ہوں آپا جی۔"

ان کی نظریں جھک گئیں۔

"کہ اگر اس کا کچھ اتا پتا چل جائے تو جا کر اس سے کہوں کہ مجھے اس کا رشتہ منظور ہے۔ بھلے اس کے ماں باپ راضی نہ بھی ہوئے تب بھی۔ میں ڈر گیا ہوں ماسی نور بھری کی باتیں سن کر اور اپنی زندگی میں ہی اپنی زیب کو رخصت کرنا چاہتا ہوں وہ لڑکا بہت بھلا اور اچھا لگا تھا مجھے۔ میری زیب کے جوڑ کا ہے۔ میں نے اپنی زیب النساء کے لیے ایسے ہی لڑکے کے خواب دیکھے ہیں آپا جی۔ میرا دل کہتا ہے۔ میری زیب النساء بہت خوش رہے گی اس کے ساتھ۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ماسٹر جی لیکن مجھے تو کوئی اتا پتا نہیں معلوم بس اتنا پتا ہے کہ اس کا گھر لاہور میں ہے۔ ادھر رحیم یار خان میں اس کا کوئی دوست ہے جس کے پاس آتا رہتا ہے۔ شاید اقبال کو پتا ہو۔ میں اقبال کو پیغام بھجواتی ہوں کہ میری بات سن جائے۔ یا پھر میں خود ہی جاتی ہوں کل اس کی طرف۔"

استانی جی کو ماسٹر عبدالعزیز کی پریشانی کا احساس تھا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی آپا جی لیکن اگر۔ اگر اس کا اتا پتا نہ معلوم ہو سکے تو۔ آپ نے اقبال کے متعلق بھی بات کی تھی نا تو پھر اقبال سے ہی بات طے کر دیجیے گا۔ میری طرف سے اختیار ہے آپ کو اچھا لڑکا ہے نیک اور شریف ہے بھلے میری زیب کے جوڑ کا نہیں ہے لیکن اسے خوش تو رکھے گا نا۔ میں جلد از جلد زیب النساء کی شادی کرنا چاہتا ہوں آپا جی۔ آپ اگر مہربانی کر کے کل صبح ہی چلی جائیں اقبال کی طرف تو میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو آپ ماسٹر جی زیب النساء مجھے اپنی فاطمہ کی طرح ہی عزیز ہے۔"

استانی جی نے کچن کی طرف دیکھا۔ زیب النساء ٹرے میں چائے کے دو کپ رکھے باہر آ رہی تھی۔ ماسٹر عبدالعزیز کے اندر آتے ہی انہوں نے زیب النساء کو چائے بنانے بھیج دیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

مہکتے میٹھے مستانے زمانے
کب آئیں گے وہ من مانے زمانے

جو میرے کنجِ دل میں گونجتے ہیں
نہیں دیکھے وہ دُنیا نے زمانے

تیری پلکوں کی جنبش سے جو ٹپکا
اس اک پل کے افسانے زمانے

تیری سانسوں کی سوغاتیں بہاریں
تیری نظروں کے نذرانے زمانے

ان ہی کی زندگی جو چل پڑے ہیں
تیری موجوں سے ٹکرانے زمانے

میں فکرِ ہستی کا پرستار
میری تسبیح کے دانے زمانے

مجید امجد

وہ جو تیرے فقیر ہوتے ہیں
آدمی بے نظیر ہوتے ہیں

دیکھنے والا اک نہیں ملتا
آنکھ والے کثیر ہوتے ہیں

جن کو دولت حقیر لگتی ہے
اُف! وہ کتنے امیر ہوتے ہیں

جن کو قدرت نے حُسن بخشا ہو
قدرتاً کچھ شریر ہوتے ہیں

زندگی کے حسین ترکش میں
کتنے بے رحم تیر ہوتے ہیں

پھول دامن میں چند رکھ لیجیے
راستے میں فقیر ہوتے ہیں

اے عدمؔ احتیاط لوگوں سے
لوگ منکر نکیر ہوتے ہیں

عبدالحمید عدمؔ

تصویر ادھوری ہے،

(اسپیشل بچوں کے لیے ایک نظم)

کائنات کے سب ہی رنگ پورے ہیں
مگر کہیں کوئی ایک تصویر ادھوری ہے

ماں کی کوکھ میں چھپے موتی نے
ست رنگی چادر اوڑھ لی
تخلیق کار کی ساری دلکشی خود میں
سمو لی...
کہکشاؤں کی سب ہی چمک لے لی...
گلشن کی مہک لے لی
جب وجود نے آنکھ کھولی
تو...
دھنک رنگ بکھرے اس خواب کی تعبیر
ادھوری ہے

وجود کے مکمل ہونے کی خواہش ادھوری ہے۔ میں نے دنیا سے الگ رہ کے بھی دیکھا جواد
ایک تصویر ادھوری ہے
ثوبیہ قطب

آپ جیسوں کے لیے اس میں رکھا کچھ بھی نہیں
لیکن ایسا تو نہ کہیے کہ دوا کچھ بھی نہیں

آپ کہیے تو نبھاتے چلے جائیں گے مگر
اس تعلق میں اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں

میں کسی طرح بھی سمجھوتا نہیں کر سکتا
یا تو سب کچھ ہی مجھے چاہیے یا کچھ بھی نہیں

کیسے جانا ہے کہاں جانا ہے کیوں جانا ہے
ہم کہ چلتے چلے جاتے ہیں پتا کچھ بھی نہیں

پھر کوئی تازہ سخن دل میں جگہ کرتا ہے
جب بھی لگتا ہے کہ لکھنے کو بچا کچھ بھی نہیں

اب میں کیا اپنی محنت کا بھرم بھی نہ رکھوں
مان لیتا ہوں کہ اس شخص میں تھا کچھ بھی نہیں

ایسی مہ زور اداسی کی دوا کچھ بھی نہیں
جواد شیخ

مرتب: شگفتہ جاہ

حسنِ تحریر
بادل جو برسائے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔'' اسی وجہ سے دین اسلام میں ماں، باپ اور استاد کا شکریہ ادا کرنے کیا صراحت سے حکم دیا گیا ہے۔ (سنن ابوداؤد)

اتحاد

حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ جب کسی منزل پر پڑاؤ ڈالا کرتے تھے تو بکھر جایا کرتے تھے اور گھاٹیوں اور وادیوں میں پھیل جایا کرتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تمہارا یہ گھاٹیوں اور وادیوں میں بکھر جانا شیطان کی طرف سے ہے۔''

اس فرمان کے بعد مسلمان جہاں بھی ٹھہرتے اکٹھے ہو کر مل جل کر رہتے۔

بیہقی کی روایت میں یہ بھی ہے (کہ اس کے بعد صحابہ اتنے قریب قریب رہنے لگے کہ) یوں کہا جانے لگا کہ اگر مسلمانوں پر ایک چادر ڈالی جائے تو وہ ان سب پر ہی آجائے۔ (حیات الصحابہ)

حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض مرتبہ ہمیں سریہ میں (جہاد کے لیے) بھیج دیتے اور ہمارا زاد راہ صرف کھجور کی ایک زنبیل ہوتی اور پہلے ہمارا امیر ایک ایک مٹھی کھجور ہم لوگوں میں تقسیم کرتا پھر یہ نوبت آجاتی کہ ایک ایک کھجور حصے میں آتی۔''

میں نے اپنے والد سے کہا کہ ایک کھجور کیا کام دیتی تھی؟

انہوں نے کہا ''اے بیٹے یہ نہ کہو، جب ہمیں ایک کھجور بھی ملنی بند ہو گئی تب ہمیں ایک کھجور کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔'' (حیات الصحابہ)

مہمان کی تواضع

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ایک دفعہ بیمار ہوئے تو کچھ لوگ ان کی عیادت کے لیے آئے۔ انہوں نے اپنی باندی سے کہا۔

''اے باندی! ہمارے ساتھیوں کے لیے کچھ لاؤ۔ چاہے روٹی کے ٹکڑے ہی ہوں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اچھے اخلاق جنت کے اعمال میں سے ہیں۔

محبت، دوستی اور احترام لوگوں کو آپس میں اتنا متحد نہیں کرتے جتنا کسی سے نفرت انہیں متحد کر دیتی ہے۔

وعدہ کا پاس

حضرت ہارون بن رباب کہتے ہیں

جب حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا۔

''فلاں آدمی کو تلاش کرو کیونکہ میں نے اس سے اپنی بیٹی (کی شادی کرنے) کا ایک قسم کا وعدہ کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اللہ سے میری ملاقات اس حال میں ہو کہ نفاق کی تین نشانیوں میں سے ایک نشانی یعنی وعدہ خلافی مجھ میں ہو۔ اس لیے میں آپ لوگوں کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنی بیٹی

pklibrary.com

کی شادی اس سے کردی ہے۔ (حیات الصحابہ)

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ سکندر اعظم نے ایران کی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے مقدونیہ میں اپنے محل کا قیمتی ساز و سامان اپنے سپاہیوں کو بخش دیا تھا۔ اس کے دوست کلیئرس نے پوچھا۔

''سکندر! تم نے اپنے لیے کیا رکھا؟'' سکندر اعظم ایک عظیم جرنیل ہونے کے ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھا۔ بڑے اعتماد سے کہا۔ ''امید''۔

☆ علم کی طلب سے شرم مناسب نہیں، کیونکہ ''جہالت'' زیادہ باعث شرم ہے۔ (افلاطون)

☆ کسی کو اتنا پیار دو کہ کوئی گنجائش نہ چھوڑو اگر وہ پھر بھی تمہارا نہ بن سکے تو اسے چھوڑ دو کیونکہ وہ محبت کا طلب گار نہیں بلکہ ضرورت کا پجاری ہے۔'' (شیخ سعدی)

☆ اگر کسی قوم کو بغیر جنگ کے شکست دینی ہو تو اس کے نوجوانوں میں فحاشی پھیلا دو۔ (سلطان صلاح الدین ایوبی)

☆ حضور کی بات پہ کسی اور کی بات کو فوقیت دینا ایسے ہے جیسے شرک۔ (واصف علی واصف)

کم ظرف

☆ کسی انسان کے کم ظرف ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنی زبان سے اپنی تعریف کرنے پر مجبور ہو، دوسروں سے اپنی تعریف سننا مستحسن نہیں اور اپنی زبان سے اپنی تعریف عذاب ہے۔ (واصف علی واصف)

اصل بات

☆ حضرت سلطان باہو فرماتے ہیں۔

اللہ کو ماننا اصل بات نہیں کیونکہ اللہ پاک اپنی قدرت اور شان سے خود کو منوا لیتا ہے۔ اصل بات تو اللہ کو منا لینے میں ہے جس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔''

بہترین اعمال

☆ حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں:

''بہترین اعمال تین ہیں ذکر الٰہی، بھائیوں سے ہمدردی اور آدمی کا اپنے نفس سے انصاف۔''

فرمایا: ''ریا کو صرف مخلص ہی پہچان سکتا ہے۔

خاموشی

☆ حضرت ابوالدرداء رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

''جیسے تم لوگ بات کرنا سیکھتے ہو۔ ایسے ہی خاموش رہنا بھی سیکھو۔ کیونکہ خاموش رہنا بہت بڑی بردباری ہے اور تمہیں بولنے سے زیادہ سننے کا شوق ہونا چاہیے۔ اور کبھی لایعنی بول نہ بولو۔ ہنسی کی بات کے بغیر خوامخواہ مت ہنسو اور بلاضرورت کسی جگہ مت جاؤ۔''

تکبر

ایک دن حضرت سلیمان بن داؤد نے انسانوں، جنوں، پرندوں اور چوپایوں سے کہا۔

''باہر نکلو.....''

دو لاکھ انسان، دو لاکھ جن باہر نکلے اور حضرت سلیمان کا تخت ہوا میں اڑنے لگا اور اتنا بلند ہو گیا کہ آپ نے آسمانوں پر فرشتوں کی تسبیح کی گونج سن لی پھر آپ نیچے کو ہوئے تو آپ کے قدم سمندر چھونے لگے۔ آپ نے ایک آواز سنی کہ کوئی کہہ رہا ہے۔

''اگر تمہارے پیغمبر کے دل میں ایک ذرے کے برابر بھی تکبر آ جاتا تو جتنا انہیں اونچا اوڑایا ہے۔ اس سے زیادہ ہی انہیں نیچے پھینک دیا جاتا۔''

☆☆

اس ماہ کی ہٹ سٹائلز

ادارہ

موقع شناس

کہتے ہیں کہ ایک بیوہ نے شادی کی عمر کو پہنچی ہوئی اپنی، حسین و جمیل بیٹی کے لیے حق مہر کا مطالبہ مبلغ پانچ لاکھ ریال رکھا تھا۔ کئی خواہش مند اتنا حق مہر سن کر ویسے ہی دست بردار ہو چکے تھے۔ اپنی ضد کا پکا ایک لڑکا بمشکل تین لاکھ ریال اکٹھے کر پایا۔

پیسے لے کر مزید کی مدد مانگنے کے لیے سیدھا اپنے باپ کے پاس پہنچا۔

”اباجی! میرا کچھ کرو، میں اس لڑکی پر فدا ہو گیا ہوں مگر اس کی ماں ہے کہ پانچ لاکھ ریال حق مہر سے ایک فلس کم پر بھی بات کرنے کو تیار نہیں۔ اب آپ ہی کچھ کیجیے۔“

باپ نے بیٹے کی سنجیدگی کو دیکھا اور کہا۔

”ٹھیک ہے پھر چل لا پیسے۔ کچھ کرتے ہیں تیرا بھی۔“

دونوں باپ بیٹا پیسے لے کر بیوہ کے گھر پہنچے۔

سلام دعا کے بعد باپ نے خاتون سے کہا۔

”میں آپ سے بات کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ جب تک میں اپنی بات مکمل نہ کرلوں آپ میری بات نہ کاٹیں۔“

خاتون نے کہا جی ”بسم اللہ کہیے۔“

لڑکے کے باپ نے کہا۔ ”میرا بیٹا آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ ایک لاکھ حق مہر ساتھ لایا ہے۔“

خاتون نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے اپنی بیٹی کے حق مہر میں پانچ لاکھ ریال سے ایک فلس کم بھی قبول نہیں ہے۔“

لڑکے کے باپ نے کہا۔ ”آپ بذات خود انتہائی خوب صورت اور جوان جہاں عورت ہیں۔ میں آپ کو ابھی ایک لاکھ ریال حق مہر ادا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میری زوجیت میں آجائیے۔“

خاتون کی خوشی سے باچھیں کھل کر کانوں کو جا لگیں۔ بمشکل اپنے جذبات کو دباتے ہوئے کہا۔

”اللہ آپ کا آنا مبارک کرے۔ مجھے آپ کی دونوں شرطیں قبول ہیں۔“

باپ بیٹا خوشی خوشی باہر نکلے تو لڑکے نے ہلکا سا گلا صاف کرتے ہوئے باپ سے کہا۔

”ابا جی! وہ ایک لاکھ ریال جو بچ گئے ہیں پھر وہ تو مجھے واپس دے دیجیے۔“

باپ نے کہا۔ ”ناں پتر اوئے ابھی ایک بڑا اور اہم مرحلہ تو باقی ہے۔ یہ ایک لاکھ ریال جا کر تیری ماں کو دینا پڑے گا تا کہ وہ بھی تو راضی ہو۔“

کون گالیاں دیتا ہے

میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کی نوعیت جاننے کے لیے ان کے ایک بزرگ نے بیوی سے پوچھا۔

”آخر تمہیں اپنے خاوند سے کیا شکایت ہے؟“

”یہ بات بات پر گالیاں دیتے ہیں اور کنجوس اتنے ہیں کہ گزارا کرنا بہت مشکل ہے۔“

بیوی نے شکایت کی تو خاوند تلملا کر بولا۔

”کون کم بخت اس بدذات، کمینی اور گھٹیا عورت کو گالیاں دیتا ہے بکواس کرتی ہے۔ سارے پیسے اس کو دیتا ہوں۔ خواہ جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو۔“

pklibrary.com

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

اقرا انس............کراچی

کل تک میری وحشت سے فقط تم ہی تھے آگاہ
ہر گام پہ اندیشہ رسوائی تو اب ہے
دل یوں دھڑکا پریشان ہوا ہو جیسے
کوئی بے دھیانی میں نقصان ہوا ہو جیسے

صائمہ سلیم............لاہور

گلی کوچوں میں برگ خشک کی صورت بکھرنا تھا
ہوائے دوستی کا کوئی تو انجام ہونا تھا
جنوں کے شہر میں لیکن ہماری ہار لازم تھی
ادھر اک شاعرہ تھی، اس طرف سارا زمانہ تھا

ارم کمال............فیصل آباد

یہ بھی اچھا ہوا کہ صرف سنتا ہے
دل اگر بولتا تو قیامت ہوتی

فاکہہ سہیل............کراچی

بلا سے آنکھ اس صورت کو ترسے
مگر وہ شخص تو گزرے ادھر سے

ثوبیہ خطب............کراچی

چھپانا پڑتا ہے دل میں کبھی کبھی اس کو
ہر ایک کرب کا اعلان تھوڑی ہوتا ہے

ندا طارق............لاہور

صرف بیتے ہوئے لمحوں پہ قناعت کرنا
کتنا مشکل ہے محبت کی اطاعت کرنا
راہ آسان ہوئی جاتی ہے گھائل دل کی
تم ذرا پھر سے ادھر نظر عنایت کرنا

صدف عمران............کے ڈی اے

کسے خبر تھی کہ اتنی دلیر لڑکی بھی
جہاں کے خوف سے میری یاد تک بھلادے گی

صبا ریاض............حیدر آباد

تجھے خبر ہے، تجھے سوچنے کی خاطر ہم
بہت سے کام مقدر پہ ٹال رکھتے ہیں
تمہارے بعد یہ عادت سی ہوگئی اپنی
بکھرتے سوکھتے پتے سنبھال رکھتے ہیں

ثمینہ تاج............گوجرانوالہ

وقت کچھ اور تیری یاد کاٹ جائے گا
دو گھڑی کو جو قدم عمر رواں کا ٹھہرے
کوئی بھی شخص نہ ہو پھر غم دوراں کا اسیر
درد ہر دل میں اگر سارے جہاں کا ٹھہرے

نادیہ یاسر............گوجر خان

منزل بہت ہی دور تھی، رستے تھے اجنبی
تاروں کے ساتھ ساتھ نکلنا پڑا ہمیں
سایہ مثال آئے تھے اس کی گلی میں ہم
ڈھلنے لگی جو شام تو ڈھلنا پڑا ہمیں

آسیہ جاوید............علی پور چٹھہ

ہم سے مت پوچھ راستے گھر کے
ہم مسافر ہیں زندگی بھر کے
آنکھ نم بھی کرو تو بس اتنی!!
رنگ پھیکے پڑیں نہ منظر کے

ثمرہ عافیہ............گرین ٹی

گزری سفر میں زندگی اور حاصل سفر
کچھ منزلوں کے خواب، تو کچھ راہ گزر کے خواب

طوبیٰ اظہر............کورنگی

ہر ایک شب میری تازہ عذاب میں گزری
تمہارے بعد تمہارے ہی خواب میں گزری
میں ایک پھول ہوں وہ مجھ کو رکھ کے بھول گیا
تمام عمر اسی کی کتاب میں گزری

☆☆

pklibrary.com

امتہ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

اصحاب الاخدود

اخدود کی جمع اخادید ہے۔ اخدود زمین میں گڑھے کو کہتے ہیں۔ یہ کفار کی ایک قوم کا واقعہ ہے کہ انہوں نے مومنوں کو ان کے ایمان کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرنے کی کوشش کی اور ان کو زبردستی دین اسلام سے ہٹانے لگے۔ مومنین نے اپنے دین کو چھوڑنے سے انکار کیا اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اس پر ان کفار نے ایک بڑا گڑھا کھودا اور بہت سارا ایندھن جمع کر کے آگ لگا دی پھر مسلمانوں کو اپنے موقف سے ہٹنے کو کہا۔ مسلمان اپنے دین پر قائم رہے سزا کے طور پر ان سب کو آگ میں ڈال دیا۔

حضرت امام احمد، حضرت صہیب رحمتہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں حضرت صہیب فرماتے ہیں تمہارے زمانے سے قبل ایک بادشاہ تھا۔ جس نے ایک ساحر کو محل میں ملازمت پر رکھا ہوا تھا۔ جب وہ ساحر بوڑھا ہو گیا۔ تو اس نے بادشاہ سے کہا۔

بادشاہ سلامت میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرا وقت قریب ہے۔ آپ ایک بچہ میرے حوالے کیجیے تاکہ میں اپنا سارا علم سحر اسے سکھا دوں چنانچہ بادشاہ نے ایک لڑکا جادو سیکھنے کے لیے ساحر کے حوالے کر دیا۔

ساحر اور اس لڑکے کے گھر کے درمیان ایک راہب رہا کرتا تھا۔ وہ لڑکا ساحر کے پاس جاتے وقت راہب کے پاس سے بھی گزرتا تھا۔ وہ راہب کی باتیں سنتا اور وہ باتیں اسے اچھی لگتیں۔ اس طرح گھر سے نکل کر راہب کے پاس وقت گزارنے سے، ساحر کے پاس پہنچنے میں دیر ہو جاتی تھی تو ساحر اس کو سزا دیتا اور مارتا پیٹتا۔ اور پوچھ گچھ کرتا کہ کیوں تاخیر کی۔ کس چیز نے تجھے وقت پر آنے سے روکا۔ راہب کے پاس واپس گھر کو آتے ہوئے پھر اس کے پاس کچھ دیر کے لیے بیٹھا رہتا۔ گھر تاخیر سے پہنچتا تو گھر والے ڈانٹ ڈپٹ کرتے اور بعض دفعہ مارتے۔ لڑکے نے راہب سے اپنی حالت زار بیان کی۔ تو راہب نے کہا۔ اگر ساحر تاخیر کا سبب پوچھے تو کہہ دینا گھر سے ہی تاخیر سے نکلا تھا۔ اور اگر گھر والے پوچھیں تو بتا دینا کہ ساحر کے ہاں سے چھٹی تاخیر سے ملی۔ اس طرح سلسلہ چلتا رہا۔

ایک دن راستے میں چلتے وقت کیا دیکھتا ہے کہ ایک خوفناک جانور سر راہ بیٹھا ہے۔ کسی کو گزرنے نہیں دیتا۔ کوئی اس کے قریب نہیں جا سکتا تو لڑکے نے سوچا کہ آج راہب اور ساحر کے معاملوں کو جانچنے اور پرکھنے کا دن ہے کہ ساحر کا عمل اللہ کو پسند ہے یا راہب کا؟

چنانچہ اس نے ایک پتھر ہاتھ میں لیا اور کہا یا اللہ! اگر راہب کا عمل آپ کو زیادہ پسند اور محبوب ہے

تو سے پتھر اس جانور کو مار دے۔ تاکہ لوگ یہاں سے گزر سکیں۔ یہ کہہ کر اس کی طرف پتھر پھینک دیا۔ پتھر لگتے ہی جانور مر گیا۔ لوگ با آسانی وہاں سے گزر گئے۔ وہ بھی وہاں سے گزر کر راہب کے پاس آیا اور سارے واقعے کی خبر دی۔ تو راہب نے کہا ارے میرے عزیز! آپ تو مجھ سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ اور مجھ پر فضیلت حاصل کی۔ آپ آزمائش میں مبتلا ہوں گے، اگر میں کسی آزمائش کا شکار ہو گیا تو میرے متعلق کسی کو ہرگز نہ بتائیے گا۔

بچے میں کمال آ گیا۔ مادر زاد نابینوں، برص کی مہلک بیماری میں مبتلا مریضوں کو ٹھیک کرتا۔ غرض تمام بیماریوں کا علاج کرتا۔ اور وہ فوراً ٹھیک ہو جاتے۔ اسی اثناء میں بادشاہ کا ایک ہم نشین نابینا ہو گیا۔ وہ اس لڑکے کے متعلق سن کر اس کے پاس بہت سارے ہدیے لے کر حاضر ہوا اور عرض کیا مجھے بھی اس بیماری سے شفا دیجئے۔ تو لڑکے نے کہا میں شفا نہیں دے سکتا۔ شفاء تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں البتہ اللہ تعالیٰ میرے ہاتھوں اس کو ظاہر کرتا ہے اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آؤ گے تو میں اللہ تعالیٰ کے حضور دستِ دعا دراز کروں گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دیں گے۔ اس نے ہاں میں جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا۔ بچے نے دعا کی بینائی اس کی لوٹ آئی۔ وہ بالکل صحت یاب ہو کر حسب معمول بادشاہ کی مجلس میں حاضر ہوا۔

"بادشاہ نے اس کا نام لے کر کہا: اے فلاں تیری بینائی کیسے لوٹ آئی تو اس شخص نے کہا: میرے رب نے شفا دی۔ "بادشاہ نے کہا: میں؟" اس نے کہا: "تو نہیں بلکہ میرا اور تمہارا پروردگار اللہ ہے۔" بادشاہ نے کہا: کیا میرے علاوہ بھی تیرا کوئی رب ہے؟ اس نے کہا: ہاں ہے۔ اس پر بادشاہ مسلسل اس کو تنگ کرنے لگا۔ آخر کار اس نے اس بچے کے متعلق بتا دیا۔ بادشاہ نے لڑکے کو بلایا۔ اور اس سے کہا:

"ارے لڑکے! تو اپنے جادو سے برص اور مادر زاد نابینا اور دوسرے امراض کو ٹھیک کرتے ہو؟"

لڑکے نے کہا: "میں کسی کو بھی ٹھیک نہیں کر سکتا۔ ٹھیک کرنے والا اور شفا دینے والا صرف اور صرف ایک اللہ ہی ہے۔"

بادشاہ نے کہا! میں؟ لڑکے نے جواب دیا: نہیں، بادشاہ نے کہا کیا میرے علاوہ بھی تیرا کوئی رب ہے؟ لڑکا، میرا اور تمہارا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ تو اس کو بھی سزا دینے لگا اور مسلسل تکلیف میں مبتلا کیے رکھا۔ آخر کار اس نے راہب کے متعلق بتا دیا۔ تو راہب کو اپنے سامنے حاضر کر کے کہا اپنے دین (سابقہ) سے رجوع کرو۔ راہب نے اپنا مذہب چھوڑنے سے انکار کیا۔ تو بادشاہ نے اس کے سر پر آری چلا دی اور اس کو دو ٹکڑے کر ڈالا۔ پھر اپنے ہم نشین (جو مسلمان ہو گیا تھا) سے کہا: اپنے دین کو چھوڑ کر سابقہ دین اختیار کرو۔ اس نے بھی انکار کیا۔ اس کو بھی آرے سے چیر کر دو حصے کر کے زمین پر ڈال دیا۔ اس کے بعد لڑکے سے کہا: اپنے دین کو ترک کرو۔ اس نے انکار کیا تو اس نے اپنے کارندوں کو بلا کر کہا: اس لڑکے کو فلاں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاؤ اگر وہاں جا کر اپنے عقیدے سے توبہ کر لے اور باز آ جائے تو ٹھیک ہے ورنہ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرا دو۔ تو بادشاہ کے لوگ اسے لے کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گئے، لڑکے نے دربار الٰہی میں دعا کی کہ یا اللہ آپ ہی ان لوگوں سے نمٹ لیجیے۔ یہ کہنا تھا پہاڑ ہلنے لگا اور سارے لوگ لڑھک کر مر گئے۔ اور لڑکا صحیح سلامت واپس آیا۔ اور بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔

بادشاہ نے کہا: تمہارے ساتھی کہاں گئے؟ لڑکے نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ان سے نمٹ لیا۔ پھر بادشاہ نے اس کو ایک صندوق یا کسی بڑے برتن میں ڈال کر اپنے کارندوں کو کہا: اسے دریا کے پاس لے جاؤ اور اگر وہاں پہنچ کر اپنے دین سے توبہ کر لے تو

ٹھیک ہے اسے چھوڑ دو ورنہ اس کو دریا برد کر دینا۔ چنانچہ لڑکے کو لے کر دریا کے پاس آ گئے۔ لڑکے نے کہا: الٰہی آپ جیسے چاہیں ان کا کام تمام کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو غرق کر دیا۔

اور لڑکا پھر بچ گیا اور بادشاہ کے دربار میں پھر حاضری دی۔

بادشاہ نے پوچھا تیرے ساتھی کہاں ہیں؟ کہنے لگا: اللہ تعالیٰ نے ان کا کام تمام کر دیا۔ پھر اس نے بادشاہ سے کہا: تم ہرگز مجھے قتل نہیں کر سکتے ہاں البتہ ایک جو طریقہ میں بتا دوں اس کے مطابق اگر تم عمل کرو گے تو مجھے قتل کر سکو گے۔ بادشاہ نے کہا: بتاؤ وہ کیا طریقہ ہے؟ تو لڑکے نے کہا: تم سب لوگوں کو ایک میدان میں جمع کرو اور مجھے کھجور کے ایک تنے پر چڑھا دو۔ اور میرے ہی تیر کش سے ایک تیر اٹھا کر بسم اللہ ورب الغلام کہہ کر تیر چلاؤ تو میں مر سکتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ایسا ہی کیا گیا۔ جب بسم اللہ ورب الغلام کہہ کر تیر چلایا گیا تو تیر اس کی کنپٹی پر لگا اور بچہ اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ یہ منظر دیکھ کر وہاں موجود تمام لوگ لبیک کہنے لگے۔ ''آمنا برب الغلام'' ہم اس لڑکے کے پروردگار پر ایمان لائے۔ بادشاہ سے کہا گیا: دیکھ لیا؟ جس چیز کا خطرہ تھا سو وہ ہو کر رہ گیا (بچے کو مارنے کا کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ الٹا نقصان عظیم ہوا از مترجم) تمام کے تمام لوگ اس بادشاہ کی مصنوعی خدائی کا برملا انکار کر کے خالق حقیقی کی ذات اقدس پر ایمان لائے۔

بادشاہ نے طیش میں آ کر سرے گلی گڑھے کھدوا کر اس میں زوردار آگ لگانے کا حکم دیا، اس پر عمل کیا گیا۔ جب آگ بھڑک اٹھی تو اس نے کہا: ان میں سے جو بھی اپنے نئے دین کو ترک کر دے اسے کچھ نہ کہنا اور جو اپنے دین کو چھوڑنے پر تیار نہ ہو اس کو آگ میں ڈال دو۔ چنانچہ اس پر عمل شروع ہوا۔ ایک عورت کو لایا گیا جس کی گود میں اس کا دودھ پیتا بچہ بھی تھا۔ بچہ نے اپنی والدہ کو مخاطب کر کے کہا: امی جان! صبر سے کام لو آپ ہی حق پر ہیں۔

اس روایت کے مطابق اصحاب الاخدود کا زمانہ کافی قدیم ہے یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تقریباً پانچ سو سال بعد کا قصہ ہے۔ محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ اسلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کے زمانے کا واقعہ ہے یہ زیادہ قرین قیاس لگتا ہے۔ واللہ اعلم

یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کے واقعات متعدد بار رونما ہوئے ہوں جیسا کہ ابن ابی حاتم عبدالرحمن بن جبیر کے حوالے سے کہتے ہیں۔

یمن میں تبع کے زمانے میں اخدود کا واقعہ پیش آیا اور قسطنطنیہ میں قسطنطین کے زمانے میں لوگوں کو گڑھا کھود کر اس وقت سزا دی گئی جب دین مسیح کو لوگ چھوڑ کر بے دین ہو گئے تھے اور دین پر کاربند لوگ اس عذاب سے دوچار کیے گئے تھے۔

عراق کے شہر بابل میں بخت نصر کے زمانے میں یہ واقعہ ہوا۔ جب بخت نصر کے بت بنا کر لوگوں کو اس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کو کہا۔ دانیال علیہ السلام اور ان کے ساتھی میشائیل اور کچھ لوگوں نے ان بتوں کی عبادت سے صاف انکار کر دیا۔ بخت نصر نے ان لوگوں کے لیے آگ کی بھٹی تیار کی اور لوگوں کو اس میں ڈال دیا۔ اسباط نے سدی کے حوالے سے نقل کیا ہے اخدود کے واقعات تین مختلف اوقات میں مختلف علاقوں میں رونما ہوئے۔ ایک عراق میں، دوسرا شام میں تیسرا یمن میں۔ تینوں مقامات پر کھائیاں کھود کر لوگوں کو اس میں ڈال دیا گیا۔

☆☆

بقیہ صفحہ نمبر 205

شعاع وخواتین سچ کہوں تو بہت اچھے جارہے ہیں اگرچہ میں تھوڑی سی صاف گو ہوں مگر تعریف بھی دل کھول کر کرنے والوں میں سے ہوں۔ ڈائجسٹ وقت کے حساب سے اچھے چل رہے ہیں چاہے کہانیاں ہوں یا سلسلے سب سچ ہیں بس ایک عرض ہے کہ اب بھی صفحات کا ایشو ہو تو قیمت زیادہ کر دینا مگر صفحات کم ہرگز نہ کرنا کہ اس سے معیار پر فرق پڑے گا۔ ساجدہ کا سن کر بہت افسوس ہوا کہ کتنی حسین یادیں وابستہ تھیں مصنفات سے ہم کتنے دلچسپ سے سروے کرتی تھیں۔ رفعت دو پونیوں والی تصویر دیتی تھی۔ ساجدہ کا سائیڈ پوز، نگہت عبداللہ کا بھی سائیڈ پوز ہوتا تھا۔ ہما کوکب کے بابی کٹ سے بال، لبنی غزل ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوتی تھی، فریدہ اشفاق کی سر پر دوپٹہ پہنی لبنی سی تصویر ہوتی تھی اور کتنے ہی دلکش سے سلسلے ہوا کرتے تھے وہ وقت بہت اچھا تھا 2000ء سے پہلے کا۔

ذوالقرنین مرحوم ہم لڑکیوں کے پسندیدہ ہوتے تھے کتنے اور تمہارے، سائرہ غلام نبی اور دیگر سے احوال یادوں، ملاقاتوں اور انٹرویوز کے تو کبھی کہیں گھومنے پھرنے کے اسٹاف کے ساتھ خیر یادیں ہی مسکراہٹ کی وجہ بنتی ہیں۔ اچھا ایک رائٹر ہوتی تھی افشاں آفریدی مجھے نگہت کے ساتھ نئے لکھنے والوں میں اس وقت وہ بھی بہت پسند تھیں۔ ان کا ناول جو کرن میں سلسلے وار شروع ہوا تھا 1997ء میں نام یاد نہیں تو تم حیران ہو گی کہ 1997ء میں ہی میری شادی ہوئی تھی تو اپنی مہندی والے دن میں نے افشاں کے قسط وار ناول کی تازہ قسط پڑھی تھی کرن گھر آئی مہمان کہتیں کہ یہ دلہن دیکھو ذرا کیسی پاگل بنی ہوئی ہے اس وقت بھی رسالوں میں سر کھپا رہی ہے تو آج کل یہ افشاں آفریدی کہاں ہیں۔ مجھے تم ادارے والوں کی یہ ہی بات سچ کہوں تو بہت پسند ہے تم نے تعصب کا خاتمہ کیا ہے اور ہمیشہ سے ہر رائٹر اور قاری کو وہ کہیں سے بھی ہو ہمیشہ برابر جگہ دی ہے اور سب کو چھاپا ہے۔

فرح بخاری کا نازنین ناول بہت اچھا تھا پٹھانوں پر لکھا ہوا۔ میں تو سندھ سے ہوں اور گئی پنجاب میں مگر اب تک لہجہ وہی سندھ والا ہے ہاں بچے پنجابی ہی انداز میں بولتے ہیں۔

مارچ کا سرورق مجھے بہت ہی پسند آیا ماڈل کے کپڑے اور پرنٹڈ سوٹ دیکھ کر پرانا وقت یاد آ گیا کہ یہ فیشن کتنا ان ہوا تھا 2000 سے پہلے، ایک جیسے شلوار قمیض اور اب پھر سے یہ فیشن ان ہے۔ نبی کی باتیں بہت ہی اصلاحی اور کار آمد اور رمضان کی مناسبت سے تھیں اس بار تاریخ کے جھروکے اور باتوں سے خوشبو بھی موقع کی مناسبت سے بہت ہی قابل تعریف تھیں۔ پکوان میں تکہ پراٹھا اور کھجور کی چٹنی مجھ سے تو بچے پودینے کی چٹنی

ابن انشاء کی معروف کتابیں

کتاب کا نام	قیمت
آپ سے کیا پردہ	600
باتیں انشاجی کی	600
قصہ ایک کنوارے کا	225

مزید معلومات کے لئے فون کریں
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی
فون: 021-32216361

pklibrary.com

بنواتے ہیں زیادہ تر جو فریج میں بھی رکھی رہتی ہے ہری مرچوں والی اور کام آجاتی ہے) کچھ منفرد لگی باقی سب پرانی ٹپس تھیں۔ اس بار گھر کا اچار نہیں ڈالوں گی کہ بھائی جان آئے تو میں نے پہلے سے ہی شکار پوری دو سے تین منفرد قسم کے اچار منگوا لیے تھے جو سالن نہ بنایا ہو تو کام آجاتے ہیں یا پراٹھے کے ساتھ اچھا لگتا ہے اور دال کے ساتھ بھی یا جب بچے کسی سبزی میں نخرے کریں۔

نانا جوڑا میں اس بار کچھ مثبت پڑھنے کو ملا تو سکون سا ہوا وہیں یمنیٰ زیدی اور سائرہ یوسف سے ملاقات معذرت بالکل پسند نہ آئی، صدف ناصر آپ کے تبصرے شعاع و خواتین میں ماشاء اللہ بہت گہرائی سے لکھے ہوتے ہیں عارفہ فضل شاہ، انیسہ عائش اور علیا میمون بحیثیت مصنفہ اچھا اضافہ ہیں۔ کہانیوں میں نگہت سیما کی تعریف تو واقعی سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ والعصر بھی اچھے سے اپنی منازل طے کر رہا ہے۔۔۔ ورنہ تو دل کرتا ہے کسی ٹرک کے نیچے آجائے اور قصہ ختم ہو فرح بخاری کو ایک اور زبردست کہانی کے اختتام پر بہت مبارک باد کہ بہت ہی اچھے انداز میں وسیلہ و منصب کی محبت کی شام اور شہر ہجر کی داستان ہر ماہ سنائی ساتھ مریم عزیز ایک معتبر نام ہے جس نے ہمیشہ شعاع و خواتین کو اپنی دلکش سی کہانیوں سے سجایا پسند بھی ہے۔ مریم کا شعاع میں دو اقساط کا ناول وہ ایک شخص مجھے بہت پسند ہے۔ فلک تنویر نے اپنے ناول میں بہت اچھا اور مثبت پیغام دیا پلوشہ کے کردار سے، وہیں کہانی بھی بہت پسند آئی۔ راشدہ رفعت نے چوتھی بہو دلچسپ سی داستان سنائی جس میں فہمیدہ آخر میں ہمارے ڈائجسٹوں کی انفرادیت کی قائل ہو ہی گئی اور ہونا بھی چاہیے۔ میرا بس چلتا تو میں ڈائجسٹوں کو تعلیمی نصاب میں ڈال دیتی کہ اصل بنیاد تو یہ ہی ہیں اور جوان اصلاحی سوچ دینے والے اور تربیت گاہ جو ڈائجسٹوں کو غلط سمجھتے ہیں وہ ایک شمارہ پورا پڑھیں ذرا، پھر ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

ہاجرہ ریحان بحیثیت افسانہ نگار مجھے شروع سے ہی پسند ہیں کہ ایک الگ سا انداز ہوتا ہے ان کی تحریروں میں، نورین نے چند لقموں کی خاطر افسانہ بہت ہی عرق ریزی سے لکھا اب اگلے ماہ ملتے ہیں کہ افطار کی تیاری بھی کرنی ہے اور ہانڈی بھی بنانی ہے کچھال بنا رہی ہوں۔

ج: پیاری فرخندہ! آپ ہماری پرانی قاری ہیں ہمیں یاد ہے ہر ماہ باقاعدگی سے خط لکھتی تھیں۔ اب کافی عرصہ بعد شرکت کی ہے تو اب رابطہ رکھیے گا۔ پیاری بہن آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا ہمیں افسوس ہے پتا نہیں لگائی بجھائی کر کے لوگوں کو کیا ملتا ہے۔ خیر آپ بھی اب احتیاط رکھیے گا۔ پھر سوچ سمجھ کر اعتماد کیجیے گا۔

افشاں آفریدی آج کل جرمنی میں ہوتی ہیں۔ ان کے کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

فرخندہ آپ کے لیے ایک مشورہ ہے۔ آپ افسانے لکھنا شروع کر دیں۔ بہت باصلاحیت ہیں۔ بہت روانی ہے آپ کی تحریر میں۔

عارفہ فضل شاہ نے لکھا ہے

شعاع کرن خواتین اس دفعہ تینوں ایک ساتھ ملے۔ رمضان المبارک کی مصروفیات کی وجہ سے ابھی صرف شعاع ہی پڑھا ہے۔ حمد و نعت کمال۔ مجھے نانا جوڑا مسز بٹ کی پچاس سالہ ازدواجی زندگی کی کہانی بہت اچھی لگی۔ ان کی تحریر میں پختگی تھی۔ ان کو لکھنا چاہیے۔

افسانے اچھے تھے وقتی فائدہ نے اچھا سبق دیا۔ مال غنیمت میں کینیڈین پلٹ کے متکبر انداز پہ بہت افسوس ہوا۔ ماہ الملوک ہمیشہ کی طرح بہترین۔ میری پسندیدہ مصنفہ کا ناولٹ چوتھی بہو رسالے کی جان تھا۔ ان کی تحریر پڑھ کر یوں لگا ڈائجسٹ کا پرانا دور لوٹ آیا ہے۔ مریم عزیز کا ناولٹ شروع ہو چکا ہے امید ہے بہترین ہوگا۔

خطوط سب دل سے قریب تھے۔ قارئین کا دل سے شکریہ کہ انہوں نے میرا افسانہ محبت کا ہی آنچل پسند کیا۔ صدف ناصر آپ سے بہت اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے آپ سے اپنے اعزازیہ کے بارے میں پوچھنا ہے۔

ج: پیاری عارفہ! آپ کو جنوری کا اعزازیہ بھجوا دیا ہے۔ ایک ہفتہ میں مل جائے گا ان شاء اللہ باقی افسانوں کا بھی آپ کو ملتا رہے گا۔

☆☆

pklibrary.com

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

شیر خورما

اجزاء:

دودھ	ایک کلو
چینی	آدھا کپ
سویاں	آدھا کپ
گھی	آدھا کپ
پانی	آدھا کپ
بادام، پستہ، کشمش	حسب پسند
چھوہارے، کھجور	حسب پسند
کیوڑہ	آدھا کھانے کا چمچہ
چھوٹی الائچی، لونگ	چھ عدد

ترکیب:

چھوہاروں کو ایک رات کے لیے بھگو دیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرلیں۔ ایک پتیلی میں دودھ ڈال کر ابال لیں۔ ایک الگ پین میں گھی گرم کریں۔ اس میں الائچی اور لونگ ڈال کر کڑکڑائیں اس میں سویاں ڈال کر بھون لیں۔ خشک میوہ ڈال کر بھون لیں۔ اس میں چینی شامل کریں۔ اس کے فوراً بعد پانی ڈال دیں اور ایک ابال لے آئیں اس مکسچر کو دودھ میں ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ نہ زیادہ گاڑھا کریں اور نہ زیادہ پتلا پھر تیار ہو جائے تو میوے سے سجا کر پیش کریں۔

پائن ایپل کسٹرڈ ڈیزرٹ

اجزاء:

ونیلا کسٹرڈ	چار کھانے کے چمچے
بنانا کسٹرڈ	چار کھانے کے چمچے
فریش کریم	دو پیکٹ
چینی	چار کھانے کے چمچے
دودھ	ایک لیٹر
پائن ایپل	آدھا ٹن
پستے، بادام	سجاوٹ کے لیے

ترکیب:

دیگچی میں دودھ ابال لیں۔ تھوڑے نیم گرم دودھ میں دونوں فلیور کے کسٹرڈ الگ الگ گھول لیں۔ آدھے دودھ میں ونیلا کسٹرڈ اور آدھے دودھ میں بنانا کسٹرڈ چینی ڈال کر تیار کرلیں۔

سرونگ گلاس میں پہلے بنانا کسٹرڈ تھوڑا ڈال کر سیٹ ہونے کے لیے فریزر میں رکھ دیں۔ اس کے بعد اس پر فریش کریم کی تہہ لگائیں اور ونیلا کسٹرڈ ڈال کر سیٹ ہونے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اوپر پائن ایپل کے کیوب رکھ کر پستے بادام سے گارنش کریں۔

باربی کیو چکن بریانی

اجزاء:

چکن	آدھا کلو
ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
پسا اور کٹا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
دہی	دو کھانے کے چمچے
اورنج، ریڈ رنگ	ایک چٹکی
تیل	آدھا کپ
ابلے چاول	آدھا کلو

مسالے کے اجزاء:

sklibrary.com

تلی پیاز	آدھا کپ
ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر	دو عدد
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
دہی	آدھا کپ
ہرا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
پودینے کے پتے	بیس عدد
کیوڑا	ایک کھانے کا چمچہ
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
ہری مرچ	چھ عدد

ترکیب:

بغیر ہڈی کی چکن کو ادرک لہسن، ہلدی، لال مرچ، پسا گرم مسالا، بھنا اور کٹا زیرہ اور دہی کے ساتھ اچھی طرح میری نیٹ کر کے مکس کریں اور تیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔

اب کوئلے کا دم دے کر چکن کو اسکیورز (اسٹک بازار میں ملتی ہیں نہ ہو تو اسے فرائی کرلیں) پر لگا کر دو کھانے کے چمچے تیل میں فرائی کرلیں۔

مسالا بنانے کے لیے تیل گرم کر کے اس میں تلی پیاز، ادرک لہسن، کٹے ہوئے ٹماٹر، پسی لال مرچ اور دہی شامل کر کے اسے اچھی طرح بھونیں اور آدھا کپ پانی کٹا ہرا دھنیا ہری مرچ پودینے کے پتے ڈال دیں۔

اس مسالے کے اوپر ابلے چاول ڈالیں اور ایک کھانے کا چمچہ کیوڑے کو ایک چٹکی زردے کا رنگ کے ساتھ ملا کر اس پر ڈالیں۔

اس کے بعد پندرہ منٹ دم پر ہلکی آنچ پر رکھیں آخر میں چاولوں کو مکس کر کے ایک ڈش میں نکالیں اور چکن اوپر ڈال کر سرو کریں۔

مٹن اسٹو

اجزاء:

بکرے کا گوشت	آدھا کلو
چھوٹی پیاز	ایک پاؤ
دہی	آدھا کپ
گھی	آدھا کپ
ثابت لال مرچ	دس عدد
لہسن ادرک	تھوڑا تھوڑا
ثابت گرم مسالا	تھوڑا سا
ٹماٹر	آدھا کپ
گرم مسالا	چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا	حسب ضرورت

ترکیب:

چھوٹی پیاز چھیل کر تھوڑے سے گھی میں ہلکا سا تل کر علیحدہ رکھیں۔ باقی گھی میں گوشت، ثابت لال مرچ، لہسن، ادرک، ثابت گرم مسالا ڈالیں۔ ڈھک کر پکائیں کہ گوشت گل جائے۔ اگر ضرورت ہو تو ایک کپ کھولتا پانی ڈال کر پکائیں تاکہ گوشت گل جائے۔ آخر میں ٹماٹر کاٹ کر ڈالیں، دہی اور پانی ڈال کر بھون لیں۔ جب گھی نظر آنے لگے تو ایک چٹکی گرم مسالا اور ہرا دھنیا ڈال کر اتار لیں۔

فیٹوشینی الفریڈو

اجزاء:

پاستا	دو کپ
نمک	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسی جائفل	چوتھائی چائے کا چمچہ
اوریگانو لیوز	آدھا چائے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
مسٹرڈ پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
چیڈر چیز	تین کھانے کے چمچے
کریم	چار کھانے کے چمچے
دودھ	آدھا کپ

وائٹ سوس کے اجزاء:

مکھن	دو کھانے کے چمچے

میدہ	دو کھانے کے چمچے
نمک	چوتھائی چائے کا چمچہ
سفید مرچ	چوتھائی چائے کا چمچہ
رائی	چوتھائی چائے کا چمچہ
یخنی	ایک کپ
دودھ	آدھا کپ

ترکیب:

وائٹ ساس بنانے کے لیے ایک پین میں مکھن، میدہ، نمک، سفید مرچ، یخنی اور دودھ ڈال کر اسے پکائیں اور ساتھ ساتھ چمچہ ہلاتے رہیں۔ یہاں تک کہ آمیزہ گاڑھا ہو جائے۔

فیوشینی بنانے کے لیے تیار کیے ہوئے وائٹ ساس میں دودھ، چیڈر چیز، نمک، پسی کالی مرچ، اوریگانو، پسی جائفل شامل کر کے اچھی طرح ملا لیں۔ ابال آنے تک پکائیں۔

پھر اس میں دو کپ شامل کر کے گارلک بریڈ کے ساتھ سرو کریں۔

باربی کیو روسٹ

اجزاء:

چکن	آدھا کلو
دہی	ایک کپ
لیموں	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
ہلدی	چوتھائی چائے کا چمچہ
گرم مسالا	چوتھائی چائے کا چمچہ
چاٹ مسالا	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:

دہی میں لیموں کا رس، نمک، کالی مرچ، ہلدی، گرم مسالا، چاٹ مسالا ڈال کر مکس کریں، اس میں مرغی ڈال کر دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ اس کے بعد پتیلی میں ڈال کر ڈھک کر ہلکی آنچ پر پکائیں، باربی کیو روسٹ چکن تیار ہے۔ پلیٹ میں نکالیں۔ سلاد کے پتوں، ٹماٹر، لیموں سے سجا کر گرم گرم پیش کریں۔

سادہ کیک

اجزاء:

انڈے	چار عدد
پسی چینی	ایک کپ
میدہ	ایک کپ
ونیلا ایسنس	آدھا چائے کا چمچہ
بیکنگ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
تیل	تین چوتھائی کپ

ترکیب:

انڈوں اور پسی ہوئی چینی کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اس میں ایک چٹکی نمک اور ونیلا ایسنس شامل کر دیں۔

میدہ، خشک دودھ بیکنگ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح ملا لیں اور پھر تیل ڈال کر مکس کر لیں۔ اب کسی سلور کے برتن کو تیل لگا کر چکنا کر لیں اور اس پر براؤن پیپر لگا لیں۔ اور آمیزہ ڈال دیں۔

کسی بڑے برتن میں اسٹینڈ یا اسٹیل کی پلیٹ الٹی کر کے رکھیں اور اس پر یہ برتن رکھ کر ڈھانپ دیں آنچ درمیانی رکھیں۔ بیس منٹ بعد چیک کریں کسی چھری یا ٹوتھ پک کے ذریعے اگر بیٹر اس سے نہ چپکے تو سمجھ لیں تیار ہے ہلکا کر آنے پر اتار لیں۔

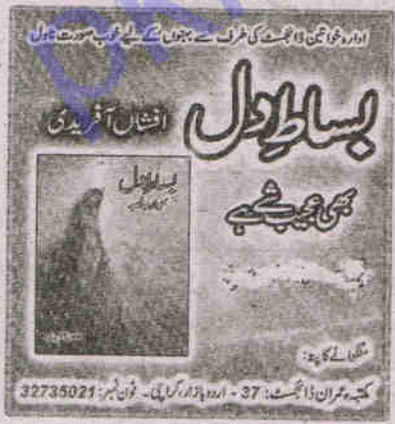

☆☆

ادارہ

عید پر خوب صورت بنیے

خواتین کے سنگھار کے بغیر عید کی تیاری ادھوری ہوتی ہے۔ عید کے دن خواتین کم سے کم وقت میں اچھا میک اپ کر سکتی ہیں۔

میک اپ کا پہلا مرحلہ بیس کی تیاری ہے۔ بیس بنانے سے قبل آپ کی جلد کا صاف وشفاف ہونا بے حد ضروری ہے۔ سب سے پہلے اپنا چہرہ اچھے سے فیس واش یا صابن سے دھوئیں۔ چہرے پر برف کی مدد سے مگور کریں تا کہ جلد کے سوراخ بند ہو جائیں۔ اب جلد کی صفائی کے لیے چہرے اور گردن کو کلینزنگ ملک سے صاف کریں۔ جو آپ کے چہرے پر زیادہ نمایاں نہیں ہوگا اور اسے نیچرل میک اپ فراہم کرے گا۔ تو میک اپ لک کے لیے ان دنوں خواتین میں بی بی کریم کا استعمال بھی عام ہے۔ اگر آپ فاؤنڈیشن استعمال کر رہی ہیں تو کوشش کریں کہ اسے کم سے کم لگائیں۔ آخر میں بیس سیٹنگ کے لیے بڑے برش کی مدد سے پاؤڈر اپلائی کریں۔ زیادہ پاؤڈر استعمال نہ کریں۔ ورنہ آپ کا چہرہ کیک کی طرح لگے گا۔

میک اپ کی تمام خوب صورتی اور رعنائی مناسب آئی میک اپ کے بغیر نامکمل لگتی ہے۔ عید پر چاہے آپ ڈارک میک اپ کریں یا لائٹ میک اپ، دونوں صورتوں میں پنک آئی شیڈ کا انتخاب بہترین ثابت ہوسکتا ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے لباس کے مطابق آئی شیڈ کا انتخاب کریں۔

ڈارک میک اپ لک کے لیے، بولڈ شائنی پنک آئی شیڈ بطور آئی لڈ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ لائٹ میک اپ لک کے لیے صرف اوپری سطح پر پنک شیڈ استعمال کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب آئی لڈ پروائٹ شیڈ ہی مناسب رہتا ہے۔ اگر آپ عید پر مصروفیات کے باعث آئی شیڈو کا استعمال ضروری نہیں سمجھتیں تو صرف آئی لائنر کے ذریعے بھی اپنی آنکھوں کی دلکشی میں اضافہ کر سکتی ہیں۔ ڈرامیٹک آئی لائنر کے لیے بلیک لائنر کے بجائے کلرفل لیکویڈ آئی لائنر کا انتخاب کریں۔ اپنی آنکھ کے پپوٹے کو ذرا سا کھینچ کر پکڑیں اور پھر لیکویڈ لائنر کو آنکھ کے مین درمیانی حصے سے بیرونی حصے کی جانب لگائیں۔ ڈرامیٹک انداز میں لائنر لگانے کے لیے لائن کا بیرونی حصہ اندرونی حصے کی نسبت گہرا ہونا چاہیے۔ آخر میں اندرونی حصے کی جانب لائنر سے دوسری لائن بنائیں اور ور پھر دونوں کو ملا دیں۔

آج کل گلیٹر کے بجائے شمر میک اپ لک ٹرینڈ کا حصہ ہے لہٰذا عید میک اپ لک کے لیے بھی اس بات کا خاص خیال رکھیں۔ شمر لک خاندانی یا عام تقاریب کے لیے زیادہ مناسب اور بہتر سمجھا جاتا ہے۔ آئی میک اپ کے لیے گلیٹر کا استعمال بالکل ختم کرتے ہوئے اس کے بجائے کارنر پر شمر اور بلش آن جبکہ ناک اور رخسار کی ہڈی کے ابھار کے لیے شمر کا ہی انتخاب کریں۔ لپ اسٹک، گلوس یا لپ بام کا انتخاب آپ کے میک اپ پر منحصر ہے۔ دن کی تقریبات میں پیچ، پنک اور ٹی پنک جیسے لپ کلرز اچھے لگتے ہیں جبکہ رات کی تقریب کے لیے اگر آپ کا آئی میک اپ لائٹ ہو تو نسبتاً گہرے رنگ کے آئی شیڈوز بہترین رہتے ہیں۔ البتہ آپ ایک ہی شیڈ میں لپ اسٹک لگانے کے بجائے دو یا تین شیڈ ملا کر بھی کوئی منفرد شیڈ بنا سکتی ہیں۔

☆☆